বাংলাদেশের সুবর্ণজয়ন্তী Bangladesh 50

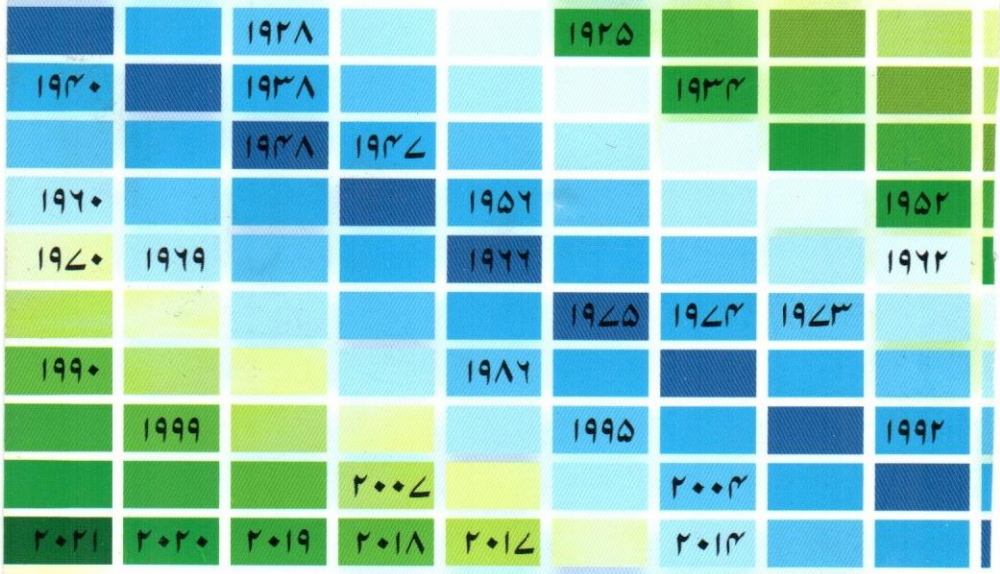
University of Dhaka 1921-2021 ঢাকা বিশ্ববিদ্যালয়

মুজিব শতবর্ষ MUJIB 100

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

صد سالہ خصوصی شمارہ

سال: ۲۰۲۱ شمارہ: ۱۰



شعبۂ اردو

ڈھاکہ یونیورسٹی ■ بنگلہ دیش

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

سال: جون ۲۰۲۱ جلد: ۱۰ شمارہ: ۱۰

صد سالہ خصوصی شمارہ

مدیر
پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربّانی

شعبۂ اردو
ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

سال: جون ۲۰۲۱ جلد: ۱۰ شمارہ: ۱۰

تاریخ اشاعت: ۳۰ جون ۲۰۲۲

ناشر : رجسٹرار، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، ۱۰۰۰، بنگلہ دیش

پریس : مادھورز پروکاشنی، بنگلہ بازار، ڈھاکہ

قیمت : ۲۰۰ ٹاکا/ ۳ ڈالر

خط وکتابت کا پتہ : ایڈیٹر، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، ۱۰۰۰

بنگلہ دیش

ای میل : du.urdujournal@gmail.com

ISSN: 2957-4951

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

سال: جون ۲۰۲۱ جلد: ۱۰ شمارہ: ۱۰

تاریخ اشاعت : ۳۰ جون ۲۰۲۲

مدیر

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربّانی

اراکین مجلس ادارت

پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں، ڈھاکہ یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، ڈھاکہ یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل، ڈھاکہ یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، سی سی ایس یونیورسٹی، انڈیا

پروفیسر شمیم بانو، ڈھاکہ یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد، ڈھاکہ یونیورسٹی

فہرست

۱۔ خان بہادر فدا علی خان: حیات اور کارنامے

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل 9

شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۲۔ شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کی عالمی شناخت

پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری 27

شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، انڈیا

۳۔ بیرون ممالک یونیورسٹیز میں اردو کی تدریس

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین 44

ہندستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، انڈیا

۴۔ اردو افسانے میں بنگلا دیش کی جنگ آزادی ۱۹۷۱ء

حسین البناء 72

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۵۔ ڈھاکہ میں اردو چرچا: ایک مختصر جائزہ
پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں 86
شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۶۔ بنگلہ اور اردو کا لسانی رشتہ
حفصہ اختر 123
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۷۔ اکیسویں صدی کے چیلینجز کے مقابلہ کرنے کے لئے شعبۂ اردو کے فضلاء: حال اور مستقبل
پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی 144
شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۸۔ سوسال اور مشاہیر شعبۂ اردو
ڈاکٹر رشید احمد 160
پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۹۔ شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کے چند طلباء کی اردو خدمات
ڈاکٹر محمد رضا الکریم 198
پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۱۰۔شعبۂ اردو کے زیر اہتمام بین الاقوامی کانفرنس: تحقیق کے نئے افق
پروفیسر شمیم بانو 220
مارڈن لینگویجز انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۱۱۔ پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی: معلم، ادیب اور محقق
شمیمہ نسرین 238
پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۱۲۔شعبۂ اردو ڈھاکا یونی ورسٹی کی تعلیمی قوت اور چیلنجز: ایک مستقبل پسند مطالعہ
صفدر امام قادری 255
شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، آرٹس اینڈ سائنس، پٹنہ، ہندستان

۱۳۔اردو کے فروغ میں بنگلا دیش کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کا کردار
پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام 279
شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۱۴۔ اردو شاعری میں بنگلہ دیش کی جنگ آزادی
ڈاکٹر ا.ن.م احسان المالکی 296
محقق، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

صد سالہ خصوصی شمارہ

خان بہادر فدا علی خان: حیات اور کارنامے

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل

Abstract

Khan Bahadur Fida Ali Khan (1870-1938) was endowed with many qualities. Author, Scholar, Historian, Linguist, Poet, Critics etc. qualities glorified and enlightened his personality. He is known for his creativity and wide imagination. He is regarded as one of the leading urdu writers and critics of his times. His works are in Urdu, Persian, Arabic and English but predominently in Urdu covering literary, religious, historical and linguistic subjects. He wrote many articles in urdu for various literary journals. He was a good Translator also.Origin of Manicheism, Bishbriksha, Hindu Dharma in the period of Akbar etc. his remarkable translated work. He was not only an Author, Scholar, Critics, Historian, Translator but a great Academician also. He was served for a long time the Head of the Department of Urdu &Persian and was also acting Head of the department of Arabic &Islamic Studies for some times. He was a Proctor, Dean of the Faculty of Arts and a member of the Academic Council of Dhaka University. He was the Chairman of the Arabic, Persian and Urdu Manuscript Committees. Fida Ali Khan had enriched the nation with his wisdom and works.

شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

خان بہادر فدا علی خان (1870-1938) کا شمار اپنے دور کے معروف اردو ادیبوں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ بہت سی خوبیوں سے مالا مال تھے۔ معلم، مصنف، اسکالر، مورخ، ماہر لسانیات، شاعر، نقاد، مترجم وغیرہ صفات نے ان کی شخصیت کو نکھارا اور روشن کیا۔ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور وسیع تخیل کے لیے مشہور ہے۔ ان کی تخلیقات اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں ہیں۔ انہوں نے مختلف ادبی جرائد کے لیے اردو میں بہت سے مضامین لکھے۔ ان میں ادبی، مذہبی، تاریخی اور لسانی مضامین شامل ہیں۔

فدا علی خان صاحب 1870ء میں ہندوستان کے ضلع رامپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد حکیم محمد فتح یاب علی خان شاعر اور مشہور طبیب تھے۔ ان کا آبائی وطن رامپور کے مشہور محلے پیپل والے گھیر میں تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں ان کے مورث محمد خان یا ان کے والد باغستانی علاقے سے آئے اور رامپور میں سکونت اختیار کی۔ انہوں نے بڑی عمر میں یعنی 13 / 14 سال کی عمر میں پڑھنا لکھنا شروع کیا تھا۔ بچپن میں وہ بہت ذہین لڑکے تھے، سمجھ بوجھ بھی زیادہ تھی۔ تین چار سال میں مروجہ مکتبی تعلیم تکمیل کر لی۔ رامپور کے مشہور فقیہ اور مجدوی شیخ مولانا ارشاد حسین بن حکیم احمد حسین مجدوی سے عربی پڑھی۔ 17 / 18 کی عمر میں رامپور کے مشہور درسگاہ مدرسہ عالیہ میں داخلہ لے لیا۔ مدرسہ عالیہ میں کئی سال درس نظامی کی تحصیل میں گذارے۔ درس نظامی ادھوری رکھ کر رامپور کے ہائی اسکول میں انگریزی کے چھٹے یا ساتویں جماعت میں داخل ہو گئے۔ 1894ء میں ہائی اسکول پاس کیا اور علی گڑھ میں سرسید کے محمڈن کالج میں داخلہ لے لیا۔ 1896ء میں ریاضی کے ساتھ انٹر پاس کیا۔ 1898ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ انہوں نے 1910ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے عربی میں ایم- اے کی ڈگری حاصل کی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کیلینڈر کے

اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عربی کے ساتھ فارسی میں بھی ایم-اے مکمل کیا تھا۔

فداعلی صاحب کی ملازمتی زندگی بی-اے کرنے بعد 1900ء سال میں شروع ہوئی۔ اس وقت اندور کے راجہ نے انہیں اپنے کالج ہولکر کالج میں عربی کا استاد مقرر کر دیا۔ تقریبا چھ سال انہوں نے اس کالج میں نوکری کی۔ 1907ء میں اندور سے بڑودہ آ گئے۔ یہاں کے مہاراجہ کے رسالے کے افسر اور کیپٹن کی حیثیت میں مہاراجہ کے اے۔ ڈی۔ سی ہو گئے۔ اسی وقت رامپور کے مشہور پٹھان خاندان سیف الدین خیلیون میں کشوری بیگم بنت احمد نبی خان سے ان کا نکاح ہوا۔ محمڈن کالج ڈائریکٹری کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بی۔ اے کرنے کے بعد بنگال میں چاٹگام کے گورنمنٹ کالج میں عربی کے استاذ تھے۔ چاٹگام میں وہ بہت کم دنوں میں رہے۔ 1910ء میں ہوگلی کالج میں ان کا تقرر ہو گیا۔ وہ تقریبا دس سال کلکتہ میں رہے۔ 1921ء سال میں وہ ڈھاکہ گورنمنٹ کالج میں عربی و فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ 1921ء سال کے یکم جولائی میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور وہ شعبہ اردو و فارسی میں استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ وہ اس شعبے کے اولین صدر اور ریڈر تھے۔ چودہ سال تک انہوں نے اس شعبے کی صدارت کی ذمہ داری ادا کی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دو مرتبہ 1924-1923ء اور 1931-1930ء شعبہ عربی و اسلامیت کے بھی قائم مقام صدر رہے۔ انہوں نے 1928ء میں قائم کی گئی عربی، فارسی اور اردو مخطوطہ کمیٹی کے چیئرمین کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ستمبر 1930ء سے اپریل 1934ء تک وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی ایکزیکیوٹیو کونسل کے ممبر رہے۔ اپنی تعلیمی استعداد کی بدولت 13 جنوری 1924ء سے 28 اپریل 1935ء تک آرٹس فیکلٹی کے ڈین بننے کا شرف انہیں حاصل ہوا تھا۔ جولائی 1923ء سے اکتوبر 1924ء تک پروکٹر کے عہدہ پر بھی فرائض منصبی ادا کئے۔ چودہ سال ڈھاکہ یونیورسٹی میں شہرت، عزت اور عالمانہ وقار کے ساتھ گذارنے

کیبعد بالآخر اپریل 1935ء میں ریٹائر ہوئے۔ 1 اسی سال جون 1935ء میں فدا علی صاحب کی علمی اور تدریسی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے انہیں "خان بہادر " کا خطاب دیا۔ ڈھاکہ سے اپنے وطن رامپور واپس چلے گئے اور وہاں کے مختلف سماجی، سیاسی، علمی اور ادبی انجمن سے وابستہ رہے۔ رامپور میں آنے کے کچھ دنوں بعد صولت پبلک لائبریری کے نائب صدر کا عہدہ خالی ہوا تو وہ اسکے نائب صدر منتخب ہو گئے اور آخر تک اس عہدے پر فائز رہے۔ 16 نومبر 1935ء کو مجلس وضع قوانین کے دو مسلم ممبروں کا میونسپل بورڈ کی طرف سے پہلا انتخاب ہوا۔ فدا علی صاحب زندگی کی آخری دن اپنے وطن رامپور میں ہی رہے۔ علم کی روشنیدار خان بہادر فدا علی خان 19 اپریل 1938ء میں انتقال فرمائے۔ ان کی وفات پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے محمد عبدالسلام خان رامپوری نے کہا :

> "1938ء کے اپریل کی 19 تاریخ، منگل کا دن اور ساڑھے نو بجے، عشا کا وقت تھا کہ اپنے عہد کا یہ مشہور فاضل، علوم عربیہ پر حاوی، عربی ادب و تاریخ میں سند، انگریزی میں ایم۔اے، ریاضی کا بی۔اے، روایتی ہفت زبان، اردو فارسی لسانیات کا ماہر، وسیع النظر، غیر معمولی حافظے کا مالک، روشن خیال، طلبا کا ہمدرد اور انکی تعلیم کا گرویدہ، تن من دھن سے کوشاں، ریاست کی ہمہ جہتی ترقی کا حامی اور سماعی، صاحب تصنیف، ڈھاکہ یونیورسٹی کے اردو، فارسی، عربی اور اسلامیت کے شعبوں کا صدر، رامپور کی پہلی مجلس وضع قوانین کا ممبر جسے اپنی صحت، طاقت اور چستی پر ناز تھا، دیکھتے دیکھتے نظروں سے غائب ہو گیا اور ہمیشہ کے لیے خود چلا گیا اور سوگواروں کو اپنے پیچھے سسکتا بلکتا چھوڑ گیا۔ 2"

قواعد اردو

"قواعد اردو" فدا علی خان کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ یہ کتاب مسودہ کی شکل میں تھی۔ رامپور مدرسہ عالیہ کے سابق پرنسپل محمد عبدالسلام خان نے اسے مرتب کر کے شائع کیا۔ یہ کتاب اردو زبان کے اصول اور قوانین پر لکھی گئی ہے۔ ہر زبان کے کچھ اصول اور قوانین ہوتے ہیں۔ جن سے اس زبان کو صحیح طور سے سیکھا اور استعمال کیا جا سکتا ہے۔ زبان کی درستی اور اس کی خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لیے ان قوانین پر عمل درآمد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اردو زبان کے بھی کچھ اصول ہیں، جنہیں قواعد کہا جاتا ہے۔ ان کے جاننے سے اردو زبان کو ٹھیک طریقے سے بولا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ ان ضروریات کو مدنظر رکھ کر پروفیسر فدا علی خان نے "قواعد اردو" نامی یہ ایک کتاب لکھی ہے۔ مصنف خود کہتے ہیں:

> "ہر زبان کے اور خصوصا اردو جیسی پیچیدہ زبان کے قواعد سے بغرض صحت واقف ہونا نہ صرف اجنبیوں کے لئے بلکہ خود اس زبان کے بولنے والوں کے لئے بھی ضروری ہے۔ زبان کے قواعد کا تعلق زبان کے ساتھ بالکل ایسا ہی ہے جیسا منطق کا تعلق فکر و قیاس کے ساتھ ..... یہ کہنا کہ اپنی زبان کا بولنا لکھنا سب جانتے ہیں اتنا ہی صحیح ہے جتنی یہ مثل کہ گانا، رونا، سب کو آتا ہے۔ بولنا، لکھنا، گانا وغیرہ طبیعی افعال کی حیثیت سے تو واقعی قواعد کے محتاج نہیں، مگر اکتسابی افعال اور ہنروں کی حیثیت سے یقیناً قواعد کے محتاج ہی۔ ۳

"قواعد اردو" کتاب میں املا، صرف ونحو اور اس کے متعلقات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس میں تین ابواب اور دو ضمیمہ ہیں۔ ہر باب اور ضمیمہ کے اندر کئی فصلیں قائم کر کے اردو کے

بنیادی قواعد کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اردو پر عربی و فارسی کا اثر اور اس کے الفاظ کے استعمال پر بات کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ قارئین کو اردو کے قواعد اور الفاظ کے استعمال اور اس کے ماخذ سے متعارف کراتا ہے۔

فدا علی خان صاحب کی کتاب "قواعد اردو" سے پہلے اردو قواعد پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ اہل مغرب نے اٹھارویں صدی کے اوائل سے ہی اردو قواعد کی تدوین شروع کر دی تھی۔ اس سلسلے کا پہلا معروف مصنف جان جوشوا کیٹلہ ہے جس نے 1715ء میں لاطینی زبان میں اردو قواعد مرتب کی۔ اس کے بعد بنیامین شلز ہنو نے 1741ء میں ہندستانی کے قواعد لکھے۔ انگریزی میں سب سے پہلے جس نے اردو قواعد پر قلم اٹھایا مسٹر گلکسٹن ہے، اس کے بعد 1765ء میں مسٹر ہیڈلے نے اردو قواعد پر کتاب لکھی۔ ان کے علاوہ اور دوسرے مغربی مصنفین بھی ہیں جو اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے متعدد ادنی اور اعلیٰ قواعد کی کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔ اٹھارویں صدی کا اختتامی دہائی تھا کہ 1796ء میں جان گلکرسٹ نے اپنی مجوزہ کتاب 'ہندوستانی لسانیات' کی جلد اول کے تیسرے حصے میں ہندستانی قواعد شائع کی۔ دریائے لطافت سے کچھ پہلے 1806ء میں امانت علی شیدا نے اردو صرف سے متعلق "صرفِ اردو" کے نام سے ایک ابتدائی رسالہ لکھا تھا۔ 1810ء میں روشن علی انصاری نے "رسالہ صرف ونحو" کے نام سے اردو قواعد پر ایک رسالہ لکھا۔

قواعد کی ان سب کتابوں کا مشترکہ عیب یہ ہے کہ ان میں فارسی قواعد کی کتابوں کے توسط سے یا بلا توسط اور براہ راست عربی قواعد کا تتبع کیا گیا ہے۔ عربی سامی زبان کی شاخ ہے جب کہ اردو آریائی بولی ہے، اس کی قواعد میں آریائی پراکرت کی پیروی ہونی چاہئے تھی لیکن چونکہ اردو کے قواعد نگاروں کے سامنے پراکرت کے قواعد نہ تھے اور فارسی عربی کے عالم ہونے کی بنا پر عربی قواعد کا سکہ ان کے دل پر بیٹھا ہوا تھا، انہوں نے عربی قواعد کو یا فارسی قواعد کو جو عربی

قواعد کا چربہ تھے، سامنے رکھ کر اردو کے قواعد مرتب کر دیے۔ عربی قواعد کی تقلید کی وجہ سے ان سے اردو کی آریائی خصوصیات برابر نظر انداز ہوتی رہیں اور اردو قواعد میں بہت سے کھانچے رہ گئے۔ دور از کار تاویلوں کی ضرورت پڑی اور بہت سی مصطلحات بے معنی ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز ہو گئیں۔

اردو قواعد کے اس عیب کو فدا علی خان صاحب نے محسوس کیا اور اس کے قواعد میں آریائی پراکرت کا تتبع کر کے اس کے مفصل اور معیاری قواعد مرتب کئے جو "قواعد اردو" کے نام سے شائع ہوئے۔ اس بارے میں محمد عبد السلام خان رامپوری نے اپنے مضمون "اردو قواعد کی تدوین-ضرورت آغاز اور تاریخ" میں لکھتے ہیں :

> "ڈھاکہ یونیورسٹی کے عربی فارسی اور اسلامیات کے صدر پروفیسر فدا علی خان صاحب رامپوری بھی اردو قواعد کے اس عیب کو محسوس کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے بھی ڈاکٹر عبدالحق کے قواعد مرتب کرنے کے ہی زمانے میں وقتاً فوقتاً اردو قواعد آریائی پراکرت کے تتبع میں مرتب کرنے شروع کر دئے تھے جو 'قواعد اردو' کے شائع ہونے کے بعد تک جاری رہے لیکن کچھ دوسرے کاموں میں مصروفیت کی بنا پر چھوڑ دئے اور یادگار کے طور پر کچھ مرتب اور کچھ غیر مرتب نامکمل یادداشتیں مسودات کی صورت میں محفوظ رہ گئیں۔4"

رامپور عالیہ مدرسہ کے سابق پرنسپل محمد عبد السلام خان رامپوری نے فدا علی خان کی کتاب "قواعد اردو" کو ترتیب و تکمیل کی، جسے 1995ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے "حرفے چند" میں ہے:

"فداعلی خان صاحب جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی واردو کے صدر تھے، اپنے عہد کے بڑے مستند اور معتبر لکھنے والوں میں سمجھے جاتے تھے۔ اس زمانے کے صفحہ اول کے پرچوں 'جادو' 'ہندوستانی' وغیرہ میں بجا ان کی تحریریں دیکھنیکو مل جاتی ہیں۔ خالص 'ہندوستانی' کے بھی وہ علمبردار تھے۔5"

ترجمہ نگاری

فداعلی خان ایک اچھے مترجم تھے۔ انہوں نے متعدد عربی، فارسی، انگریزی اور بنگلہ تخلیقات کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ انہیں ترجمہ کرنے کا بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان تراجم میں انہوں نے حتی الامکان اصل کی روح کو باقی رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اردو ترجمہ نگاری میں ان کی مفید خدمات ذیل میں ہیں:

بس کا روکھ:

بنکم چندر چٹرجی بنگال کے ایک مشہور ناول نویس ہیں۔ "بشوبرکھا" ان کی ایک بے مثل ناول ہے۔ یہ ناول رسالہ بنگ درشن میں قسط وار شائع ہوا۔ اس کا مرکزی خیال ایک گھریلو المیہ ہے جو ایک بیوہ کے عقد ثانی سے پیدا ہوا۔ فداعلی خان نے اس کتاب کو "بس کا روکھ" نام سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ 265 صفحات کی یہ کتاب 1931ء میں الہ آباد سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب فداعلی صاحب کی ترجمائی کارناموں کی ایک اہم کڑی ہے۔۔ ترجمہ کے متعلق حکیم حبیب الرحمان یوں تحریر فرماتے ہیں :

"مشہور بنگالی ناولسٹ بنکم بابو کے ناولوں کا ترجمہ بہت لوگوں نے

کیا ہے اور خود "بشابرکھا" کے بھی اردو میں اس سے پہلے دو ترجمے ہو چکے ہیں، لیکن یہ ترجمہ میرے مخدوم و محترم نے کیا ہے۔ مولانا نے یہ دکھلایا ہے کہ اردو زبان بلا عربی آمیزش کے بھی پیاری ہو سکتی ہے۔ بلکہ عربی اور فارسی کی زیادہ آمیزش زبان کی شیرینی کو غارت کر دیتی ہے۔6"

نمونہ کے طور پر اس کتاب سے چند اقتباسات ذیل میں ہیں:

নগেন্দ্র প্রথম দুই এক দিন দেখিতে দেখিতে গেলেন। পরে একদিন আকাশে মেঘ উঠিল, মেঘ আকাশ ঢাকিল, নদীর জল কালো হইল, গাছের মাথা কাটা হইল, মেঘের কোলে বক উড়িল, নদী নিস্পন্দ হইল। নগেন্দ্র নাবিকদিগকে আজ্ঞা করিলেন, "নৌকাটা কিনারায় বাঁধিও।" রহমত মোল্লা মাঝি তখন নেমাজ করিতেছিল, কথার উত্তর দিল না। রহমত আর কখন মাঝিগিরি করে নাই—তাহার নানার খালা মাঝির মেয়ে ছিল, তিনি সেই গর্ব্বে মাঝিগিরির উমেদার হইয়াছিলেন, কপালক্রমে সিদ্ধকাম হইয়াছিলেন। রহমত হাঁকে ডাকে খাটো নন, নেমাজ সমাপ্ত হইলে বাবুর দিকে ফিরিয়া বলিলেন, "ভয় কি, হুজুর! আপনি নিশ্চিন্ত থাকুন।" রহমত মোল্লার এত সাহসের কারণ এই যে, কিনারা অতি নিকটে, অবিলম্বেই কিনারায় নৌকা লাগিল। তখন নাবিকেরা নামিয়া নৌকা কাছি করিল।[7]

(نگندر پہلے تو دو ایک دن تک سیر تماشا دیکھتا چلا گیا۔ اسکے بعد ایک دن آسمان میں بادل اٹھے، بادلوں نے آسمان کو ڈھانک لیا، ندی کا پانی کالا پڑ گیا۔ درختوں کی چوٹیاں بھوری ہوگئیں، بگلے بادل کی گود میں اڑنے لگے۔ ندی پر سناٹا چھا گیا۔ نگندر نے حکم دیا" ناؤں

Journal of

کنارے لگائے رکھنا"۔ رحمت ملا اس وقت نماز پڑھ رہا تھا۔ بات کا جواب نہ دے سکا۔ رحمت نے اور تو کبھی ملاح گری کی نہ تھی۔ اس کے نانا کی خالہ ملاح کی بیٹی تھی۔ اسی گھمنڈ پر ملاح گری کا دم بھرنے لگا تھا۔ اور قسمت سے کام بھی چل نکلا تھا۔ رحمت چیخ پکار میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ سلام پھیرتے ہی بابو کی طرف مڑ کے بولا" حجور کچھ ڈر کی بات نہیں آپ نچنت رہیں" رحمت ملا کے اتنے جیوٹ پنے کا سبب یہ تھا کہ کنارہ پاس تھا۔ ناؤں کو کنارے لگاتے کچھ دیر نہ لگی۔ ملاحوں نے اتر کر اسے رسیوں سے باندھ دیا۔ 8

ہندو دھرم – اکبر کے عہد میں

فدا علی خان کی دوسری ترجمائی کتاب " ہندو دھرم – اکبر کے عہد میں " ہے ۔ یہ کتاب 1992ء میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب " آئین اکبری" کا حصہ دوم کا ترجمہ ہے جو ہندو مذہب کے بارے میں ہے۔

آئین اکبری ابوالفضل کی تحریر کردہ کتاب ہے۔ یہ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد کی ایک مستند دستاویزی کتاب ہے۔ اس کتاب کی تین جلدیں ہیں۔ پہلی جلد تیمور، بابر اور ہمایوں و غیرہ کے دور اور خاندان کو بیان کرتی ہے۔ دوسری جلد میں عہد اکبری کے تمام قانون و اصول ہائے سلطنت کو تحریر کیا گیا ہے۔ تیسری جلد اکبر کے زمانے تا مرگ تک کو بیان کرتی ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا حصہ دوم کو فدا علی خان نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس حصہ میں مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں ہندو مذہب کی پوری تصویر موجود ہے۔ ہندو مذہب کے بارے میں یہ تفصیلی مطالعہ اردو سماج کے علاوہ ہندو عالموں کے لئے بھی بڑے کام کی چیز ہے کہ پندرہویں صدی کی اخیر میں اور سولہویں صدی کے آغاز میں ہندو سماج اپنے گوناگوں مظاہر میں کس کس طور سے جلوہ نما ہو رہا تھا۔

Origin of Manicheism

مانی مذہب دنیا کے سب سے عام مذاہب میں سے ایک ہے جس کی تبلیغ ساسانی دور حکومت میں ایرانی مشنری مانی (217-28 عیسوی) نے تیسری صدی میں قائم کی تھی۔ یہ روشنی اور تاریکی کے درمیان ایک قیاس پر مبنی تنازعہ پر مبنی تھا۔ یہاں کہا گیا ہے کہ زمین ایک دن تاریک ہوکر روشنی کی راہ پر لوٹ آئے گی۔ یہ رومی سلطنت اور ایشیا میں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی، اور مشرقی ترکستان (سنکیانگ) میں 13 ویں صدی تک زندہ رہی۔ مانی دھرم کی اصل تحریریں غائب ہوگئی ہیں۔ اب کچھ ترجمے اور ٹکڑوں کے مخطوطات دستیاب ہیں۔ ان موضوعات پر جرمن مصنف او، جی، وان ویسینڈونک (O. G. Von Wesendonk) نے "Der orientalische Ursprung des mittelalterlichen Minnesangs" کے نام سے جرمن زبان میں ایک مضمون لکھا ہے۔ فدا علی صاحب نے اس مضمون کو Origin of Manicheism'''" نام سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ مضمون 1927ء میں مسلم ریویو جرنل کے دوسرے والیوم میں شائع ہوا ہے۔

مقالات اور مضامین :

فدا علی صاحب کی تحقیقی کاوشوں کا بڑا حصہ انکے مقالات اور مضامین ہیں جو اس دور کے مختلف رسائل، جرائد اور رودادوں میں بکھرے پڑے ہیں – جیسے 'جادو' (ڈھاکہ) 'مخزن' (لاہور) 'زمانہ' (کانپور) وغیرہ۔ ان مقالات کا پتہ چلانا صرف بہت وقت کی ضرورت ہی نہیں بلکہ دشوار بھی ہے۔ ان میں سے جن کا پتہ چل سکا ہے، انہیں پیش کیے دیتا ہوں -

(1) چھٹی صدی کے مشہور اندلس کے فلسفی ابن طفیل کے فلسفیانہ قصے، حی بن

یقظان ، کے برونل پال (Bronnle Paul) کے انگریزی ترجمے The Awakening of the Soul کا 'روح کی بیداری' کے نام سے اردو ترجمہ۔ یہ مخزن (لاہور) کے نمبر 1908ء سے جون 1909ء تک مسلسل چھپا ہے، یہ نہیں معلوم سکا کہ یہ ترجمہ کتابی شکل میں چھپا یا نہیں۔

(2) اقلیدس واحد بن محمد بن ثوابہ۔ یہ ارشاد الادیب الی معرفتہ الادیب، میں مذکور ایک واقعے کا بیان ہے جس سے اہل ادب وانشا کی علم ہندسہ سے بے تعلقی بلکہ نفرت کا اظہار ہوتا ہے (مخزن، جنوری، 1910ء،

(3) مسلمان اور علوم ہند، تین قسطوں میں۔ 'زمانہ'، کانپور، جنوری، مارچ، اپریل 1924ء

(4) عورت اور اقتصادیات، نو قسطوں میں۔ روز نامہ 'ہمدرد' دہلی، شمارہ 5، 7، 8، 9، 10، 12، 13، 14، 15، مارچ 1914ء

(5) زبان۔ رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ جنوری 1923ء

(6) اسلام اور فنون لطیفہ، چار قسطوں میں، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ 3، 4، 5، 6، جلد ایک 1923ء

(7) ترجمہ کتاب التعریف بالمصطلح الشریف — از ابن فضل اللہ العمری (احمد بن یحیٰ)۔ رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ جولائی 1923ء

(8) مسلمانوں کے ابتدائی ذرائع خبر رسانی، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ ستمبر 1923ء

(9) ابو عبید قاسم ابن اسلام کی غریب الحدیث، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ جنوری 1924ء

(10) خلیل بن احمد کے بعض لطیفے، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ اپریل 1924ء

(11) البرید، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ جون 1924ء

(12) لغات اردو، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ اگست 1924ء

(13) ادب کے ہاتھوں اقلیدس کی درگت، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ اکتوبر – نومبر 1924ء

(14) اقوام مفتوحہ کے ساتھ ہمارا سلوک، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ مارچ، اپریل، جولائی 1924ء

(15) حساب شطرنج، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ اگست 1925ء

(16) مجمع الصنائع – از نظام الدین احمد، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ مئی و جون 1926ء

(17) مکاتیب سید غلام مصطفیٰ، رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ اکتوبر 1926ء

مذکورہ مضامین کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے مضامین مختلف نوعیت کے ہیں۔ لسانیات، تاریخ، سوانح، اسلامیت وغیرہ جیسے مختلف موضوعات پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے۔ ان کے اکثر مضامین اپنے زمانے کے ڈھاکیکے مشہور اردو جریدہ "جادو" میں شائع ہوئے ہیں۔ لسانیات ان کے سب سے پسندیدہ موضوع تھا۔ لسانیات پر انہوں نے جتنے مضامین لکھے ہیں ان میں "زبان" نامی مقالہ سب سے اہم ہے۔ اس مقالہ میں زبان کی اہمیت، اس کے مختلف پہلوؤں پر بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ فدا علی کے خیال ہے کہ زبان محض ایک آلہ نہیں ہے۔ یہ شعور کا ایک لازمی اور ناگریز حصہ ہے۔ یہ انسانی ذہن اور خود شعور کی مجموعیت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ شعور کی ترقی کے ساتھ ترقی کرتی ہے اور جب شعور پر روک لگائی جاتی ہے تو زبان بھی رک جاتی ہے۔ زبان کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :

"یہی وہ چیز ہے جو انسانی وحیوان میں مابہ الامتیاز اور بنی نوع انسان کا سرمایہ فخر و ناز ہے۔۔ اس کا ایک جزو وہ آوازیں ہوتی ہیں جو ہمارے

منہ سے نکلتی ہیں تو دوسرا جزو معانی جوان آوازوں سے وابستہ ہوتے ہیں.... زبان کی ہر حرکت عقل و دماغ کی حرکت سابقہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہمارا ہر لفظ صرف زبان کا نہیں بلکہ زبان و ادراک دونوں کا ساختہ پرواختہ ہوتا ہے۔ 9

انگریزی مضامین:

1۔A:Firdusi Brief Sketch of His Life and Work: یہ فدا علی خان کی ایک لاجواب انگریزی مضمون ہے۔ اس مضمون میں فارسی ادب کے مشہور شاعر فردوسی کی حیات اور ان کے منفرد شاہکار "شاہ نامہ" پر تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔ فدا علی خان کے خیال میں فارسی شاعر فردوسی ایران کی تاریخ اور داستان کو زندہ کرنے والا اور فارسی زبان میں نئی جان ڈالنے والا ایران کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ علم شعر تاریخ اور اخلاق کے اعتبار سے فردوسی عہد غزنویہ کی تمام ادبیات کا محور نظر آتا ہے، اس لئے اس کو اگر فردوسی عہد کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کا ایک بے مثل کارنامہ ہے "شاہ نامہ"۔

یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس کے بارے میں صدیوں سے لکھا جا رہا ہے اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں شاہنامہ فردوسی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس میں 50 ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ اس میں سلطنت ایران کو تاریخی اور مافوق الفطرت طرز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی ابتدا عالم کے وجود میں آنے سے ہوتی ہے اور اختتام ساتویں صدی میں مسلمان کے ایران پر فتح پانے پر ہوتا ہے۔ اس کتاب نے فردوسی کو زندہ جاویدہ کا مرتبہ عطا کیا۔

(2) A Number of Persian and Urdu Poems (غیر مطبوعہ)

(3) The affinity between Persian and Indian

Languages یہ مقالہ 1933ء میں All –Indian Oriental Conference میں پیش کیا گیا ہے۔

(4) Persecution of Avecenna by Sultan Mahmud of Ghazna a myth یہ مضمون نومبر 1928ء میں لاہور میں منعقدہ ایک ادبی کانفرنس میں پڑھا گیا۔

(5) Treatment of Subject races by Arab

(6) India from the point view of early Arab historians

شعر گوئی

فدا علی خان ایک شاعر تھے لیکن دوسروں کی طرح نہیں۔ شعر خوانی ان کا پیشہ نہیں تھا۔ یہ صفت انہوں نے آبائی ورثہ میں حاصل کیا تھا۔ ان کے والد اور دادا دونوں شاعر تھے۔ فدا صاحب نے اس موروثی فن کو ورثے کی حد تک ہی برتا۔ انہوں نے نہ کبھی عام مشاعروں میں شرکت کی نہ اپنی نجی صحبتوں میں اپنے شعر سنائے اور داد لینے کی کوشش کی۔ جوانی میں تفنن طبع کے طور پر شعر کہہ لیے اور کبھی کبھی کسی رسالے میں بھی اشاعت کے لیے دے دیئے۔ ڈھاکہ سے شائع شدہ رسالہ 'جادو' کے مختلف شماروں سے ان کی کچھ غزلیں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں ایک کا نمونہ ذیل میں ہے :

سخن سخن پہ ترے مرحبا نکلتی ہے
کہ بات بات میں میری خطا نکلتی ہے
اڑا ہے آج پھر، مرغ دل لے کر

ہماری جان نہ بال ہما نکلتی ہے
نکل کے دل سے دعا صالب تک آتی ہے
وہاں سے بن کے کسی کا گلا نکلتی ہے
شب فراق کا کیا سلسلہ ہو ختم کہ زلف
ہزار بار تصور میں آ نکلتی ہے
وہ بات جس سے ہوا خون ناحق منصور
وہاں شیشہ سے پھر بر ملا نکلتی ہے
جفائے دوست بدلتی ہے صورتیں کیا کیا
دل فدا سے بہ شکل دعا نکلتی ہے 10

ڈھاکہ کے نواب خاندان سے فدا علی صاحب کا گہرا تعلق تھا۔ نواب خواجہ محمد اعظم صاحب کے صاحب زادے خواجہ محمد عادل جو ماہنامہ "جادو" کے مدیر تھے، ان کے عزیز دوست تھے۔ 1925ء میں خواجہ محمد عادل کی والدہ اور نواب خواجہ محمد اعظم صاحب کی بیگم نواب زادی مہر بانو بنت نواب احسن اللہ خاں رئیس ڈھاکہ کی وفات ہوگئی۔ عادل صاحب نے اپنی والدہ کی یاد میں نومبر 1925ء میں "جادو" کا خصوصی شمارہ شائع کیا۔ اس کا پورا شمارہ تعارف، تاثرات اور مراثی پر مشتمل ہے۔ فدا علی صاحب نے بھی تاثرات کا اظہار ایک قطعہ تاریخ میں کیا ہے اور ایک تعمیہ کے ساتھ بڑا اچھا مادہ تاریخ نکالا ہے جس میں 'مہر' کی رعایت کے ساتھ بیگم کے شوہر خواجہ محمد اعظم کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ ذیل میں ان کی چند سطریں ہیں:

وہ خاتون کہ تھی سب گھرانے کا تاج فرشتہ طبیعت، فرشتہ مزاج

وہ ناہید و مہر سپہر کرم کہ شہر فتوت پہ کرتی تھی راج
وہ طاعت میں ہم پایہ رابعہ کہ تحسیں کا مریم سے لیتی تھی باج
وہ عفت کا ایمان، عصمت کی جان کہ دونوں کی ہر آن رکھتی تھی لاج
رہی مبتلا تپ میں چھے سات روز نہ چھوڑا طبیبوں نے کوئی علاج
فدا کو ہوا فکر تاریخ جب تو دل نے کہا از سر اختلاج
سہی تعمیہ، مادہ خوب ہے زوال آ گیا مہر اعظم پہ آج 11

محمد عبدالسلام خان رامپوری فدا علی صاحب کی شعر گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ڈھاکہ کے مشہور اردو ماہنامے 'جادو' میں ان کی چند غزلیں ملتی ہیں، ان سے اگر چہ ان کی شاعری پر عمومی تبصرہ و نقد تو نہیں کیا جا سکتا تاہم ان کی حد تک اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑی حد تک سپاٹ ہیں اور جذبے کی گرمی اور جوش و سرمستی سے خالی ہیں تخیل کی رنگینی یا فکر کی گہرائی سے عاری کہیں کہیں معنیٰ آفرینی مل جاتی ہے۔12"

پروفیسر فدا علی خان صاحب اپنے زمانے میں ڈھاکہ کی علمی دنیا میں بہت معروف اور مقبول آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی تعلیم و تدریس اور تحقیق کے کام میں صرف کر دی تھی۔ وہ اصول پسند، وضع کی پابند، خوش اخلاق، صاف گو اور سادہ دل آدمی تھے۔ اس لئے ان کی تحریریں سادہ اور سلیس جملوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ شعر گوئی ہوں، یا حوالہ جات مضامین ہوں، ترجمہ ہو یا لسانیت کا سخت موضوع ان کی بات سیدھا اور واضح مفہوم رکھتی ہے۔

حوالہ جات :

1۔ ڈھاکہ یونیورسٹی انویال رپورٹ، 1935ء۔1921ء، ص۔3، 7، 32، 2

2۔فدا علی خان پر لکھا ہوا محمد عبدالسلام خان رامپوری کے مضمون کا ایک عنوان "قلبی دورہ اور وفات" سے ماخوذ،

3۔قواعد اردو ، خان بہادر فدا علی خان، خدا بخش لائبریری، پٹنہ 1995ء، ص-51

4۔ تعمیر نیوز (ویب سائیٹ نیوز پورٹل)، اردو قواعد کی تدوین-ضرورت آغاز اور تاریخ، محمد عبدالسلام خان رامپوری، تاریخ اشاعت۔12/07/2021

5۔قواعد اردو، 'حرفے چند' محمد عبدالسلام خان، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1995ء

6۔ثلاثہ غسالہ، حکیم حبیب الرحمان، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، مارچ 1995ء، ص-5-6

7۔ "بشو برکھا"، بنکم چندر چٹرجی، نعیم بوکس انٹرنیشنل، ڈھاکہ، جولائی، 2011ء، ص-10

8۔بس کا روکھ، فدا علی خان، کتابستان، الہ آباد، 1931ء، ص-4

9۔رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ اپریل 1923ء، ص-20

10۔رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ فروری 1923ء، ص-6

11۔رسالہ 'جادو' ڈھاکہ، شمارہ نومبر 1925ء، ص-12

12۔ قواعد اردو، محمد عبدالسلام خان رامپوری، ص۔39

شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کی عالمی شناخت

پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

Abstract

Dhaka University, Bangladesh, has its place on the global level. The identity of this university is unique due to its quality and reputation. Its various departments also have their international recognition. The department of Urdu is one of the few such departments of the university. happens.

The Department of Urdu, Dhaka University, has its global reputation and position in many respects. There are only a few departments of Urdu in the world, which have completed a century of their establishment. The Department of Urdu, Dhaka University has this honor and It is proud that it has completed the journey of a century. During this journey of a century, the department of Urdu has done significant works, thanks to which the identity of the department has been strengthened and strengthened at the global level.

A number of national and international seminars, workshops and symposiums have been organized in the field, in which scholars from many countries besides India have participated. Many teachers of the department have strengthened the recognition of the department at the global level through their services, participation in seminars, books and sermons on various topics.

شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، انڈیا

Any department is recognized by its syllabus and the number of students, the quality of graduates and the identity of the teachers. It is said that the department of Urdu meets all the above standards. It is also a matter of pride for the department to have its own journal.

اردو دنیا میں بولی جانے والی ایک بڑی اور نفیس زبان ہے۔ اردو کو زبان ہی نہیں ایک تہذیب بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ اردو انسان کو مہذب بناتی ہے۔ آج سوشل میڈیا کے ذریعے پوری دنیا میں اردو کا بول بالا ہے۔ داغ کا مندرجہ ذیل شعر اب لگتا ہے حقیقت پر مبنی ہے ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

اس زبان کو سیکھنے اور سکھانے کے لیے بہت سارے ادارے دنیا میں قائم ہیں۔ کچھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو یہ کام بہ خوبی عالمی سطح پر انجام دے رہے ہیں۔ ان شعبۂ اردو میں بی اے، ایم اے۔ سے لے کر پی ایچ ڈی تک کی تعلیم اردو میں دی جاتی ہے۔ دنیا کی ایسی یونیورسٹیوں میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ یہاں کا شعبۂ اردو عالمی سطح پر اپنی شناخت رکھتا ہے۔ پوری دنیا میں بہت کم شعبے ایسے ہیں جنھوں نے اپنے قیام کے سو سال مکمل کر لئے ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی عالمی شناخت پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ بنگلہ دیش، ڈھاکہ یونیورسٹی اور آرٹس فیکلٹی پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے۔

بنگلہ دیش جو ۱۹۷۱ء میں اپنے ایک الگ وجود کے ساتھ منظر عام پر آیا اور جس نے

اپنی تہذیب اپنی زبان اور اپنے لوگوں کے بل پر ایک مضبوط ریاست کے قیام کی طرف سفر کیا۔ محترمہ ڈاکٹر پروفیسر ام سلمیٰ اپنی کتاب ''بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی ماخذ'' میں بنگلہ دیش کی تعلیمی صورت حال پر لکھتی ہیں:

> ''بنگلہ دیش کی حکومت تعلیمی ترقی اور ناخواندگی کو دور کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ ملک میں اب بچوں کے لیے پرائمری سطح پر ضروری اور مفت تعلیم کا انتظام ہے ۱۹۸۶-۱۹۸۷ کے مطابق ملک میں ۴۳۹۹۲ پرائمری اسکول ۸۹۸۳ سکنڈری اسکول ۸۳۳ عام مروجہ کالج ۱۰ میڈیکل کالج ۲۲ لاء کالج ۲ زرعی کالج، ۳۸ یونیورسٹیاں، اساتذہ کے لیے ۱۰ تربیتی کالج ۱۸ / پولیٹیکنک کالج ۲۲ ہومیو پیتھک کالج اور ۲۸۷۲ مدرسے قائم ہیں۔''[۱]

بنگلہ دیش جس میں تقریباً ۳۸ / یونیورسٹیاں موجود ہیں جن میں سب سے قدیم اور بڑی درس گاہ ڈھاکہ یونیورسٹی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ڈھاکہ یونیورسٹی میں تقریباً ۸۰ شعبے اور ۱۳ فیکلٹی موجود ہیں اور ۱۰۰ سے زائد لائبریریاں ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے رہنے کے لیے ۱۵ / اقامتی ہال (لڑکوں کے لیے) اور ۷ / اقامتی ہال (لڑکیوں کے لیے) موجود ہیں۔ تقریباً ۲۰۰ سے زائد عمارتیں یونیورسٹی میں مختلف شعبہ جات کے لیے مختص ہیں۔ ۳۰ کے قریب مساجد ہیں جو طلبا کے نماز پڑھنے کے لیے ہیں آس پاس کے تقریباً ۴۰ کلومیٹر کے فاصلے پر رہنے والے طالب علموں کو یونیورسٹی لانے لے جانے کے لیے تقریباً ۱۰۰ سے زائد بسوں کا استعمال ہوتا ہے۔

بنگلہ دیش کی راجدھانی ڈھاکہ شہر ہے۔ ڈھاکہ کو یوں بھی دنیا کے بڑے شہروں میں گنا جاتا ہے۔ آبادی کے تناسب کے اعتبار سے ڈھاکہ دنیا کے گنے چنے شہروں میں شمار ہوتا

ہے۔ ڈھاکہ کے مختلف شاہ راہیں آبادی زیادہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر اوقات جام رہتی ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی جس کا قیام ۱۹۲۱ء میں عمل میں آیا۔ شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی ساتھ وجود میں آیا۔ اور دنیا میں موجود شعبہ ہائے اردو میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس شعبے سے نامور اساتذہ وابستہ رہے۔ شروع میں شعبۂ فارسی بھی، اسی کا حصہ تھا۔ شعبۂ اردو کے تعلق سے مفتی محمد غلام ربانی اپنی کتاب ''آج کی اردو'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہ شعبۂ ۱۹۲۱ء میں قائم ہوا۔ اور اس کے ساتھ شعبۂ فارسی بھی منسلک تھا۔ ۲۰۰۷ء سے شعبۂ اردو علیحدہ شعبۂ کی حیثیت سے قائم ہے۔ یہاں چار سالہ بی اے آنرز کی ڈگری کرائی جاتی ہے۔ ایک سالہ ایم اے ہے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری اسی شعبے سے دی جاتی ہے۔ اس شعبہ میں دس استاد ہیں اور تقریباً تین سو طالب علم ہیں یہ شعبہ کلا بھون (آرٹس بلڈنگ) کی تیسری منزل پر واقع ہے۔ شعبۂ اردو میں اردو ادب اور صحافت پڑھائی جاتی ہے۔''[۲]

بنگلہ دیش میں اردو زبان وادب کے فروغ میں شعبۂ اردو اور اس سے منسلک اساتذہ کا نمایاں کردار رہا ہے۔ شعبۂ اردو کے اساتذہ ایسے رہے ہیں جن کی عالمی شناخت موجود ہے، جو عالمی سطح پر جانے جاتے ہیں اور جن کی کتابیں بھی عالمی سطح پر مقبولیت کے نئے پیمانے وضع کرتی ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر (بنگلہ دیش میں اردو ادب، ڈاکٹر عندلیب شادانی: شخصیت اور کارنامے) ڈاکٹر محمود الاسلام (مختلف زبانوں کا باہم تعلق، اردو پر مغرب کے اثرات) پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی (آج کی اردو) ڈاکٹر عندلیب شادانی (تخلیقات، تحقیق

کی روشنی میں، ہندوستان کے مسلم مورخ)اور شاعری (نشاط رفتہ)افسانہ نگاری (سچی کہانیاں) وغیرہ نے شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کو ایک عالمی شناخت عطا کی ہے۔شعبۂ اردو کے قیام اور پروگرام کے تعلق سے سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر رشید احمد لکھتے ہیں:

''قیام شعبۂ اردو کے بعد سے اب تک اس کے زیر اہتمام اس بار سمیت صرف تین انٹرنیشنل کانفرنس وجود میں آئیں۔ایک ۴ دسمبر ۲۰۰۴ء میں۔دوسری ۹۔۱۰ اکتوبر ۲۰۱۷ء اور تیسری اور آخری انٹرنیشنل کانفرنس یہ یعنی ۲۷۔۲۸ جنوری ۲۰۲۰ء کو منعقد ہونے والی کانفرنس ہے۔'' ۳

شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایسے اساتذہ کی کمی نہیں ہے جو بین الاقوامی سطح کی کانفرنس کا کامیابی کے ساتھ انعقاد کر سکتے ہوں۔2020ء میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں بنگلہ دیش کے علاوہ بھارت، کناڈا، مصر، برطانیہ، جرمنی، ایران، ناروے، انگلینڈ اور موریشش کے اسکالرز اور شعراء کرام نے شرکت کی۔اس سلسلے میں تفصیل سے پروفیسر ڈاکٹر غلام ربانی لکھتے ہیں:

''برطانیہ سے فہیم اختر، جرمنی سے سرور غزالی، کنیڈا سے سید قمر الہدی، مصر سے ولاء جمال، ناروے سے شائستہ حسن اور بھارت سے اسلم جمشید پوری، صفدر امام قادری، خالد اشرف، کاظم صاحب وغیرہ سے بات چیت ہوتی رہی۔ان کے مشوروں سے کانفرنس میں رونق بڑھی۔بھارت کے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ہماری مہمان

نوازی کو قبول کر کے ہمارا شرف و وقار بڑھا دیا۔ قطر سے صبیح بخاری، شہاب الدین احمد، احمد اشفاق اور بنگلہ دیشی شاعر احمد الیاس، شمیم زمانوی، جلال عظیم آبادی وغیرہ کے شاعری سے انشاء اللہ ہمارے عالم اردو مشاعرہ کی مقبولیت اور بڑھ جائے گی۔''[۴]

مذکورہ بالا کانفرنس کے مختلف اجلاس کے علاوہ ایک عالمی مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ جس کی صدارت صبیح بخاری (قطر) اور محترم شہاب الدین احمد قطر نے کی جس میں محترم فہیم اختر لندن، سرور غزالی جرمنی، ولا جمال العسیلی مصر، سید قمر الہدیٰ کناڈا، احمد اشفاق قطر، شائستہ حسن ناروے، کے علاوہ احمد الیاس بنگلہ دیش، ارمان سمسی بنگلہ دیش، شمیم زمانوی بنگلہ دیش نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں اور یونیورسٹیز کے اسکالرز نے بھی شرکت کی۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری پٹنہ، ڈاکٹر محمد کاظم دہلی یونیورسٹی، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی پٹنہ یونیورسٹی، پروفیسر اسلم جمشید پوری میرٹھ یونیورسٹی، ڈاکٹر زاہد الحق حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، ڈاکٹر صوفیہ شیرین کلکتہ، ڈاکٹر تبسم حسن مانو حیدرآباد، توصیف احمد ڈار کشمیر یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد گوہر مدیر تاثیر پٹنہ، ڈاکٹر تسلیم عارف رانچی، ڈاکٹر نیلوفر یاسمین پٹنہ، ڈاکٹر عاشیہ یاسمین مانو، حیدرآباد نے بھی شرکت کی اور مختلف اجلاس میں اپنے پیپرس پیش کیے۔

بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب کی صورت حال خاص کر شعبۂ اردو کے قیام اور اردو کی سرگرمیوں کے تعلق سے فکر و تحریر کے مدیر ڈاکٹر نعیم انیس کچھ یوں رقم طراز ہیں:

''ڈھاکہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کا قیام یکم جولائی 1921ء میں عمل میں آیا تھا۔ ابتدا میں اردو اور فارسی کا مشترکہ شعبہ تھا۔ بنگلہ دیش کی آزادی کا اثر شعبہ پر بھی پڑا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ شعبۂ میں داخلہ لینے والے طلبا و طالبات کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور

10/مارچ 2007ء کو یونیورسٹی انتظامیہ کی جانب سے اردو کا علیحدہ شعبہ قائم کر دیا گیا۔ ان دنوں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں طلبا و طالبات کی تعداد تقریباً 400 ہے۔ یہاں بی اے (اردو آنرز)، ایم اے (اردو)، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شعبۂ اردو میں فی الوقت 9/اساتذہ برسر خدمت ہیں جن کی مادری زبان بنگلہ ہے۔ شعبہ کی سیمینار لائبریری میں ڈھائی ہزار اردو کتابیں ہیں جب کہ مرکزی لائبریری میں اردو کتابوں کی تعداد پانچ ہزار کو پہنچتی ہے۔ شعبہ کی جانب سے سالانہ تحقیقی وتنقیدی مجلّہ ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اردو پڑھنے والے طلبا و طالبات کی مادری زبان بنگلہ ہے لیکن وہ اردو زبان و ادب سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں۔ دراصل بنگلہ دیش میں اردو کے مستقبل کے سپاہی یہی طلبا و طالبات ہیں۔ فی الوقت شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی میں چیئرمین کی ذمہ داریاں ڈاکٹر رشید احمد انجام دے رہے ہیں۔'' ۵

ڈاکٹر نعیم انیس بھی 2017ء کے بین الاقوامی کانفرنس میں شریک تھے کانفرنس کا موضوع ''عصر حاضر میں اردو'' تھا۔ نعیم انیس کلکتہ سے ایک سہ ماہی رسالہ فکر و تحریر بھی شائع کرتے ہیں۔ آپ نے جنوری تا مارچ 2018ء کے شمارہ میں ایک خصوصی گوشہ ''عصر حاضر میں بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب'' پر شائع کیا۔ اس گوشہ میں شعبۂ اردو کا بھرپور تعارف پیش کیا گیا ہے وہیں شعبۂ اردو کے اساتذہ اور بنگلہ دیش کے معروف ادیب و شاعر حضرات کی تخلیقات کو بھی جگہ دی۔ تقریباً 80 صفحات کے گوشہ میں ڈاکٹر نعیم انیس نے حتی المقدور کوشش

Journal 03

کی ہے کہ شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کے علمی اور ادبی کارنامے سامنے آسکیں، ساتھ ہی بنگلہ دیش کا موجودہ ادبی منظرنامہ بھی ہمارے سامنے آجائے۔ ڈاکٹر نعیم انیس اپنے اداریہ میں مزید لکھتے ہیں:

> ''بنگلہ دیش میں وہاں کے اساتذہ، ادباء، شعراء صحافی اور طلبا و طالبات سے مل کر اور ان کی اردو زبان سے محبت کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہاں اردو زبان و ادب کا ایک نیا منظرنامہ طلوع ہو رہا ہے جس نے عالمی سطح پر لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانی شروع کردی ہے، جس کا زندہ ثبوت ڈھاکہ یونیورسٹی کی جانب سے دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد تھا۔
>
> شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی کی جانب سے منعقد یہ سیمینار بعنوان ''معاصر دنیا میں اردو'' اس خیال کا محرک بنا کہ بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب کی موجودہ صورت حال سے قارئین ادب کو واقف کرایا جائے۔'' ٦

ڈاکٹر صفدر امام قادری کا شمار ہندوستان کے ان ایسے محققین و ناقدین میں ہوتا ہے جن کی شناخت عالمی سطح کی ہے آپ نے شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی دونوں بین الاقوامی کانفرنسوں (2017 اور 2020) میں شرکت کی ہے۔ ان کے ساتھ ان کے کئی طالب علم بھی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کی یہ بھی روایت رہی ہے کہ کانفرنس کے فوراً بعد اپنے غیر ملکی مہمانوں اور طلبا و طالبات کے ساتھ بنگلہ دیش کے اہم تاریخی مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ یہ تعلیمی ٹور دو یا تین دن پر مشتمل ہوتا ہے۔ صفدر امام قادری کو دونوں کانفرنسوں میں بنگلہ دیش کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا

ہے، انہوں نے اپنا ایک طویل مضمون میں ''بنگلہ میں اردو کی صورت حال'' کا جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

''ڈھاکہ یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کا کیمپس نیا ہے اور نئے انداز کی عمارتوں کا سلسلہ درسلسلہ نظر آتا ہے۔ قلب میں جہاں سے مرکزی عمارت میں جانے کا راستہ ہے وہیں اُن تین شہیدوں کے آدم قد مجسمے کو بڑے اہتمام سے پیش کیا گیا ہے جنہوں نے ۱۹۵۲ء کی لسانی تحریک کا بگل پھونکا تھا۔ دو مرد اور ایک عورت نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کے تعاون سے جو تحریک چھیڑی، آج اسی کا نتیجہ بنگلہ دیش کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ یونیورسٹی نے اپنے ان تحریک کاروں اور محسنوں کو اس اہتمام سے یاد رکھا، یہ قابل توجہ ہے۔ اکثر عمارتیں پانچ منزلہ اور کلاس روم کشادہ اور طلبہ سے بھرے پرے نظر آئے۔'' ۷

شعبۂ اردو کے ذریعہ منعقدہ 2017ء کی دوروزہ بین الاقوامی کانفرنس کے تعلق سے ڈاکٹر صفدر امام لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں بیٹھے ہوئے ہم اس بنا پر غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بنگلہ دیش چوں کہ اردو زبان کی مخالفت کے نتیجے میں قائم ہوا اس لیے اس زبان کا وہاں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا مگر اردو کے طلبا کی بھیڑ مکمل طور سے بدلے ہوئے حالات کا واضح ثبوت ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے بین الاقوامی سیمینار کا جب دعوت نامہ موصول ہوا تو اپنے پڑوسی ملک کی دھرتی پر پروانہ وار

پہنچنے کی سرشاری میں ہم خدائے برتر کے خاص شکر گزار ہوئے کہ اپنی زبان سے محبت کے طفیل خدا نے کتنے جہان نواز دیے ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں سیمینار کا موضوع ''معاصر دنیا میں اردو'' عنوان سے مخصوص تھا۔ عنوان اس اعتبار سے بہت موزوں تھا کہ کسی بین الاقوامی سیمینار میں جہاں مختلف ملکوں سے لوگ آئیں، وہاں الگ الگ خطوں میں زبان وادب کی جو صورت حال ہے، اس کا جائزہ لیا جانا چاہیے جس سے یہ بات سمجھ میں آسکے کہ ہماری زبان کا دائرہ کار وسیع ہو رہا ہے۔'' ۸

ڈاکٹر صفدر امام قادری نے اپنے طویل مضمون میں شعبۂ اردو، آرٹ فیکلٹی ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ شہر اور پورے بنگلہ دیش میں اردو کی سرگرمیوں کا ایک جائزہ پیش کیا ہے، جس میں انہوں نے شعبۂ اردو کے اساتذہ کی علمی ادبی خدمات کے علاوہ آئے ہوئے ہندوستان اور بنگلہ دیش کے ادباء وشعراء خصوصاً نذر الاسلام اور بنگلہ دیش کی لسانی تحریک میں شہید ہونے والے مجاہدین کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک بین الاقوامی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے کارناموں کے قدرداں ہندوپاک کے علاوہ پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی تنقید (تخلیقات، تحقیق کی روشنی میں، ہندوستان کے مسلم مورخ) اور شاعری (نشاط رفتہ) افسانہ نگاری (سچی کہانیاں) وغیرہ سے پوری اردو دنیا میں خوب دھوم مچائی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مشفق خواجہ ماہنامہ فنون لاہور میں ان کی کتاب تحقیق کی روشنی پر تبصرہ کرتے ہوئے ان مضامین کا ذکر کرتے ہیں جو ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ''دور حاضر اور اردو غزل گوئی'' کے تعلق سے ''ساقی'' میں کئی سال تک شائع ہوئے تھے جس میں انہوں نے اپنے زمانے کے معروف

شعراء کے تعلق سے بے باک رائے دی تھی ڈاکٹر مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

''شاعری اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق سے بھی شادانی صاحب کو خاص دلچسپی رہی ہے۔ شاید تدریسی مشغلہ کی بنا پر وہ اس کے لیے مجبور بھی تھے، لیکن اس فن کو ایک ادبی حربہ کے طور پر انہوں نے افسانہ نگاری کے فوراً بعد (۱۹۴۰ء، ۱۹۳۷ء) میں اپنایا اور ''ساقی'' میں دور حاضر کے غزل گو شعراء کے بارے میں بڑے چونکا دینے والے مضامین لکھے۔ حسرتؔ، اصغرؔ، جگرؔ اور فانیؔ اس زمانے میں بے حد مقبول تھے۔ شادانی صاحب نے ان بتوں کو توڑنے پر کمر باندھی۔ انہوں نے صنف غزل کے علائم و رموز کے معنی لغت میں دیکھے اور یہ اعلان کر دیا کہ ان شاعروں نے فرضی اور مصنوعی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے جذبات سچے نہیں ہیں۔''[۹]

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر نے اپنا تحقیقی مقالہ بہ عنوان ''ڈاکٹر عندلیب شادانی: حیات و کارنامے'' تحریر کیا جو بنگلہ دیش میں اپنے وقت کا اولین تحقیقی مقالہ تھا۔ محترمہ ڈاکٹر کلثوم حرف آغاز میں لکھتی ہیں:

''مشرقی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) میں اردو اور فارسی ادب کا جائزہ لیتے ہی ڈاکٹر عندلیب شادانی کا چہرہ اپنی تمام تر جلوہ افروزیوں کے ساتھ اُبھر آتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ بنگلا دیش میں اردو ادب اور ڈاکٹر شادانی لازم و ملزوم بن چکے ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر شادانی نے اپنی زندگی کا طویل ترین حصہ بنگلا دیش کے دارالسلطنت ڈھاکا میں اردو اور فارسی ادب کی

خدمات میں گزارا ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار (سچی کہانیوں کے موجد) نقاد، محقق، مؤرخ، مدیر اور معلم کی حیثیت سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کی ہمہ گیر پُرکشش شخصیت کے گہرے نقوش آج بھی ڈھاکا کی ادبی زندگی میں محسوس کیے جاتے ہیں۔ ان کے انتقال سے بنگلا دیش میں اردو کے ادبی ماحول میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ اس صدی میں پُر ہونا ناممکن ہے۔'' ۱۰

شعبۂ اردو کے اساتذہ ڈاکٹر محمود السلام جو سابق صدر شعبۂ اردو بھی ہیں نے بنگلہ دیش میں اردو کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے جہاں شعبۂ اردو اور ڈھاکہ یونیورسٹی کی علمی ادبی فتوحات کا ذکر کیا ہے وہیں پورے بنگلہ دیش کے معروف ادباء و شعراء کی تخلیقات کا بھی ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر محمود السلام نے بنگلہ دیش میں تعلیمی اداروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اردو کی تعلیم میں مصروف درسگاہوں اور مدارس کا ذکر بھی خصوصیت کے ساتھ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''بنگلہ دیش کے مختلف تعلیمی اداروں میں اردو میں تعلیم دی جا رہی ہے۔ ان تعلیمی اداروں میں ڈھاکہ یونیورسٹی اور راجشاہی یونیورسٹی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں چار سال کا آنرز کورس اور ایک سال کا ایم اے کورس جاری ہے۔ یہاں سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی دی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں نیشنل یونیورسٹی کے ماتحت ڈھاکہ کالج، ایڈن گرلز کالج، وکٹوریہ کالج، راجشاہی کالج میں بھی اردو درس و تدریس انجام دے رہا ہے۔ علاوہ ازیں بنگلہ دیش میں دو قسم کے مدارس ہیں جن میں اردو کے ذریعہ

تعلیم ہوتی ہے۔ایک سرکاری مدارس جہاں قرآن، حدیث، فقہ یعنی اسلامی تعلیمات اردو کے ذریعہ ہوتی ہے۔ دوسری قومی مدارس میں جہاں اسلامی تعلیمات کے سوا ادب، تاریخ، فلسفہ، نحوو صرف تمام موضوعات پر اردو ہی سے درس وتدریس کا کام ہوتا ہے۔'' ۱۱

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی جو کہ 2011ء سے 2014ء تک صدر شعبۂ اردو رہ چکے ہیں کی شخصیت بھی عالمی سطح پر جانی پہچانی جاتی ہے۔آپ بنگلہ دیش اور ہندوستان میں منعقد ہونے والی قومی اور بین الاقوامی کانفرنس اور سیمیناروں میں شرکت کر کے شعبۂ اردو کے وقار میں اضافہ کررہے ہیں۔آپ نے ہندوستان میں بھی میرٹھ، جموں، ممبئی، کشمیر، کلکتہ، حیدر آباد وغیرہ میں بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے۔آپ کے بنگلہ دیش کے ادب کے تعلق سے متعدد مضامین، بنگلہ دیش کے علاوہ ہندوستان کے ادبی مؤقر رسائل جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔آپ کی کئی کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہوچکی ہیں آپ نے اردو کے متعدد فن پاروں کو بنگلہ اور بنگلہ ادب کے فن پاروں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام بھی کیا ہے۔آپ فی الحال ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو کے مدیر ہیں۔آپ کا مضمون ''بنگلہ دیش میں اردو افسانہ: ماضی اور حال'' بھی فکر وتحریر کے گوشہ میں شائع ہوا ہے جس میں آپ نے بنگلہ دیش میں اردو افسانے کا تعارف اور اہم افسانہ نگاروں کا ذکر کیا ہے۔آپ لکھتے ہیں:

''بنگلہ دیش کے افسانہ نگاروں میں شام بارک پوری کا نام بہت اہم ہے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'پدما کی موجیں' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔قیام بنگلہ دیش کے بعد یہ پہلا اردو افسانوی مجموعہ ہے جو منظر عام پر آیا تھا۔۱۹۸۰ء میں شام بارک پوری کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'میگھنا کی لہریں' ۱۹۸۴ء میں 'جمنا کے دھارے' اور ۱۹۸۶ء

میں 'سورج مکھی' شائع ہوا۔ان کے افسانوں کا آخری مجموعہ 'رجنی گندھا' ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا۔

غلام محمد کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔'انگلیاں ریشم کی' جنوری ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کہاں، کدھر، سفر نصیب، گیارہ برس، ٹینشن جیسے ۲۴/افسانے ہیں۔ دوسرا مجموعہ 'ترشنا' اور آخری مجموعہ 'لہو قطرہ قطرہ' میں گیارہ افسانے ہیں۔ کرب، اداسی، ٹوٹا ہوا شیشہ وغیرہ ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔''[۱۲]

ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے بی اے۔ایم اے۔ایم فل کے نصابات تیار کرتے وقت بھی اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ نصاب عالمی ہو۔ پوری اردو دنیا میں موجودہ ادباء و شعراء کی بہترین تخلیقات کو نصاب میں جگہ دی گئی ہے۔اور معاون کتب کے حوالہ سے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنگلہ دیش کے باہر چھپنے والی اردو کی متعدد تنقیدی و تحقیقی افسانوی مجموعے، ناول، شعری مجموعے، خاکے، سفرنامے، ڈرامے وغیرہ کو بنگلہ دیش کے بی اے۔ایم اے اور ایم فل کے نصابات میں جگہ دی گئی ہے۔

شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کے کارناموں پر ایک سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شعبۂ اردو کی ایک عالمی شناخت بن چکی ہے۔شعبۂ کے مختلف اساتذہ اپنے علمی ادبی کارناموں سے نہ صرف شعبۂ کا بلکہ پوری یونیورسٹی اور بنگلہ دیش کا نام روشن کر رہے ہیں، خاص کر عندلیب شادانی ، پروفیسر ڈاکٹر محمد عبد اللہ، ڈاکٹر ام سلمٰی، ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، پروفیسر جعفر احمد بھویاں، پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی، ڈاکٹر محمود الاسلام، ڈاکٹر اسرافیل، محمد غلام مولا، ڈاکٹر رشید احمد، حسین البنا، محترمہ حفصہ اختر وغیرہ کی کتابیں اور علمی و ادبی کارنامے ملک سے باہر کانفرنسوں، سیمیناروں میں شرکت وغیرہ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ شعبۂ اردو جس کے

قیام کو ایک صدی مکمل ہوئی ہے، نے بہت جلد اپنی شناخت عالمی سطح پر بنالی ہے۔ واضح ہو کہ 1921ء میں جب ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو اسی کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو و فارسی کا قیام بھی عمل میں آیا۔ 2007ء میں شعبۂ اردو کو فارسی شعبۂ سے الگ کر کے ایک الگ خود مختار شعبۂ کی شکل دی گئی۔ یوں دیکھا جائے تو شعبۂ اردو کی احیاء کو ابھی پندرہ سولہ برس ہوئے ہیں اور اس قلیل مدت میں شعبۂ اردو نے بہت جلد عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کی ہے۔ اس میں جہاں شعبۂ کے اساتذہ طلبا و طالبات کا ہاتھ ہے وہیں شعبۂ اردو کے صدور حضرات کی منصوبہ بندی، فکرمندی اور دور اندیشی شامل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شیخ الجامعہ حضرات کا شعبۂ اردو کو خاص تعاون دینا بھی شامل ہے۔ میں خصوصی طور پر شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) پروفیسر ڈاکٹر محمد اختر الزماں کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ ان کی خاص توجہ اور عنایت کے زیر سایہ شعبۂ اردو کی پھلنے پھولنے کا بہت اچھا موقع ملا ہے۔

شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کے مختلف تعلیمی ادبی ٹور نے بھی شعبۂ اردو کی پہچان عالمی سطح پر بنائی ہے۔ شعبہ کے طلبا و طالبات نے ہندوستان کے مختلف شہروں اور یونیورسٹی کے علاوہ سارک ممالک کا بھی دورہ کیا ہے جس کے تفصیلی وقتاً فوقتاً شعبۂ سے شائع ہونے والے جرنل ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' اور مختلف بروشرز نے خبروں اور تصاویروں کی اشاعت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کو بین الاقوامی شناخت دلانے میں شعبۂ اردو سے شائع ہونے والے جرنل کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے جس کے مختلف شماروں میں بنگلہ دیش اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ مختلف ممالک میں کام کرنے والے اردو اسکالرس کے مضامین و مقالات کا مستقل شائع ہونا بھی ہے۔ جرنل میں اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ شعبۂ کے اساتذہ طلبا و طالبات کے علمی و ادبی کارناموں کو زیادہ سے زیادہ شائع کیا جائے یہ ہی معاملہ کانفرنس اور

سیمیناروں کا بھی ہے۔ جس میں بنگلہ دیش میں اردو زبان وادب کو پیش پیش رکھا جاتا ہے۔

بنگلہ دیش میں زبان کی تحریک کی سالگرہ منانے کا بھی رواج ہے۔ شعبۂ اردو متعدد بار عالمی سطح کے مختلف پروگرام منعقد کرا چکا ہے غیر ممالک سے آنے والے مہمانوں کی عزت و توقیر اور ان کے خطبات اور انہیں بنگلہ دیش کی سیر کرانے کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس سے شعبۂ کی عالمی شناخت کو تقویت ملتی ہے۔

آخر میں کہنا چاہوں گا کہ کسی بھی تعلیمی درسگاہ کی قومی اور بین الاقوامی شناخت کے ذریعے اس کے اساتذہ اور طلبا و طالبات کے کارنامے ہوتے ہیں جو اسے مضبوط و مستحکم اور پائیدار شناخت عطا کرتے ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر ام سلمی، بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی ماخذ، ساہتیہ وگیشنا کیندر، ڈھاکہ، 2021، ص، 48

۲۔ ڈاکٹر مفتی محمد غلام ربانی، آج کی اردو، ساہتیہ وگیشنا کیندر، ڈھاکہ، ص، 23

۳۔ اکیسویں صدی میں اردو ادب، کانفرنس بروشر، 27-28 جنوری 2020ء ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش، ص، 07

۴۔ اکیسویں صدی میں اردو ادب، بروشر، 27-28 جنوری 2020ء ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش، ص، 09

۵۔ فکر و تحریر، کولکاتا، جنوری تا مارچ 2018ء ص، 6

۶۔ فکر و تحریر، کولکاتا، ص، 8، جنوری تا مارچ 2018ء

۷۔ فکر و تحریر، کولکاتا، ص، 23، جنوری تا مارچ 2018ء

۸۔ فکروتحریر،کولکاتا،ص،15،جنوری تامارچ2018ء

۹۔ ماہنامہ فنون لاہور،تبصرہ،تحقیق کی روشنی میں،ص،479

۱۰۔ ڈاکٹرکلثوم ابوالبشر،ڈاکٹرعندلیب شادانی،حیات اورکارنامے، شعبۂ اردوفارسی،ڈھاکہ یونیورسٹی،بنگلہ دیش،ص،05

۱۱۔ فکروتحریر،کولکاتا،جنوری تامارچ2018ء،ص،48

۱۲۔ فکروتحریر،کولکاتا،،جنوری تامارچ2018ء،ص،58-59

بیرون ممالک یونیورسٹیز میں اردو کی تدریس

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

Abstract

Urdu is one of the fast growing languages in the world today. 2018th Edition of ethnalogue Published by SIL (summer institute of linguistic, USA), Urdu is the 11th most spoken language in the world. According to the 2015 survey of UK, Urdu is the fourth most spoken language in England. Urdu is the seventh most spoken language according to the latest SIL report, Urdu is the fastest growing language in the United States, England and France, apart from the Gulf countries.

Due to this popularity Urdu is being taught in many countries of the world. This article mostly mentions places where I personally visited and met with the teachers and students.List of the universities where Urdu literatures are thought

America: 1.Virginia University, 2.University of Pennsylvania, 3.University of Chicago, 4. Brown University, 5. Northwestern University

6. North Carolina State University, 7. University of North Carolina at Chapel, 8. University of Minnesota, 9. University of Colorado,10. Boston University, 11. University of Utah, 12. Columbia University, 13. Harvard University, 14. Ohio State University, 15. University of Iowa,

ہندستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، انڈیا

16. Johns Hopkins University, 17. University of Michigan, 18. New York University, 19. Princeton University, 20. Yale University

Japan: 1. Tokyo University of foreign languages, 2. Osaka University, 3. Daito Bunka University

Egypt: 1. Al- Azhar University, Cairo (boys Branch), 2. Al- Azhar University, Cairo (Girls Branch, 3. Cairo University, Cairo, 4. Ain Shams University, Cairo, 5. Tanta University, Tanta

Tukey: 1. Istanbul University, Turkey, 2. Ankara university, 3. Saljuk university , Konia

Bangladesh: 1. University of Dhaka, 2. Rajshahi University

Other Universities/ Institutions of the world where Urdu is being thought

1. Mahatma Gandhi Institute, Mauritius and at school level teaching
2.University of Tehran, Iran
3. School level teaching in Fiji
4. Baku state university, Azerbaijan
5. Sofia University, Bulgaria
6. Tajikistan University

Some Important countries where Urdu is being thought London, Germany, France, Italy

اردو موجودہ دنیا میں تیزی سے مقبول ہونے والی زبانوں میں سے ایک ہے۲۰۱۸ کا اتھنالوگ ایڈیشن (Edition of 2018ethnalogue Published by SIL) جسے ایس آئی ایل یعنی سمر انسٹی ٹیوٹ آف لنگویسٹک نے شائع کیا، کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اردو گیارویں نمبر پر ہے۔2015 کے سروے کے

مطابق انگلینڈ میں بولی جانے والی زبانوں میں اردو چوتھی پوزیشن پر ہے۔ ہندستان کے سینس 2011 کے مطابق ہندستان میں سب سے زیادہ بولی جانی والی زبانوں میں اردو ساتویں نمبر پر ہے۔ ایس آئی ایل کی تازہ ترین رپورٹ کے لحاظ خلیجی ممالک کے علاوہ اردو امریکہ، انگلینڈ اور فرانس میں بہت تیزی سے مقبول ہونے والی زبان ہے۔ ایس آئی ایل نے یوروپی ممالک میں صرف فرانس کا ذکر کیا ہے لیکن فرانس کے علاوہ جرمنی بھی بڑا ملک ہے جہاں اردو کے شعرا وادبا کی بڑی تعداد ہے اور اردو بولنے والوں کی ایک بڑی آبادی رہتی ہے۔ گوگل کی اگر بات کریں تو اس میں دو طرح کے سروے رپورٹ ہیں ایک مطابق یہ دنیا کی چوتھی بڑی زبان ہے، جب گوگل یہ کہتا ہے تو اس میں بولی جانے والی زبان کے اعتبار سے بات کی گئی ہے جس میں اردو اور ہندی دونوں کو شامل کیا گیا ہے کیونکہ بول چال کی زبان میں یہ دونوں زبانیں بہت قریب ہیں۔ لیکن گوگل جب صرف اردو کی بات کرتا ہے تو کبھی اسے ساتویں نمبر پر کبھی اکیسویں نمبر پر رکھتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اردو، عربی کے بعد دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے جس نے تہذیبی وثقافتی اعتبار سے دنیا کے طول وعرض کا سفر کیا ہے۔ یعنی تہذیبی ہجرت کے لحاظ سے اردو دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے۔ یہ اردو والوں کے لیے باعث فخر ہے۔ لیکن اس فخر ومباہات کا ذکر اب تک ہم اس تزک واحتشام سے نہیں کر پائے ہیں جتنا کہ ہونا چاہیے تھا۔ شاید اس معاملے میں خود ہم اپنی دور افتادہ تہذیبی وراثتوں سے یا تو واقف نہیں ہیں یا مزید تلاش وجستجو کی کوشش نہیں کرتے ورنہ اردو کے تلاطم خیز سمندر، اس کی موجوں کی طغیانی اور اس کی تہوں میں ابھی بھی بہت سے دُرِ نایاب موجود ہیں۔

بہر کیف ان اعداد وشمار کے بعد ایک اور پہلو کی جانب اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں

کہ ایک افریقی جزیرہ جسے ہم چھوٹا ہندستان بھی کہتے ہیں اس کا نام ماریشس ہے۔ یہاں کی کل آبادی کا تقریباً ۳۳ فیصد حصہ مسلمان ہے۔ ماریشس میں زبان کی تدریس کا یہ نظام ہے کہ مذہب اور کلچر کے اعتبار سے انھیں ان کی تعلیم ان کی زبان میں دی جاتی ہے جیسے مسلمان کے لیے اردو، ہندو کے لیے ہندی، فرانسیسی کے لیے فرانسیسی کی تعلیم لازمی کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے دیار غیر میں ماریشس ایسی اردو کی بستی ہے جہاں ابتدائی سطح سے اعلیٰ تعلیم کی سطح تک اردو پڑھانے کا سرکاری طور پر نظم ہے۔ اس کے علاوہ عرب ممالک میں صرف مصر ہی ایک ایسی اردو کی بستی ہے جہاں اردو کی تعلیم کئی جامعات میں ہوتی ہے۔

ان اعداد و شمار کے بعد ذیل میں ان ممالک کی تفصیلات ملاحظہ کریں۔ سب سے پہلے مشرق وسطیٰ کی بات کرتے ہیں۔

ایران میں اردو کی تدریس

ایران اور ہندستان کے درمیان تہذیبی اور ثقافتی روابط کی طویل اور مستحکم تاریخ رہی ہے۔ تاریخی، تہذیبی اور لسانی اعتبار سے اردو، فارسی سے کئی جہتوں سے قریب تر ہے۔ ان زبانوں میں لین دین کا ایک طویل سلسلہ رہا ہے جس نے تہذیبی روابط کو بھی مضبوط کیا اور ہندستان میں ایک نئی ابھرتی ہوئی بولی کو زبان کی شکل میں پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اسی لیے ہند ایرانی تہذیب جیسی اصطلاح وجود میں آئی جو اس حقیقت کی غماز ہے کہ ہندستان کے تہذیبی عناصر میں ایران کی تہذیب کا بھی حصہ رہا ہے۔ سماجی و ثقافتی حوالوں سے ایرانی تہذیب کے اثرات ہندستان پر واضح طور پر موجود ہیں۔ ہماری روزمرہ زندگی ہو یا سماجی و تہذیبی تقریبات ہر جگہ ان نقوش کو دیکھا جا سکتا ہے۔ لسانی اور ادبی نقطۂ نظر سے یہ

مشترکہ تہذیبی روایت ہے۔اردو ادب وشعر پر فارسی کی مشترکہ روایات کو اس طور نشان زد کیا جاسکتا ہے کہ اردو میں فارسی کے اثرات براہ راست اردو پر مرتب ہوئے ہیں۔خیالات و فکار، موضوعات، تشبیہ و استعارہ، صنائع و بدائع جس طرح فارسی میں مستعمل اور رواج میں تھے اسی طرح اردو میں در آئے۔

ان تمام تہذیبی و ثقافتی حوالوں کے بعد یہ امر قابل غور ہے کہ ہندستان میں فارسی زبان طویل عرصے تک ہندستان کی سرکاری زبان رہی۔ ہندستان نے فارسی زبان وادب کو اپنی تخلیقات سے بھی ثروت مند بھی بنایا۔فارسی کے مستند ادیب وشاعر نے زبان فارسی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور ادب کا قابل قدر سرمایہ تخلیق کیا مگر اہل ایران نے بہت دنوں تک اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا اور اسے 'سبک ہندی' کا نام دیا۔ ہندستان بلکہ برصغیر کے چند ہی ادیبوں اور شاعروں کو اہل ایران نے تسلیم کیا ہے۔اسی طرح اردو زبان کی تعلیم و تدریس کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ایران نے اس زبان کی تعلیم کا نظم بہت دیر سے کیا۔حالانکہ اردو نے عربی کے ساتھ فارسی کے حروف کو اپنایا اور اردو رسم خط کو تو اب بھی اکثر لوگ فارسی رسم خط ہی کہتے ہیں۔ اردو سے فارسی کی اتنی قربت کو اہل ایران نے نہیں سمجھا۔اگر اہل ایران اس زبان کو اپناتے تو اس کی ترقی اور ترویج کی نئی تاریخ ہوتی۔خیر فارسی کے ہے ضرب المثل کے مطابق 'دیر آید درست آید' کے مصداق ہم ایران میں اردو تدریس کے سلسلے کا استقبال کرتے ہیں۔

ایران میں شہر تہران جو کئی اعتبار سے دنیا میں مشہور ہے۔اسی شہر میں 'یونیورسٹی آف تہران' میں اردو تدریس کا سلسلہ 1954 سے شروع ہوتا ہے۔لیکن باضابطہ غیر ملکی زبان کا شعبہ 1969 میں قائم ہوا جس میں دیگر زبانوں کے ساتھ اردو کو بھی خصوصی مقام ملا اور یہاں ایم۔اے کی سطح تک اردو کی تدریس کا نظم ہے۔حکومت پاکستان کے ساتھ اس شعبے کا باضابطہ

معاہدہ ہے جس کے تحت اردو کے نامور اساتذہ یہاں آتے رہے ہیں۔خوشی کی بات یہ ہے کہ ایران سے احباب برصغیر اردو تعلیم کے لیے آئے اور اب یہی ایرانی احباب اس شعبے میں اردو کے اساتذہ ہیں۔ان میں پروفیسر کیومرثی، پروفیسر علی بیات، ڈاکٹر وفا یزدان منش، ڈاکٹر فرازنہ اعظم لطفی، ڈاکٹر علی کاووسی ابھی یہاں درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔میں ذاتی طور پر ان تمام اساتذہ سے مل چکا ہوں اور اس شعبے میں جانے کا شرف بھی حاصل ہے۔اس شعبے کی دو طالبات نے میری نگرانی میں پی ایچ ڈی بھی مکمل کی ہے۔میں ان تمام اساتذہ اور ایران کے اردو طالب علموں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

مشرق وسطیٰ میں تاشقند اردو۔ہندی کا عظیم مرکز

مشرق وسطیٰ میں اردو کی تعلیم و تدریس کے لیے تاشقند ایک اہم مرکز ہے اس ادارے نے ابھی حال ہی میں اردو تعلیم کا اپنا پچھترواں جشن منایا ہے۔یہاں بی۔اے کی سطح سے پی۔ایچ۔ڈی کی سطح تک کی تعلیم کا نظم ہے۔تاشقند ازبکستان کی راجدھانی ہے اس لیے اس شہر کو کئی اعتبار سے اہمیت اور شہرت حاصل ہے لیکن برصغیر کے لیے اس شہر کی ایک بڑی شناخت اردو کی تدریس سے بھی ہے کیونکہ تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی آف اورینٹل اسٹڈیز (ابھی ایک س دو سال قبل تک یہ انسٹیٹیوٹ تھا اور اب اسے یونیورسٹی کا درجہ مل گیا ہے) کے تحت 1947 سے اس ادارے میں اردو۔ہندی کی تعلیم دی جارہی ہے اور یہ سلسلہ آج بھی بر قرار ہے۔خاص بات یہ ہے کہ اردو کے طالب علموں کو ہندی اور ہندی کے طالب علموں کو اردو ایک مضمون کی حیثیت سے لازمی طور پر پڑھنا ہوتا ہے اس طرح اس ادارے سے وابستہ طلبہ و طالبات کے ساتھ ساتھ اکثر اساتذہ بھی دونوں زبانوں سے واقف ہوتے ہیں۔اردو

ہندستان کی قدیم زبان ہے جو ایک عرصے تک سرکاری زبان بھی رہی ہے اس کے بولنے والوں کی تعداد برصغیر میں تقریباً تیس کروڑ سے زیادہ ہے۔ اردو زبان میں ازبکستان بالخصوص مشرق وسطیٰ کے تہذیبی اور تمدنی عناصر کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو زبان میں کثرت سے مشرق وسطیٰ کی زبانوں اور علاقائی بولیوں کے الفاظ آج بھی موجود ہیں۔

اردو اور ہندی زبان کی تدریس اور تعلیم کے لیے سب سے پہلے یہ ادارہ قیام میں آیا لیکن پہلے اس ادارے کا نام ''ترکستان انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز'' تھا جہاں اردو۔ ہندی کے علاوہ کئی اور مشرقی زبانیں پڑھائی جانی شروع ہوئیں۔ بعد میں 1991 میں اس ادارے کا نام تبدیل ہو کر ''تاشقند اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز'' رکھا گیا اور اب یہ 2020 میں یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مشرق وسطیٰ تہذیبی، لسانی اور اقتصادی اعتبار سے جن ممالک سے نزدیک رہا ہے ان کی تہذیب و تمدن کو زبان کے ذریعے سیکھا اور سیکھایا جائے۔ چنانچہ اس ادارے نے محنت و مشقت سے ایشیائی ممالک میں اپنی ایک شناخت قائم کی اور بہت تیزی یہ ادارہ ایشیا اور یوپ کے ممالک میں پہچانا جانے لگا۔ مجموعی طور پر اردو۔ ہندی زبان کی تعلیم و تدریس کی وجہ سے ہمارے لیے یہ ادارہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اب ہندی اردو کے یہ شعبے دو الگ شعبوں میں منقسم ہو گئے ہیں، اب ان دونوں شعبوں کی ترقیات کے امکانات زیادہ قوی ہو گئے ہیں۔

اس ادارے سے اردو اور ہندی کی کئی نامی گرامی شخصیات وابستہ رہی ہیں۔ ابھی پروفیسر الفت محبّ صاحبہ اس شعبے کی صدر ہیں۔ ان کے علاوہ اساتذہ میں ڈاکٹر سراج الدین نور متوف، ڈاکٹر محیا عبد الرحمانوا، ڈاکٹر لولا مکتوبہ، موجودہ صادیقوا، سلیمانوا معمورا، شارا حمید و المخلصہ، کمالہ ایرگا شیوا اور محترمہ تمارا خوجائیوا صاحبہ بہت ہی اخلاص اور محنت و مشقت

سے درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ان اساتذہ میں بہت سے ایسے ہیں جن کے مضامین ہند و پاک کے رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔زیادہ تر اساتذہ پی ایچ ڈی کے علاوہ ڈی لٹ کی بھی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ازبکستان میں تدریس کا ایک ایسا انوکھا نظام بھی ہے جسے دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی ہوئی۔یہاں اساتذہ سبکدوش نہیں ہوتے۔سبکدوشی کے بعد بھی یہ جب تک چاہیں تدریس سے وابستہ رہ سکتے ہیں۔فی الوقت محترمہ تمارا صاحبہ ہیں جو تقریباً اسی سال کی نفیس خاتون ہیں وہ اب بھی بڑی سنجیدگی سے درس وتدریس سے وابستہ ہیں،عمر کے اس حصے میں بھی جس طرح ان کو چاق وچوبند دیکھا وہ قابل رشک ہے۔اسی طرح محترمہ حمیدہ اخلصہ بھی سبکدوشی کے بعد بھی وقت کی پابندی کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ آتی ہیں اور کلاسیں لیتی ہیں۔دوسری قابل ستائش بات یہ ہے کہ تمام اساتذہ بڑے خلوص اور دوستانہ ماحول میں ایک ساتھ رہتے ہیں،کسی کے چہرے پر کسی کے لیے کوئی شکن نہیں دیکھا،سب ایک دوست کی طرح ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ساتھ مل کر انسٹی ٹیوٹ کی ترقی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔طلبہ وطالبات کی بھی بڑی تعداد ہے۔

اس ادارے سے جہاں تک اردو کی تعلیم کے امکانات کی بات کریں تو ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ہماری جانب سے اور اس ادارے کی جانب سے کوتاہیاں ہوئی ہیں۔آج کے دور میں بین الاقوامی سطح پر جب تک دیگر تعلیمی اداروں سے معاہدے نہ ہوں اس وقت تک زبان کی تعلیم کے فروغ کے امکانات محدود رہتے ہیں۔اب تک ہندستان کی چند جامعات سے ہی اس کے معاہدے ہیں جن میں جے این یو،ڈی یو اور حال ہی میں اردو یونیورسٹی حیدرآباد سے اس کا معاہدہ ہوا ہے۔حالانکہ حکومت ہند کی جانب سے اس ادارے کے طلبہ وطالبات کو بڑی تعداد میں وظیفے دئے جاتے ہیں جن میں اردو کے طلبہ وطالبات بھی شامل ہیں۔ایک اہم

بات جس کی جانب توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہاں پی ایچ ڈی اور ایم کے مقالے ازبیکی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ ازبیکی زبان میں لکھے جانے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ازبک جاننے والے اردو ادب سے واقف ہوتے رہتے ہیں لیکن نقصان یہ ہے کہ اردو کے طلبہ کی زباندانی کی صلاحیت کم رہتی ہے۔

مصر اردو کی تابناک سرزمین

اردو کی نئی بستیوں کا جب بھی ذکر آتا ہے اکثر ہم یوروپ و امریکہ سے اس کی ابتدا کرتے ہیں اور اسی پر بات ختم بھی ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو کی دیگر بستیوں سے پہلے یوروپ و امریکہ میں اردو پہنچی اور یہاں کے ادیب و شاعر یقیناً قابل مبارکباد ہیں جو اردو زبان و تہذیب کو زندہ و تابندہ رکھے ہوئے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی اردو کی کئی اہم بستیاں ہیں جن تک ہماری رسائی کم ہوئی ہے اور ان کو اس طرح نہیں سراہا گیا جتنا کہ وہ مستحق ہیں۔ عرب ممالک کو بھی نظر انداز کیا گیا جبکہ ان ممالک کے مابین گہرے روابط رہے ہیں جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

> ''ہندوستان اور عرب ممالک ایک حیثیت سے پڑوسی اور ہمسایہ ملک کہے جاسکتے ہیں، ان دونوں کے بیچ صرف ایک سمندر ہے، لیکن یہ سمندر دونوں سرزمینوں کے درمیں کہیں رکاوٹ نہ بنا، یہ ایک حقیقت ہے کہ دریاؤں اور سمندروں کے کناروں پر موجودہ ممالک عموماً تجارتی ہوتے ہیں، یہی وہ پہلا رشتہ ہے جس نے ان دونوں قوموں کو جوڑ دیا اور ایک باہم تعارف کا سبب بنا۔ عرب تاجر ہزاروں برس

سے ہندوستان کے ساحل تک آتے جاتے رہے ہیں اور یہاں کے
بیوپار اور پیداوار کو مصر اور شام کے راستے یورپ کی منڈیوں تک
پہنچاتے رہے، اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائر ہند، چین اور
جاپان تک لے جاتے رہے۔"(1)

ان بستیوں میں مصر سرفہرست ہے جہاں اردو کی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف اور اردو سے عربی میں ترجمے کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ہم اردو والوں نے یہاں کے ادیبوں اور اساتذہ کی خدمات کو نظر انداز کیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دانستہ ایسا ہوا ہے شاید روابط کی کمی کے سبب اردو دنیا میں بالخصوص مصر کو متعارف کرانے میں ہم اردو والوں سے کوتاہی ضرور ہوئی ہے۔ مصر اگرچہ افریقہ براعظم کا حصہ ہے لیکن یہاں کی تہذیب پورے طور پر عربی تہذیب ہے، بلکہ اس کی تہذیب خود اپنے آپ میں مایہ ناز ہے۔ عربی زبان کا ملک ہونے کے باوصف اس ملک نے دیگر مشرقی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی آبیاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کالج سے یونیورسٹی کی سطح تک اردو کی تدریس اور ریسرچ کے حوالے سے مصر کے اہل اردو کا بڑا کام ہے۔ انھوں نے اردو زبان کی تعلیم کے ذریعے برصغیر سے تہذیبی روابط کو بحال کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

مصر میں اردو کے طلبہ و اساتذہ کی تعداد کو دیکھیں یا اردو تصنیف و تالیف کو دیکھیں تو خوشی ہوتی ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں اساتذہ، طلبہ و طالبات اردو کی تعلیم و تدریس میں مصروف عمل ہیں۔ کالج سے یونیورسٹی کی سطح تک اور پی۔ ایچ ڈی کی سند کے حصول تک کا سفر اردو کے لیے فال نیک ہے۔ مصر میں فی الوقت طلبہ و طالبات اور اساتذہ کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ جن یونیورسٹیز میں اردو کی تعلیم کا باضابطہ نظم ہے ان میں ازہر یونیورسٹی کے دو شعبے

(لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے الگ الگ) عین شمس یونیورسٹی ، قاہرہ یونیورسٹی ، اسکندریہ یونیورسٹی، طنطا یونیورسٹی اور منصورہ یونیورسٹی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ازہر یونیورسٹی کا شعبہ اردو برائے خواتین اور ازہر یونیورسٹی کا لڑکوں کے لیے شعبہ اردو، عین شمس یونیورسٹی اور قاہرہ یونیورسٹی میں سنجیدہ موضوعات پر تحقیقی مقالے بھی لکھے جا رہے ہیں۔ پروفیسر احمد القاضی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ:

> ''قاہرہ یونیورسٹی: مصر کی پہلی یونیورسٹی ہے جس میں اردو زبان کی تدریس شروع ہوئی، ابتدا میں فیکلٹی آف آرٹ کے مشرقی زبانوں کے شعبے کے طالب علم کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے فارسی زبان کے ساتھ اردو یا تر کی اختیاری مضمون کے اعتبار سے پڑھتے تھے لیکن 1966 میں اردو زبان کو اعلیٰ تعلیم میں داخل کر دیا گیا، مصر کے جامعاتی نظام میں ایم اے کرنے والوں کو ڈگری حاصل کرنے کے لیے مقالہ پیش کرنا پڑتا ہے اور اس طرح پوسٹ گریجویشن کلاسز کا آغاز ہوا۔''(۲)

مصر میں اردو کی تاریخ کی ایک صدی بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے کارنامے حروف زریں سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ ہمارے محترم دوست ڈاکٹر پروفیسر یوسف عامر، سابق وائس چانسلر ازہر یونیورسٹی جو بنیادی طور پر اردو کے پروفیسر ہیں، سے اس سلسلے میں ہماری اکثر گفتگو ہوئی ہے انھوں نے مجھے مصر میں اردو کی تاریخ کے حوالے سے چند اہم موڑ کی نشاندہی کی اسی کے ساتھ ڈاکٹر پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم، ڈاکٹر احمد القاضی اور ڈاکٹر جلال السعید الحفناوی کے مضامین سے مصر میں اردو زبان کی نشو ونما اور ارتقا کا علم ہوا۔ وہ اپنے

ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''مصر میں صحیح معنوں میں اردو کی آمد تاریخی تعین بڑا بڑا مشکل ہے۔ لیکن ستر سال پہلے 1930 میں مصر سے اردو کا ایک اخباری جاری ہوا تھا۔ جس کے کچھ شمارے میرے پاس محفوظ ہیں۔ اسی تحریر کا مقصد اس اخبار کی اشاعت سے لے کر اس وقت تک اردو کی رفتار کا جائزہ پیش کرنا ہے، مصر میں اردو زبان کی تاریخ کا پہلا باب تصور کیے جانے کا مستحق ہے۔

قاہرہ سے اردو زبان میں سب سے پہلا رسالہ ''جہان اسلامی'' کے نام سے ابوسعید عربی سے نکالا۔ موصوف ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ جنگ بلغان کے زمانے میں وطن سے ہجرت کر کے ترکوں کے ساتھ جہاد میں شامل ہونے کے لیے ترکی جا پہنچے جہاں غازی انور پاش کے مقربین میں شمار ہونے لگے۔ جنگ بلغان کے ختم ہونے پر قاہرہ تشریف لائے اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لیے اس رسالہ کا سہارا لیا۔ یہ رسالہ اردو عربی اور ترکی تین زبانوں میں نکلتا تھا۔'' (۳)

ابھی میرے سامنے ڈاکٹر ابراہیم کا مضمون ہے جو عربی زبان میں ہے۔ میں نے اپنے مصری شاگرد مصطفیٰ علاء الدین کی مدد سے اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر ابرہیم کا یہ مضمون کافی طویل اور مفید مطلب ہے لیکن کچھ اقتباسات کا مفہوم اس طرح ہے

''سنہ 1930ء میں بڑی تعداد میں ہندو پاک کے لوگ مصر تشریف

لائے۔ یہ لوگ اردو زبان اچھی طرح سمجھتے اور بولتے تھے۔ اور ان میں ہندوستانی ابوسعید العربی کا نام قابل ذکر ہے، جنھوں نے پہلی بار اردو زبان کا رسالہ (جہان اسلامی) کے نام سے قاہرہ سے شائع کیا۔ اسی سال 1930ء میں ایک ہفتہ واری اخبار نکلا جس کے مدیر محمود احمد عرفانی تھے۔ اس اخبار کے اجراء میں ان کے بھائی محمد ابراھیم علی عرفانی نے بھی مکمل تعاون دیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اردو زبان کی تدریس مصری یونیورسٹیوں، تعلیمی اداروں میں پچھلے اسی (80) سال سے چل رہی ہے۔ مصری حکومت نے مشرقی زبانوں کی تعلیم وتدریس پر بیسویں صدی کے نصف اول ہی سے توجہ دینی شروع کر دی تھی تدریس کے سلسلے کا آغاز سنہ 1939ء میں قاہرہ یونیورسٹی کے معہد اللغات الشرقیہ (اورینٹل لینگویج انسٹی ٹیوٹ) میں ہوا۔ جولائی سنہ 1952ء کے بعد مصری حکومت نے اردو زبان میں ریڈیونشریات کا آغاز کیا تاکہ اس کے ذریعہ ہندوپاک کے ساتھ مصر کے دوستانہ تعلقات استوار رہیں۔ یہ پروگرام شام 6 بجے سے 8 بجے تک قاہرہ کے وقت کے مطابق ''ریڈیو قاہرہ'' سے نشر کیا جاتا ہے۔'' (۴)

قاہرہ کے بعد از ہر یونیورسٹی، عین شمس یونیورسٹی اور دیگر جامعات میں اردو درس و تدریس کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ جلد ہی مصر کی دیگر یونیورسٹیوں میں بھی اردو کے شعبے قائم ہونے والے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں اردو پڑھنے پڑھانے والے موجود

ہیں لیکن ابھی تک شاید ہند و پاک کی یونیورسٹیز سے ان کا باضابطہ کوئی معاہدہ نہیں ہے کہ جس کے تحت طلبہ واساتذہ ایک دوسرے ملک میں تعلیم اور تحقیق کے لیے آ، جا سکیں۔ البتہ ہندستانی حکومت کے وظیفے موجود ہیں۔ کئی طلبہ وطالبات ہندستان میں ان وظائف پر تعلیم بھی حاصل کررہے ہیں۔ جامعات کے مابین باضابطہ معاہدے کے لیے ہندستان کی جانب سے پہل کی ضرورت ہیاورخود مصری جامعات کو بھی اس جانب متوجہ ہونا چاہیے۔

مصر میں اردو کے آغاز کی تاریخ ستر برسوں (70) پر محیط ہے لیکن ابھی تک صرف چند احباب نے ہی ہند و پاک کی جانب رخ کیا اور یہاں سے فراغت کے بعد اردو کی خدمت میں مصروف ہیں۔ قاہرہ میں جن اساتذہ نے جامعہ ازہر سے اردو میں بی۔اے کرنے کے بعد پاکستان سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ان میں ایھاب حفظی عز العرب، ابراہیم محمد ابرہیم اور جنھوں نے ہندستان سے پی ایچ ڈی کی ان میں احمد القاضی اور یوسف عامر صاحبان ہیں۔ فی الوقت میری نگرانی میں ایک مصری طالب علم مصطفیٰ علاء الدین پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ ازہر یونیورسٹی کے کئی طالب علموں سے اس سفر میں ملاقات ہوئی جو ایم اے اور پی ایچ ڈی کے لیے ہندستان آنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ پروفیسر ابرہیم محمد ابراہیم کے علاوہ یہ چاروں اساتذہ کئی بار ہندستان کے بڑے سیمناروں کے لیے مدعو کیے گئے۔ اس ناچیز نے پروفیسر جلال الحفناوی اور پروفیسر احمد القاضی کو دو عالمی سیمناروں میں مدعو کیا تھا، انھوں نے میری دعوت قبول کرکے ہمارے سیمنار کو بامقصد بنایا۔ پروفیسر یوسف عامر کی ضیافت کا وہ شرف تو حاصل نہ ہوسکا لیکن انھوں نے میری دعوت پر جواہرلعل نہرو یونیورسٹی میں لیکچرز دیے۔ ڈاکٹر رانیا فوزی سے بھی پہلی ملاقات پروفیسر یوسف عامر کے ہمراہ جواہرلعل نہرو یونیورسٹی میں ہوئی اور گزشتہ سال ڈاکٹر مروہ لطفی کو لکھنؤ کے لیے زحمت دی تھی۔ ڈاکٹر بسنت

محمد شکری اس سال ایوان غالب، نئی دہلی کی دعوت پر ہندستان آئی تھیں۔ ان کے علاوہ مصر کے دیگر اساتذہ جیسے ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی، ڈاکٹر رباب محمد، ڈاکٹر ایناس عبدالعزیز وغیرہ سے شوشل میڈیا کے ذریعے میرا تعارف تو تھا لیکن براہ راست ملاقات اس سفر میں ہوئی۔ اساتذہ کے علاوہ بہت سے طالب علموں سے میں شوشل میڈیا کے ذریعے ہی رابطے میں رہا۔ ڈاکٹر ابرہیم محمد ابرہیم صاحب سے میری پہلی ملاقات فیصل آباد، پاکستان کے ایک بین الاقوامی سیمنار میں ہوئی تھی۔ جن اساتذہ کا ابھی ذکر ہوا ہے اس کے علاوہ بھی کئی نامور اساتذہ مصر کی مختلف یونیورسٹیز میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں جن سے اس سفر میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ یہ تمام سینئر اساتذہ کئی درجن کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر اردو کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف عامر کی کتاب ''جدید عربی اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ'' ہندستان کے معروف ادارے انجمن ترقی اردو ہند سے شائع ہوکر کافی مقبول ہوئی۔ مصر میں حکومت کا ایک ادارہ 'قومی سینٹر برائے ترجمہ' ہے جہاں سے اردو کی مترجمہ سیکڑوں کتابیں شائع ہوئی ہیں جس کے سبب اردو عالم عرب سے روبرو ہورہی ہے۔ جن اساتذہ کی کتابیں اس ادارے سے شائع ہوئی ہیں ان میں پروفیسر ابراہیم محمد ابراہیم، پروفیسر یوسف عامر، پروفیسر جلال الحفناوی، پروفیسر احمد القاضی وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ ازہر کے شعبہ اردو سے سالانہ رسالہ بھی نکلتا ہے جو اردو اور عربی دونوں زبانوں میں ہوتا ہے۔

اردو کے مصری اساتذہ سے ملنے اور مجموعی طور پر اردو کے شعبوں کے دورے کے بعد ایک کمی کا احساس ہوا جس کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوا کہ اردو کے اساتذہ اور طلبہ اکثر آپس میں عربی زبان میں ہی باتیں کرتے ہیں۔ اگر اساتذہ اس جانب متوجہ ہوں اور ایسی کوشش کریں کہ کم از کم شعبے میں تمام اساتذہ اور طلبہ و طالبات اردو میں ہی

باتیں کریں تو اردو کی تفہیم اور تدریس میں مزید تیزی آئے گی۔ گاہے بگاہے ان شعبوں میں قومی اور بین الاقوامی سیمنار بھی منعقد ہوتے رہتے ہیں لیکن سیمنار کی زبان اکثر عربی ہوتی ہے اگر یہ تمام سرگرمیاں اردو زبان میں ہوں تو اردو کا رواج زیادہ ہوگا جو نئے طالب علموں کے لیے مفید بھی ہوگا۔ دوسری بات جس کا خصوصی طور پر میں ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ مصر کے اساتذہ کی زیادہ تر تصانیف اور ریسرچ اسکالر کے مقالے عربی زبان میں ہیں۔ اگر یہ اپنی تحریریں اردو میں لکھیں اور ہندو پاک کے رسائل میں شائع ہوں تو یہ خود بخود برصغیر اور اردو کی دوسری بستیوں میں متعارف ہوں گے۔ اردو کے مہجری ادیب ہر جگہ اپنی تخلیقات کے سبب جانے جاتے ہیں۔ مصر کے اساتذہ میں بھی بخوبی تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں میری ان سے گزارش ہے کہ اس جانب بھی متوجہ ہوں۔ مجموعی طور پر میں اہل مصر اور حکومت مصر کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ وہ برصغیر کی زبان وتہذیب کو پروان چڑھانے کی دل سے کوشش کر رہے ہیں۔

جاپان کی جامعات میں اردو کی تدریس

جاپان بھی اردو کا بڑا گہوارا ہے یہاں اردو کی تعلیم کا سلسلہ سو برس پر محیط ہے۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو تدریس کے سو برس پورے ہونے پر 2010 میں جشن صد سالہ منایا تھا۔ جاپان میں تین اہم یونیورسٹیز ہیں جہاں ایم۔ اے کی سطح تک کی تدریس کا نظم ہے ان میں ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز جس کا قیام 1908 میں عمل میں آیا۔ اس کا نام پہلے ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویجیز تھا جسے بعد میں یونیورسٹی کا درجہ ملا اس یونیورسٹی میں ''ہندستانی شعبہ '' کھولا گیا جس میں اردو۔ ہندی کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن 1947 میں تقسیم ملک کے بعد اس شعبے کا نام بدل کر شعبہ اُردو رکھا گیا۔ یہاں بی۔ اے سے ایم۔ اے کی سطح تک کی تعلیم کا نظم

ہے۔ ہندستان کے مقابلے اس ادارے کا پاکستان سے گہرا تعلق ہے۔ یہاں مستقل پاکستان سے اردو کے اساتذہ تدریس کے لیے جاپانی حکومت کی جانب سے بلائے جاتے ہیں۔ اس وقت یہاں پروفیسر ہیروشی ہاگیتا صدر ہیں یہ جاپانی زبان میں اردو کا ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔ ان سے ہماری کئی بار کی ملاقات ہے۔ ان کے علاوہ اس شعبے میں پروفیسر اسادا اور پروفیسر مامیا کین ساکو اور ایک پاکستانی استاد ہیں۔ میرے مشورے سے انھوں نے حال میں اپنے رفیق کار ڈاکٹر مامیا کین ساکو کو جے این یو سے باضابطہ معاہدے کے لیے بھیجا تھا جو الحمد اللہ ہو گیا اور دونوں جانب سے طلبہ و اساتذہ کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو سکتا ہے۔ اس شعبے سے منسلک پروفیسر اسادا اور پروفیسر سوزوکی تاکشی کا اہم نام ہے۔

پروفیسر آرگامو کو جاپان میں ''اردو کا بابائے'' کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اردو تدریس اور اردو زبان کے فروغ میں ان کی کوششوں کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ حالانکہ جاپان میں اردو تدریس کی ابتدا کے حوالے سے ہندستان کے انقلابی رہنما مولوی برکت اللہ کا نام سرفہرست ہے۔ وہ 1908 میں جاپان گئے اور انھوں نے ہی وہاں اردو تدریس کی بنیاد ڈالی۔ جاپان میں ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویجز کے شعبہ ہندوستانی کے اولین استاد پروفیسر انوئی تھے جو تین برس تک اس شعبے سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد ٹوکیو سے ہی فارغ اردو کے طالب علم ریچی گامو یہاں استاد مقرر ہوئے اور وہ باضابطہ اردو کے پروفیسر بنائے گئے۔ ان کی کوششوں سے اردو کی تدریس نے کافی ترقی کی۔ انھوں نے ہند و پاک کے ادیبوں سے رابطے بھی کیے ان میں پروفیسر نورالحسن کا نام اہم ہے۔ ان دونوں نے مل کر اردو بول چال کی درسی کتاب تیار کی جو آج بھی نصاب میں شامل ہے۔

ٹوکیو یونیورسٹی کے بعد اوساکا یونیورسٹی اور دائیتو بنکا یونیورسٹی کا نام آتا ہے۔ یہاں

بھی اردو بی۔اے اور ایم۔اے کی سطح تک پڑھائی جاتی ہے۔اوساکا میں اردو 1921 سے اردو تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1921 میں اوساکا اسکول آف فارن لینگویجز کا قیام عمل میں آیا جو آگے چل کر 1944 میں کالج بنا اور 1945 میں اس نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا۔ اس شعبے سے منسلک اساتذہ میں پروفیسر ہیروشی کان کا گایا، پروفیسر تسونیو ہما گچی، پروفیسر میتسومورا استاد پروفیسر سویامانے اردو میں اچھی شاعری کرتے ہیں۔ دائیتو بنکا یونیورسٹی کے اساتذہ میں ایک اہم نام پروفیسر ہیروجی کتاؤ کا ہے۔ یہ اب سبکدوش ہو چکے ہیں یہ بہت نفیس اردو بولتے ہیں اور اردو میں اچھی شاعری کرتے ہیں اور غالب کے کلام کو لحن سے جاپانی انداز میں پڑھتے ہیں۔ اسکے علاوہ جاپانی ادارہ برائے بین الاقوامی تعاون جائیکا کا تربیتی مرکز ہے جہاں اردو کی ثانوی سطح کی تدریس کا انتظام ہے۔

مجموعی طور پر جاپان جیسے ملک میں اردو کی تدریس کا انتظام ہے مگر زیادہ تر یونیورسٹیز میں طلبہ و طالبات کی تعداد بی۔اے میں زیادہ سے زیادہ بیس اور ایم۔اے میں پانچ یا چھ ہوتی ہے۔ان یونیورسٹیز سے پاکستان کے تعلقات زیادہ۔بہتر ہیں اور جاپانی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو پاکستان کی زبان ہے اس لیے وہ زیادہ تر معاہدے پاکستان کی جامعات سے کرتے ہیں۔ ہندستان کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کو چاہیے کہ ان سے اردو کے نام کے حوالے سے رابطہ قائم کریں۔

ماریشس میں اردو کی تدریس

ماریشس کو ہم چھوٹا ہندستان کہتے ہیں اس لیے کہ یہاں کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ہندستانی مہاجرین کی ہے اسی لیے یہاں کی تہذیب وتمدن میں ہندستانی خوشبو موجود ہے اور

بڑی تعداد میں اردو بولنے والے ہیں۔ ماریشس میں اردو تدریس کی کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں اسکولوں میں اردو تدریس کا نظم ہے۔ ماریشس میں اردو کے ایک ادیب فاروق رجل نے وہاں کی منسٹری کی ایک رپورٹ مجھے بھیجی ہے جس کے مطابق وہاں اسکولوں میں معلمین کی تعداد 254 ہے۔ اردو کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ ہے جس کی بنیاد اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے 1970 میں رکھی تھی۔ 1974 سے یہاں اردو تعلیم کا نظم ہوا۔ یہاں کئی ہندستانی زبانیں جیسے اردو، ہندی، تمل، تلگو، مراٹھی وغیرہ پڑھائی جاتی ہیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ میں بی۔اے اور ایم۔اے کی سطح کی تعلیم ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح اسکولوں میں اردو تدریس کا انتظام ہے۔ اعلیٰ اردو تدریس کے لیے صرف یہی ایک دارہ ہے جہاں بی۔اے۔ میں تو تقریباً بیس طلبہ وطالبات ہوتے ہیں مگر ایم۔اے کی سطح پر طالب علموں کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے۔ اس ادارے کے پہلے انچارج قاسم ہیرا تھے اس کے بعد اس قافلے میں عنایت حسین عیدن شامل ہوئے جو ماریشس میں اردو کے بڑے ادیب ہیں انھوں نے ناول، افسانہ، ڈرامے لکھے۔ ان کے علاوہ صابر گوردڑ، اعجاز رحمت علی، آصف علی محمد، سکینہ، زینب، نازیہ اور مہرین کا نام ہے۔

یہاں بی۔اے اور ایم۔اے میں ایک پیپر کے طور پر طلبہ مقالہ لکھتے ہیں جس کو دیکھنے کے لیے ہندستان یا پاکستان سے بیرونی ممتحن کے طور پر بلایا جاتا ہے۔ ایک دہائی قبل آئی سی سی آر کی جانب سے اردو کے اساتذہ بھیجے جاتے تھے مگر اب یہ سلسلہ شاید اہل ماریشس کی تساہلی کے سبب بند ہوگیا ہے۔ میں بھی دوسال اس ادارے میں بیرونی ممتحن کے طور پر خدمات انجام دی ہیں۔ میں نے یہاں کے اساتذہ کو اس جانب متوجہ کیا مگر اب تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا ہے۔

ترکی میں اردو کی تدریس

اردو تدریس کے لحاظ سے ترکی اردو کی ایک اہم بستی ہے۔ ترکی میں اردو تدریس کے سو سال مکمل ہو چکے ہیں اور 2015 میں استنبول یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے اردو تدریس کا جشن صد سالہ منایا جس میں دنیا بھر سے سو سے زائد مندوبین نے شرکت کی تھی۔ استنبول میں تین بڑی یونیورسٹیز میں اردو پڑھائی جاتی ہے ان میں استنبول یونیورسٹی، انقرہ یونیورسٹی اور سلجوق یونیورسٹی، (قونیا) ہیں۔ اردو تدریس کا سلسلہ سب سے پہلے انقرہ یونیورسٹی میں 1956 سے شروع ہوا۔ پاکستانی حکومت نے اس سلسلے میں بڑی مدد کی اور اپنے ملک سے ڈاکٹر داؤد رہبر کو یہاں اردو تدریس کے لیے بھیجا انھوں نے اردو کورسیز کو مرتب کیا اس طرح یہ شعبہ ترقی کرتا گیا۔ اردو کے پہلے ترک استاد شوکت بولو ہیں ان کی شبکدوشی کے بعد ڈاکٹر سلمی پینلی نے انقرہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو کا عہدہ سنبھالا۔ اس درمیان پاکستان سے کئی اردو کے اساتذہ جاتے رہے۔ فی الوقت یہاں ڈاکٹر گلسرین ہالی جی اوزکان، ڈاکٹر آسمان بیلن اوز جان اور ایمیل سیلیم اردو کی استاد ہیں۔ یہاں بی۔اے، ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی سطح تک اردو کی تعلیم کا نظم ہے۔ لیکن یہاں بھی پی ایچ ڈی کے مقالے ترکی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔

سلجوق یونیورسٹی جو قونیا میں واقع ہے یہاں بھی اردو کا بڑا شعبہ ہے جو ڈاکٹر ایرکن ترکمان کی کوششوں سے 1985 میں قائم ہوا۔ یہاں بھی ایم۔اے تک کی تعلیم کا نظم ہے اس شعبے میں اردو کے طلبہ وطالبات کی خاطر خواہ تعداد ہے۔ یہاں بھی ایم کے مقالے ترکی زبان میں لکھے جاتے ہیں۔ یہاں کے اساتذہ میں ڈاکٹر نوریے بلک، ڈاکٹر درمش بلغور، ڈاکٹر خاقان قیومجو، ڈاکٹر رجب درگن کے نام اہم ہیں۔

ترکی میں اردو کا تیسرا اور سب سے بڑا شعبہ استنبول یونیورسٹی میں قائم ہے جو 1974 میں قائم ہوا۔ یہاں بی۔اے۔، ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ترکی میں سب سے فعال یہی شعبۂ اردو ہے۔ یہاں کے نامی گرامی پروفیسر خلیل طوق آر ہیں جو اردو کے اچھے نثر نگار اور شاعر بھی ہیں انھوں پچاس سے زائد کتابوں کی تصنیف اور ترجمہ کیا ہے۔ان کے علاوہ پروفیسر جلال سوئیدان، ڈاکٹر کارداش ذکائی اور خدیجہ گورگن اس شعبے سے وابستہ ہیں۔ ایک ہندستانی استاد کو ڈاکٹر راشد کو ذاتی طور پر رکھا گیا ہے۔اس شعبے نے تحقیق، تنقید اور شاعری کی سمت میں بڑے کام کیے ہیں۔ یہاں اکثر و بیشتر ادبی سیمناروں کا بھی انعقاد کیا جاتا رہا ہے۔

مجموعی طور پر ترکی میں اردو کی اعلیٰ سطح پر اردو کی تدریس بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے۔ یہاں مختلف اصناف نثر و نظم پر سو سے زائد پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں۔کچھ مقالے جستہ جستہ شائع بھی ہوئے ہیں جن سے کم از کم ترکی جاننے والے مستفید ضرور ہوئے ہیں۔ان تمام یونیورسٹیز سے حکومت پاکستان کے گہرے روابط ہیں۔ ہندستان کو بھی ان سے روابط پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ان اساتذہ کے لیے مشکل یہ ہے کہ یہاں اردو بولنے کا رواج کم ہے اسی لیے زیادہ تر یہ اپنی زبان میں باتیں کرتے ہیں اسی لیے کچھ اساتذہ بہت روانی سے اردو نہیں بول پاتے۔لیکن مقام شکر ہے کہ اردو کی تدریس کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔

یوروپی ممالک میں اردو کی تدریس

یوروپی ممالک میں اردو کی تدریس کے لحاظ سے سب سے پہلے ہائیڈل برگ یونیورسٹی کا نام سامنے آتا ہے۔ یہاں کا شعبۂ اردو کرسٹینا اوسٹر ہلڈ کی وجہ سے بہت مشہور ہوا کیونکہ کرسٹینا ایک

پڑھی لکھی خاتون ہیں، وہ خالص لب و لہجے میں بہت نفیس اردو بولتی ہیں۔ انھوں نے ہند و پاک کے علاوہ کئی ممالک میں اردو کے سیمناروں میں شرکت کی ہے۔ ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں بی۔اے اور ایم۔اے سطح کی تعلیم ہوتی ہے۔ لیکن اب طلبہ و طالبات کی تعداد کم ہوگئی ہے۔ اس ادارے کو پاکستانی حکومت نے اقبال چیئر دے رکھا ہے جس کے تحت پاکستان سے اکثر اردو کے پروفیسران وہاں جاتے ہیں۔ ابھی کئی برسوں سے یہ چیئر خالی ہے۔

برلن یونیورسٹی میں اردو تدریس کا سلسلہ بہت قدیم تھا لیکن اتحاد کے بعد یہ سلسلہ موجود نہیں۔ اب برلن میں ہمبولٹ یونیورسٹی میں بھی اردو کی تدریس ہوتی ہے لیکن یہاں ابتدائی اور بی۔اے کی سطح تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ ابھی سرور غزالی اس شعبے سے جڑے ہوئے ہیں، یہاں کے طالب علم جز وقتی اردو کورس کے لیے معاہدے کے تحت جے این یو آتے رہتے ہیں۔ اس شعبے سے جناب عارف نقوی برسوں تک جڑے رہے۔ اسی شہر میں ''فری یونیورسٹی'' بھی ہے جہاں ابتدائی سطح کی اردو تدریس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ برلن میں ائرفورٹ میں بھی اردو کا شعبہ تھا جو اب بند ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی جرمنی میں کئی یونیورسٹی ہیں جہاں اردو کی تدریس کا انتظام طلبہ کے مطالبے پر ہوتی ہے لیکن اعلیٰ تعلیم نہیں ہوتی۔ جرمنی میں برلن کے جز وقتی لیکچرشپ ہیمبرگ، بون، ٹوئنگن، میونخ، ورتزبرگ، مائنز میں قائم ہے۔ ہالینڈ میں لائیڈن یونیورسٹی میں اضافی مضمون کے طور پر اردو کی تدریس کا نظم ہے۔ اسی طرح ایمسٹرڈیم یونیورسٹی میں خود اختیاری مضمون کے طور پر اردو تدریس کا نظم ہے۔ سوئٹزرلینڈ کی برن یونیورسٹی میں ایم۔اے کی سطح تک اردو تدریس کا نظم ہے۔ اس یونیورسٹی سے مشہور مستشرق اشپرینگر وابستہ رہے ہیں۔ وارسا یونیورسٹی پولینڈ میں ایم۔اے تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہاں ہندستانی شعبے کے تحت اردو کی تدریس کا نظم ہے۔ پولینڈ کی دوسری یونیورسٹی آدم میکویز

یونیورسٹی میں بھی اردو بطور غیر ملکی زبان پڑھائی جاتی ہے۔ اوسلو یونیورسٹی ناروے میں شعبۂ مشرقی علوم کے تحت عربی، فارسی، سنسکرت کے ساتھ اردو کی بھی تدریس ہوتی ہے۔ سویڈن کے اپسالا یونیورسٹی میں بھی اردو کی تدریس و تحقیق ہوتی ہے۔ یہاں ہینز وارنر ویسلر کی سربراہی میں یہ شعبہ سرگرم ہے۔

یوروپ کے ممالک میں فرانس کا نام اردو تدریس کے لیے اہم ہے گارسین دتاسی نے 1828 فرانس میں اردو تدریس کی بنیاد ڈالی۔ گارسین دتاسی وہی اہم مستشرق کا نام ہے جن کی تحقیقات کو آج بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ فرانس میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار لینگویج اینڈ سویلائزیشن جس میں اعلیٰ سطح کی اردو تدریس ہوتی ہے۔ فرانس میں اردو بولنے والے کی اچھی تعداد ہے اسی لیے کئی اردو کی تنظیمیں بھی موجود ہیں۔

یونیورسٹی اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، (نیپلز اٹلی) یہ بہت قدیم تعلیمی ادارہ ہے اس کا قیام اٹھارہویں صدی میں ہوا لیکن پہلے اس کا نام ایشیائی علوم کا شاہی مدرسہ جسے Real AsiatieoCollegio تھا پھر اس کا نام اورینٹل انسٹی ٹیوٹ ہوا اس کے بعد انسٹی ٹیوٹ سپریر اورینٹل ہوا اور آخر میں یونیورسٹی اورینٹل انسٹی ٹیوٹ ہوا۔ اس ادارے میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا نظم ہے۔ یہاں پی ایچ ڈی کی سطح تک اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اس یونیورسٹی میں کئی اہم تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں۔

روم میں ازمیو یعنی Esttremo Ed Pero Italiano institute Oriente ایک نیم سرکاری ادارہ ہے۔ اس ادارے میں دیگر مشرقی زبانوں کے ساتھ اردو کی تدریس کا اعلیٰ نظام ہے جہاں تین سالہ کورس کے تحت اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اس ادارے کی دو شاخیں بھی ہیں ایک میلان میں اور دوسرا تیورن میں۔ چارلس یونیورسٹی۔ پراگ۔ چیک

ریپبلک میں 1942 سے اردو کی تدریس کا عمل شروع ہوا۔ پروفیسر ونسنس پورزگا کا شمار اردو تدریس کے پیش نہاد مستشرق میں ہوتا ہے۔ کارولین یونیورسٹی (پراگ۔ چیک جمہوریہ) میں بھی اردو تدریس کا نظم ہے پروفیسر یان مارک کا اہم نام اس یونیورسٹی سے جڑا ہوا ہے۔ انھوں نے پراگ یونیورسٹی سے اقبالیات پر پی ایچ ڈی کی ہے۔

یوروپی ممالک کی ان جامعات میں اردو کے اہم موضوعات پر کئی قابل قدر تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں اور کئی مستشرقوں نے اردو کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ ان یونیورسٹیز کی اردو خدمات پر کسی ادارے کی مدد سے تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ دیار غیر میں اردو کی تدریس اور تعلیم کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے ہیں ان کو اردو تدریس کی تاریخ میں محفوظ کیا جا سکے۔

برطانیہ میں اردو کی تدریس

برطانیہ میں اردو کے فروغ کی کہانی عام طور پر برصغیر پر برطانوی تسلط سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن برطانیہ میں اردو تدریس اور تحقیق کی تاریخ اس سے پہلے کی ہے حالانکہ برطانیہ میں اردو درس و تدریس کا سلسلہ یورپ کے کئی ممالک کے بعد شروع ہوتا ہے مگر برطانیہ نے اردو زبان و ادب اور تدریس میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ خود ہندستان میں فورٹ ولیم کالج بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے جو برطانوی کوششوں کا نتیجہ تھا لیکن خود برطانیہ کے مختلف شہروں میں کئی جامعات اور کالجز ہیں جو اردو کی درس و تدریس میں آج بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ برطانیہ میں ان کی تعداد بہت ہے لیکن یہاں ہم چند اہم جامعات کا ذکر کرتے ہیں۔

برطانیہ کی مختلف کی یونیورسٹیز میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا نظم ہے ویسے ابتدائی سطح پر اردو کی تدریس بیشتر یونیورسٹیز اور کالجز میں موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برطانیہ میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں اردو چوتھے نمبر پر ہے۔ برطانیہ کے کئی شہروں میں تو مقامی لوگوں سے بھی زیادہ تعداد مہاجرین کی ہے اس لیے اردو تدریس کا نظام کسی نہ کسی طور پر وہاں موجود ہے۔ لندن کے علاوہ مانچیسٹر، شیفلڈ، برمنگھم اور کئی جگہ اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں لندن یونیورسٹی کا اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز (SOAS) کا نام بہت اہم کیونکہ اس وابستہ کئی مستشرقوں نے اردو تحقیق وتصنیف کے سمت میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، آکسفورڈ یونیورسٹی میں 1859 سے اردو کی تعلیم کا آغاز ہوا، کیمبرج یونیورسٹی میں 1832 سے اردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے، رائل ملٹری اکیڈمی میں 1861 سے اردو کی تدریس ہورہی ہے۔ ان کے علاوہ کنگز کالج لندن، چیلٹھنم کالج برطانیہ، ٹرنٹی کالج ڈبلن، رائل ملٹری اکیڈمی ولوچ، ایٹن کالج، ایڈن برگ یونیورسٹی اسکاٹ لینڈ، یونیورسٹی آف ڈرہم، برمنگھم یونیورسٹی وغیرہ میں بھی اردو کی تدریس ہورہی ہے۔

امریکی جامعات میں اردو کی تدریس

امریکہ میں اردو کی تدریس کا نظم کئی ریاستوں میں ہے لیکن زیادہ تر یونیورسٹیز میں اردو بی۔اے کے لیول تک پڑھائی جاتی ہے اعلیٰ تعلیم یعنی اردو میں پی۔ایچ ڈی کی ڈگری شاید ہی کسی یونیورسٹی میں ہوتی ہے۔ جن جامعات میں اردو پڑھائی جارہی ہے ان میں اہم یہ ہیں۔ ورجینیا یونیورسٹی، یونیورسٹی آف پینن سلوانیا، یونیورسٹی آف شکاگو، آک لینڈ یونیورسٹی، برکلے یونیورسٹی، کارنل یونیورسٹی، پورٹ لینڈ یونیورسٹی، ہارورڈ یونیورسٹی، ڈیوک

یونیورسٹی، براون یونیورسٹی، نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی، یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا، نارتھ کیرولینا اسٹیٹ یونیورسٹی، یونیورسٹی آف مینی سوٹا، یونیورسٹی آف کولوراڈو، بوسٹن یونیورسٹی، یونیورسٹی آف اوتاہ، کولمبیا یونیورسٹی، ہارورڈ یونیورسٹی، اوہیو یونیورسٹی، یونیورسٹی آف لوا، جان ہاپکنس یونیورسٹی، یونیورسٹی آف میشی گن، نیویارک یونیورسٹی، پرنسٹن یونیورسٹی، ییلے یونیورسٹی۔

امریکہ کے علاوہ کناڈا کے جن جامعات میں اردو کی ابتدائی تدریس کا نظم ہے ان میں اہم یہ ہیں۔ کناڈا میں میکگل یونیورسٹی، برٹش کولمبیا یونیورسٹی، ٹورنٹو یونیورسٹی میں بھی اردو تدریس کا نظم ہے۔

افریقہ میں اردو کی تدریس

افریقی ممالک میں اردو کے تدریس کے حوالے سے جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ) کا ذکر ضروری ہے۔ جوہانسبرگ میں اُردو بولنے والوں کی اچھی تعداد موجود ہے۔ یونیورسٹی آف ڈربن ویسٹ ویل میں شعبہ اُردو، فارسی اور عربی ہے جہاں بی۔اے تک اُردو بطور اختیاری مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی بھی اُردو میں کر سکتے ہیں۔

بنگلہ دیش میں اردو کی تدریس

بنگلہ دیش میں یوں تو اردو کی تدریس کا سلسلہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں 1921 سے ہی شروع ہوتا ہے جہاں ایک ہی شعبے میں اردو، عربی اور فارسی کی تدریس کا نظم تھا۔ 2007 میں طالب علموں کی تعداد بڑھتی گئی تو اردو کو الگ شعبے طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی نے منظوری دی اور اب یہ اردو کا ایک بڑا شعبہ ہے جس میں 9 اردو کے اساتذہ ہیں اور تقریباً ۴۰۰ طلبہ ہیں۔ یہ

سارے اساتذہ اور طلبہ بنگالی ہی ہیں۔ابھی حال میں ہندستان کی حکومت کی جانب سے اس یونیورسٹی میں اردو کے استاد کو بھیجنے کی بات چلی ہے۔ممکن ہے بہت جلد کوئی ہندستانی استاد وہاں مقرر ہوں۔ یہاں بی اے آنرز، ایم۔اے،ایم فل اور پی ڈی کی سطح تک کی تعلیم کا نظم ہے۔ بنگلہ دیش میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی سرگرمیاں قابل تعریف ہیں۔ یہاں عالمی کانفرنس کا باضابطہ انعقاد اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کے فروغ، ترویج اور تشہیر میں اساتذہ اور یونیورسٹی کے منتظمین کافی دلچسپی لیتے ہیں۔اب تک اس شعبے کی جانب سے کئی عالمی سیمنار ہو چکے ہیں اور ان مقالوں کو کتابی صورت میں شائع بھی کیا جا چکا ہے۔اس کے علاوہ ڈھاکہ یونیورسٹی اردو جنرل کی اشاعت یقیناً قابل صد ستائش ہے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کی طرح راج شاہی یونیورسٹی میں بھی پی ایچ ڈی کی سطح تک کا نظم ہے یہاں 1962 سے اردو کی تدریس کا سلسلہ ہے لیکن پہلے یہ لینگویجیز ڈیپارٹمنٹ کے تحت تھا جس میں کئی غیر ملکی زبانیں پڑھائی جاتی تھی ابھی حال ہی میں 2018 میں یہ خود مختار اردو شعبے کے طور پر بحال ہوا ہے۔ یہاں بھی اساتذہ کی تعداد تقریباً نو ہے۔

ماحصل

مجموعی طور پر غیر ملکی جامعات میں اردو کی تدریس اور صورتحال اطمینان بخش ہے۔لیکن تحقیق کی صورت حال چند ممالک میں ہی بہتر ہے۔اس تعارفی مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں::

بیشتر ممالک میں جہاں اردو میں پی ایچ ڈی کرائی جا رہی ہے وہاں کے مقالوں کی زبان ان کی ملک کی ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہے کہ وہاں کے لوگ اردو ادب سے روشناس ہوں گے۔لیکن ان اساتذہ میں اردو بولنے کی استعداد کم رہتی ہے کیونکہ ان کی تحریری

زبان اردو ہے مگر بولنے کی زبان ان کی اپنی ہے۔

- اگر غیر ملکی جامعات کے اساتذہ اور طلبہ وطالبات کی آمد ورفت اور تربیتی پروگرام کو کچھ نظم ہو تو ان ممالک میں اردو کے فروغ کے امکانات بہت روشن ہیں۔
- ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سے روابط بحال کیے جائیں اور ان کی تربیت کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔
- اور جس حد تک ممکن ہو ان کو کتابیں مہیا کرائی جائیں کیونکہ ان کی لائبریوں میں بہت کم کتابیں موجود ہیں خاص نئے لکھنے والوں کی کتابیں تو بالکل ہی نہیں ہیں۔

ان تمام کمی وبیشی کے باوجود اردو کے لیے یہ فال نیک ہے کہ اردو دنیا کی مختلف ممالک میں پڑھائی جارہی ہے۔

***

حوالہ جات

۱۔ سید سلیمان ندوی 'عرب وہند کے تعلقات' پہلا ایڈیشن کراچی 1987

۲۔ اکیسویں صدی میں اردو فروغ اور امکان، خواجہ محمد اکرام الدین، پہلا ایڈیشن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۴، ص ۳۰۲

۳۔ خواجہ محمد اکرام الدین، اکیسویں صدی میں اردو فروغ اور امکان، پہلا ایڈیشن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ص ۳۰۸

۴۔ مصر میں اردو کے پاکستانی استاتذہ کی خدمات: پروفیسر ابرہیم محمد ابراہیم، (یہ مضمون میل کے ذریعے مجھے بھیجا تھا، یہ مسودہ میرے پاس محفوظ ہے)

اردو افسانے میں بنگلا دیش کی جنگ آزادی ۱۹۷۱ء

حسین البنا

Abstract

The Liberation war of 1971 is a very importent event of the emergence of Bangladesh. In the partition of Subcontinent in1947 Bangladesh was the part of Pakistan. Ever since this partition Pakistanis have been exploiting Bangladeshis. They used to make fun of the language and customs of Bangladeshis and they deprived them from their rights. Bangladeshis were oppressed by Pakistanis unjustly. At one stage, Bangladeshis wanted freedom from their oppression& injustice. About thirty lakh people including 7 Bir shresthas were martyred in this war,four crore people became homeless and the honor of three lakh mothers& sisters were robbed. The barbaric attacks of the Pakistani Agrressors in the war of liberation 1971 have been portrayed in different languages of the world. Urdu Short stories are no exception. Especially The Short Stories of Shahjat Manzar, Intizar Hussain, Golam Mohammad, Ahmad Sadi and Shahnaj Parveen have Different Aspects of 1971. the upcoming article will depict the libertion war 1971 in Urdu short stories.

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

بنگلا دیش میں اردو زبان کا آغاز تقریباً سترہویں صدی عیسائی میں ہوا۔خصوصاً ۱۶۰۸ء میں ڈھاکا دارالحکومت بننے کے بعد یہاں گروہ بگروہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے جو لوگ آئے تھے ان کے اکثروں کی زبان اردو تھی۔اس وقت اردو زبان نہ صرف روزمرہ زندگی کی ضروریات پورا کرتی تھی بلکہ اسکولوں، کالجوں اور معاملات میں بھی یہ زبان مقبول و مروج رہی۔مگر صد افسوس کی بات یہ ہے کہ بنگلا دیش ہمیشہ سیاسی اور لسانی تحریک کے چنگل میں پھنسا رہا اور بالآخر ۱۹۷۱ء میں ایک خطرناک جنگ آزادی کے ذریعہ بنگلا دیش پاکستان سے الگ ہوگیا۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد اردو زبان بنگلا دیش میں آہستہ آہستہ مقبول عام ہوئی اور عوام و خواص میں اس کا چرچہ پڑوان چڑھا۔ حتی کہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء میں پاکستان کے بانی محمد علی جناح بنگلا دیش میں تشریف لانے کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ اردو اور صرف اردو ہی پاکستان کی قومی زبان بنے گی۔ اس اعلان سے بنگالی عوام غیر مطمئن ہو گئے اور اپنے آپ کو بے پناہ سمجھنے لگے۔یہاں تک کہ بات ایسی بگڑی کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان سے آئے ہوئے لوگ دو قسموں میں منقسم ہو گئے۔کلکتہ اور اس کے آس پاس سے آئے ہوئے بنگلا بولنے والے اور یوپی و بہار اور اس کے آس پاس سے آئے ہوئے اردو بولنے والے۔یہ لوگ اپنے آپ کو جانی دشمن سمجھنے لگے اور اردو بولنے والے بنگلا بولنے والوں کی رہن وسہن، کھانا پینا اور تہذیب و تمدن وغیرہ سے مذاق اڑانے لگے۔ ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء میں بنگالیوں نے تحریک لسانی کی اور صرف اپنی مادری زبان کی حفاظت کے لیے سلام (عبدالسلام)، برکت (ابوالبرکات)، رفیق و جبار (عبدالجبار) وغیرہ کے ساتھ بہت سارے لوگ شہید ہوئے۔آج پوری دنیا میں یہ دن ایک بین الاقوامی مادری زبان کے طور پر منایا جاتا ہے۔

محمد علی جناح کی وفات (۱۹۴۸ء) کے بعد لیاقت علی خان نے مشرقی پاکستان (بنگلا دیش) سفر کیا۔ اس وقت ڈھاکا یونیورسٹی کے طلباء نے ایک اجتماع قائم کیا اور اس اجتماع میں طلباء نے یہ سپاس نامہ پیش کیا جس میں یہ مطالبہ تھا کہ بنگلا کو بھی اردو کے ساتھ قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ جواب میں پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کہا کہ پاکستان کی قومی زبان کا فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ صرف اردو ہوگی۔ (۱)

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد بنگلا دیش میں مسلم لیگ کی مقبولیت کم ہونے لگی کیونکہ بنگلا بولنے والے لوگ اکثریت ہونے کے باوجود بڑے بڑے ملازمتی عہدے سے محروم رہے جس کی وجہ سے ۲۵ جون ۱۹۴۹ء میں مسلم لیگ اور حکومت کے خلاف عوامی مسلم لیگ قائم ہوئی۔ جس کے صدر مولانا عبد الحمید بھاشانی، سیکرٹری جناب شمس الحق اور جائنٹ سیکرٹری بنگو بندھو شیخ مجیب الرحمن منتخب ہوئے۔ جناب زاہد چودھری اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔:

> ''اب مولانا بھاشانی کی زیر صدارت عوامی مسلم لیگ کی تشکیل اس لحاظ سے بہت تاریخی اہمیت کی حامل تھی کہ اس سے مشرقی پاکستان (بنگلا دیش) کے مسلمانوں کے ایک حلقے کی جانب سے مسلم لیگ کے منظم طریقے سے مخالفت کی ابتدا ہوئی تھی۔'' (۲)

بنگالیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے حقوق سے محروم ہیں اور یہ محرومی صرف اقتصادی پہلو سے نہ تھی بلکہ مختلف جہات سے تھی۔ اس احساس محرومی کا نتیجہ ۸ مارچ ۱۹۵۴ء کو مشرقی پاکستان کے صوبائی انتخاب کے وقت سامنے آیا۔ جب کہ مشرقی پاکستان (بنگلا دیش) کے صوبائی انتخاب میں مسلم لیگ کے خلاف جگتو فرنٹ نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ جگتو فرنٹ نے اپنی انتخابی تحریک کا آغاز لسانی مسئلے پر شہید ہونے والے طلبا کے مزار پر سلامی سے

کیا۔اس سے عوام بہت متاثر ہوئے۔آخر مشرقی پاکستان کے تمام صوبوں میں بنگالی اور غیر بنگالی کی تفریق ابھر کر سامنے آ گئی۔چونکہ حکومت غیر بنگالیوں کے ساتھ تھی اس لیے وہ لوگ اپنے آپ کو ترقی یافتہ اور اعلیٰ سمجھنے لگے۔اور بنگالیوں کو دوسرے درجے کی شہری سمجھنے لگے۔وہ لوگ بنگالیوں پر ظلم وستم کرنے لگے۔آفسوں، اسکولوں، کالجوں اور بازاروں میں بنگالیوں کا مذاق اڑانے لگے اور کہنے لگے کہ بنگال تو کنگال ہیں۔(۳)

۱۹۶۶ء میں بنگو بندھو شیخ مجیب الرحمٰن نے چھ نکات کا اعلان کیا جس میں پاکستان کے مشرقی حصے کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ان نکات میں پاکستان کے مشرقی حصے کے لیے ایک نیم عسکری تنظیم کے ساتھ ساتھ پاکستان کے دو حصوں کے الگ الگ کرنسی کا مطالبہ کیا گیا۔اس کے علاوہ دفاع اور امور خارجہ شعبوں کے علاوہ باقی تمام شعبوں کے اختیارات صوبوں کو سونپنے کا مطالبہ بھی ان نکات میں شامل تھا۔مگر بہاریوں نے اس مطالبے کی شدت سے مخالفت کی۔افسانہ نگار شہزاد منظر کہتے ہیں:

> ''اس مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگالیوں نے انہیں اپنا دشمن سمجھ لیا۔اور بہاریوں نے انہیں حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔بہاری عوام کی اکثریت جاہل اور پس ماندہ تھی۔ان میں سیاسی شعور نام کے لیے بھی نہیں تھا۔''(۴)

اس مطالبے کے چند دن بعد ۱۹۶۷ء میں بنگو بندھو شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف اگرتلہ سازش کیس منظر عام پر آیا۔اس سے بنگالیوں کے دلوں میں بنگو بندھو کی محبت اور زیادہ بڑھ گئی اور وہ بنگالیوں کے ہیرو بن گئے۔۷ دسمبر ۱۹۷۰ء میں ملک کے دو حصوں میں انتخاب ہوا اور بنگو بندھو شیخ مجیب کی پارٹی عوامی لیگ نے ۳۱۳ نشستوں میں سے ۱۶۷ نشستیں حاصل کر کے

پاکستان میں حکومت بنانے کا مینڈیٹ حاصل کرلیا۔عوامی لیگ کا حق جاننے کے باوجود انہیں حکومت کی تشکیل بنانے نہیں دی گئی۔ ۷ مارچ ۱۹۷۱ء میں بنگو بندھو شیخ مجیب نے اپنی ایک تقریر میں مغربی پاکستان سے عدم معاونت کا اعلان کیا اور تمام صوبوں میں احتجاج کے طور پر سیاہ پرچم لہرانے کا فیصلہ کیا گیا، لیکن بہاریوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کردیا۔ ملک کے تمام صوبوں میں سیاہ پرچم لہرایا گیا اگر کہیں نہیں لہرایا گیا وہ بہاریوں کے محلوں میں۔ اس سے بنگالی اور غیر بنگالیوں میں کشیدگی اور بڑھ بڑگئی۔ ان خطرناک صورت حال کو بیان کرتے ہوئے شہزاد منظر لکھتے ہیں:

> ''ان باتوں نے کشیدگی میں اضافہ کردیا اور دونوں جانب طرح طرح کے افواہیں پھیلنے لگے۔ فرقہ وارانہ کشیدگی اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب ۱۵ اگست کو یوم پاکستان کے موقع پر یوم سادھن بنگلا دیش منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس دن سے ملک کے مختلف حصوں پر فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے۔''(۵)

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء میں بہاریوں اور پاکستانی فوجیوں نے ایک ساتھ مل کر بنگالیوں پر حملہ کیے اور بنگالی نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے گئے۔ اس دردناک صورت حال کا بیان کرتے ہوئے شہزاد منظر کہتے ہیں:

> ''رات بھر اللہ اکبر اور جیے بنگلہ نعرے بلند ہورہے تھے۔ صبح ہوتے ہی معلوم ہوا کہ فوج حرکت میں آچکی ہے۔ سارے شہر میں کرفیو نافذ ہو چکا ہے اور فوج نے عوامی لیگ کی تحریک سول نافرمانی اور ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ پاکستان ریجیمنٹ کی بغاوتیں کچل دی ہیں۔

اس اعلان کے ساتھ ہی بہاریوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ انہوں نے بنگالیوں کے گھروں پر حملے شروع کر دیے اور لوٹ مار اور آتشزنی کے بعد انہیں موت کا گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ لوگ یہ بھی کہنے لگے کہ بہاریوں کی مدد سے پنجابی فوجی بنگالی نوجوان لڑکیوں کو اٹھا کر لے جا رہے تھے۔''(۶)

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء بہت سارے بے گناہ لوگ مارے گئے اور ایسے لوگ بھی مارے گئے جو پاکستان کے حامی تھے۔ مسعود مفتی اپنے افسانے ''سپنا'' میں فوجی کاروائی کے اس پہلو کا ذکر کیا ہے:

''پھر ۲۵ مارچ آ گیا۔ رات کو پاکستانی فوج نے ایکشن شروع کیا اور بعد ازاں کئی دن تک پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ اس میں اس کے خاوند بھی پکڑا گیا۔ پھر؟ مفیظ نے دلچسپی سے پوچھا۔ پھر اسے دوسرے مشتبہ لوگوں کے ساتھ گولی ماردی گئی۔ 'مگر تم تو کہتے ہو کہ وہ مسلم لیگی اور پاکستانی تھا' مفیظ نے حیرت سے پوچھا۔ تھا تو۔۔۔ مگر تم جانتے ہو ایسی کئی مثالے موجود ہیں۔ غلطی سے یا غلط فہمی سے یا غلط مخبری سے کئی بے گناہ لوگ مارے گئے تھے جو پاکستان کے حامی تھے۔''(۷)

اس وقت بنگلا دیش کے لوگ ایک عجیب کشمکش کا شکار ہو چکے تھے۔ اگر وہ پاکستان قائم و دائم رکھنے کی بات کرتے تو جئے بنگلا پسند کرنے والے ان کی جان لینے کو تیار تھے اور وہ بنگالی قومیت کی بات کرتے تو فوجیوں کے ہاتھوں میں مارے جانے کا ڈر تھا۔ ایک عام آدمی محض امن و سکون

کی زندگی کا خواہشمند تھا۔ اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ مسعود مفتی کا افسانہ ''نیند'' اس صورت حال کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک نوجوان ہے جو پاکستان کا حامی تھا اس کے گھر کے باہر بنگالی نوجوان 'جئے بنگلا اور شیخ مجیب زندہ باد' کے نعرے لگا کر اس کا سونا حرام کر دیتے ہیں۔ آخر کار وہ بھی جوش میں آ کے نعرہ لگاتا ہے تو اسے نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مسعود مفتی لکھتے ہیں:

> ''ایک رات وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات کے پچھلے حصے میں اچانک دستک ہوئی۔۔۔ اس نے اندر سے زور سے نعرہ لگایا۔'' جئے بنگلا'۔ باہر فوجیوں کی پارٹی میں سب کے آبرو سمٹ گئے۔ پھر دستک۔۔۔۔ 'جئے بنگلا' اب انچارج نے ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور پکارا۔۔ ''دروازہ کھولو'' وہ ادھی نیند میں ڈوبا ہوا کچھ اندازہ نہ کر سکا۔۔۔ نہیں کھولتا۔۔۔۔ جئے بنگلا۔۔۔۔ جئے بنگلا۔ انچارج نے ایک فوجی کو اشارہ کیا۔ اس نے میشن گن سے کھڑکی کا شیشہ توڑا اور بندوق کی نالی اندر کر کے بھرپور فائر کھولا۔ وہ لمحہ بھر چارپائی پر اچھلا۔۔۔ تڑپا۔۔۔ اور پھر دائمی نیند میں سو گیا۔ (۸)

بالآخر ۱۹۷۱ء میں بنگو بندھو شیخ مجیب کی زیر قیادت میں جنگ آزادی ہوئی جہاں تیس لاکھ لوگ شہید ہوئے، تین لاکھ سے زیادہ ماؤں و بہنوں کی عزت لوٹی گئی اور چار کڑور سے زیادہ لوگ بے پناہ بن گئے۔ اور ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء میں ایک آزاد ملک کی حیثیت سے بنگلا دیش دنیا کے نقشہ پر ظاہر پذیر ہوا۔

بنگلا دیش کے ۱۹۷۱ء کی جنگ آزادی کے بارے میں اردو افسانہ میں دو طرح کے واقعات

منظر عام پر آیے۔ ایک تو جنگ آزادی کا پس منظر اور دوسرا جنگ آزادی اور اس کے بعد کے واقعات۔ بنگلا دیش کی جنگ آزادی کے بارے میں جن افسانہ نگاروں نے لکھا ہے ان میں انتظار حسین، ممتاز مفتی، ام عمارہ، غلام محمد، شہزاد منظر، ایوب جوہر، افسر ماہ پوری، احمد سعدی، س م ساجد اور شہناز پروین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض افسانہ نگار اپنے افسانوں میں تقسیم ہند اور قیام پاکستان سے لے کر بنگلا دیش کی جنگ آزادی تک تاریخ قاری کے سامنے اس طرح واضح کرتے ہیں کہ قاری تمام واقعات کی جھلکیاں دیکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ تقسیم ہند کے وقت مسلمانوں نے پاکستان سے بہت کچھ توقعات رکھی تھیں۔ ان کا خیال تھا پاکستان قائم ہونے کے بعد ان کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ ابراہیم جلیس اپنے افسانہ ''الٹی قبر'' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''بس اب ڈھاکہ پہنچنے کی دیر ہے عاشو! پھر ہمیں نئی زندگی ملی گی۔ قائداعظم نے کہا ہے کہ پاکستان صرف غریب مسلمانوں کی خوش حالی کے لیے بنایا گیا ہے۔ اب پاکستان میں کوئی مسلمان غریب اور تنگ دست نہیں ہوگا۔ وہاں ڈھاکہ میں ہمارا ذاتی مکان ہوگا۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ حقیقت کچھ اور ہے''۔(۹)

افسانہ ''مکتی'' میں شہناز پروین ایک کردار مکتی کے ذریعہ ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تصویر کھینچتے ہوئے اور حادثہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ایک ٹرین کہی رکی ہوئی تھی۔ پھر بڑا کشت وخون ہوا تھا۔ خون کی چادریں کی چادریں اور پر سے گذر گئے تھیں۔ انسانی اعضاء بکھرے پڑے تھے۔ لاتعداد لاشیں جلی پڑی تھیں اور دور دور تک تعفن اور بدبو پھیلی ہوئی تھی

انہیں لاشوں کے درمیان کہیں وہ بھی لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔''(۱۰)

اسی طرح غلام الثقلین نے اپنے افسانے 'البدر' میں بنگالی دانشوروں کو چن چن کر مارنے کی تصویر کھینچی ہے۔لنڈا ایک صحافی ہے۔لنڈا کے حوالے سے افسانہ نگار لکھتے ہیں:

''لنڈا ڈھاکہ یونیورسٹی کی کیمسٹری لیب کے پیچھے ایک دو چار نہیں پوری دو تین سو لاشوں کو گن لیا۔لنڈا نے ان لاشوں کی تصویر بھی لے لیں۔ وہ تصویریں مردوں، عورتوں، جوانوں اور بچوں کی۔تصویریں ان بنگالی دانشوروں کی، جنہیں چن چن کے مارا گیا تھا۔(۹)

افسانہ نگار انتظار حسین ان قبیح حالتوں کا بیان قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اپنے افسانے ''شہر افسوس'' میں ڈھاکا کو شہر خرابی کا نام دیا ہے۔جس میں ہر طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔سانس لیتے لوگوں کی موجودگی کے باوجود کہیں زندگی کا ثبوت نہیں ملتا تھا۔وہ نہایت مؤثر انداز میں ڈھاکا کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ:

> ''اسی طرح بھاگتے بھاگتے ایک نرالے نگر میں جا نکلا۔لاشیں دور دور نظر آ رہی تھیں۔ جیتا آدمی آس پاس کہیں نظر نہ آیا۔ میں حیران و پریشان ہو کر ایک کوچے سے دوسرے کوچے میں اور ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں گیا۔بازار بند، راستے سنسان، گلیاں ویران۔کسی کسی مکان کے بالائی دریچے پٹ اتنے کھلتے کہ دو سہی سہی آنکھیں نظر آتے اور جلدی سے پٹ بند ہو جاتے۔عقل حیران تھی کہ کیسا نگر ہے لوگ گھروں میں مقید بیٹھے ہیں۔(۱۱)

جنگ آزادی کے پس منظر بیان کرتے ہوئے شہزاد منظر زبان اور تہذیب کا مسئلہ سامنے لایا اور کہا کہ بہاریوں نے بھی اپنے آپ کو بنگالیوں سے الگ تھلگ رکھا۔انہوں نے بنگالی

تہذیب وثقافت اور بنگلا زبان سے دوری اختیار کیے۔ اپنی الگ بستیوں میں بنگالیوں سے ہٹ کر ایک الگ گروہ کا تاثر دیا۔ اس مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انتظار حسین کہتے ہیں یہی سبب رہا کہ بنگلا دیش بننے کے بعد بنگالیوں کے دلوں میں موجودہ نفرت کا جذبہ انتقام کی صورت میں سامنے آیا۔ انتظار حسین اپنے افسانے ''اندھی گلی'' میں کہتے ہیں:

> ''مسلمان ہونے کے باوجود ہمارے اور ان کے درمیان فاصلہ بہت تھا۔ زبان کا فاصلہ، تہذیب کا فاصلہ، ہم نے اس فاصلہ کو پاٹنے اور انہیں جاننے کی کوشش نہیں کی۔ نہ انہوں نے ہمیں جانا نہ ہم انہیں پہنچانا۔(۱۲)

یعنی یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے زمانے میں ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے لوگوں نے مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلا دیش) میں آ کر یہاں کی تہذیب وثقافت اور زبان اختیار کرنے اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی بجائے اپنے آپ کو ان لوگوں سے الگ تھلگ رکھا اور خود کو ان سے برتر خیال کیا جس کے ردعمل میں بنگالیوں کے دلوں میں ان کے لیے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ غلام محمد نے اپنے افسانے ''اداسی'' میں اس صورت حال کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''نہیں آذر۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ یوپی کے رہنے والے ہیں۔ کہاں بنگالی، بھلا کیسے نبھے گی۔۔؟ کیوں۔۔؟ کلچر پر باتیں کرتے ہوں۔ اتنا نہیں سوچتے کہ یوپی کا کلچر۔ بس رحمٰن صاحب بس۔ یہی احساس برتری آپ لوگوں کو تباہ کر کے چھوڑے گا''(۱۳)

بنگلا دیش کی جنگ آزادی میں زبان کا مسئلہ اہم تھا۔ اردو والے اور بنگالیوں میں نفرت کا آغاز

Journal of

اسی مسئلہ سے ہوا جو رفتہ رفتہ پھیلتا گیا۔ بالآخر ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلا دیش) میں بنگالی اور غیر بنگالیوں کے اس تنازعے کو اختر جمال نے اپنے افسانے ''دوسری ہجرت'' میں اس طرح نمایاں کرتے ہیں:

> ''بات تو ٹھیک نکلی اردو اور بنگلا کی لڑائی اس طرح شروع ہوگئی جیسے کسی زمانے میں اردو اور ہندی کی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ اردو اور ہندی ایک ماں کی دو بیٹیاں تھیں۔ مگر انگریز بہادر نے اپنی حکمت عملی سے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ اور اب ان کے جانشین بنگلا اور اردو کی لڑائی کا تماشہ خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ (۱۴)

حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں معاملہ کچھ سنگین تھا۔ اپریل ۱۹۴۹ء کو انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مولوی عبدالحق نے مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلا دیش) سفر کیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ بنگلا زبان کو اردو رسم الخط میں لکھا جائے۔ مولوی عبدالحق کی اس تجویز نے بہت سے شبہات کو جنم دیا اور بنگلا زبان کو ختم کرنے کی کوشش قرار دیا گیا۔ ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء وزیر تعلیم فضل الرحمٰن صاحب جب ڈھاکا پہنچا تو ڈھاکا یونیورسٹی کے طلبا نے بنگلا رسم الخط تبدیل نہ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبہ کے باوجود بنگلا رسم الخط کو اردو رسم الخط میں تبدیل کرنے کے لیے ۲۰ مراکز کھولنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لوگوں نے اس فیصلے کی مذمت کی اور اسے بنگلا زبان ختم کرنے کی سازش قرار دیا۔ بنگلا رسم الخط کی تبدیلی کے اس فیصلے پر تبصرہ کرتے ہوئے زاہد چودھری اپنی کتاب '' مشرقی پاکستان کی تحریک علحدگی کا آغاز'' میں لکھتے ہیں:

> ''رسم الخط کے مسئلے پر حکومت کا یہ فیصلہ واقعی اشتعال انگیز تھا۔ کیونکہ اس کی بنیاد سراسر فریب و دھوکہ بازی پر تھی اور اس سے مشرقی بنگال

کے عوام الناس میں حروف القرآن کے لیے احترام کے جو جذبات
پائے جاتے تھے ان کو ذریعہ بنا کر بنگلا رسم الخط کو ختم کر کے وہاں اردو
زبان رائج کی کوشش تھی۔(۱۵)

یہ بھی حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بہت سے پہلو میں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلادیش) کو پس ماندہ رکھا گیا۔لسانی، معاشی، ملازمتی عہدوں کے حوالوں سے غیر جانبدرانہ فیصلوں نے بنگالیوں کے اندر احساس محرومی کو جنم دیا۔ اور مغربی پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دی۔ ہر اردو والے بنگالی کے لیے مغربی پاکستان کا ایک ایک نشان تھا اور وہ ان کے انتقام کا نشانہ تھا۔انتظار حسین اپنی کتاب 'قصہ و کہانیاں' میں بنگالیوں کی اس رویے کو مغربی پاکستان کے سلوک کا ردعمل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''پھر اسے غصہ آتا چلا گیا، لوگوں کو انہوں نے کیسی کیسی اذیتیں دے
کر مارا۔ بوڑھوں کو، بچوں کو، عورتوں کو۔۔۔وحشی۔۔۔۔درندے۔
اس نے دانت کچکچائے۔انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔یہی کرنا چاہیے
تھا؟ اسلم غصہ سے بولا۔ہاں ہم پچیس سال تک ان کے ساتھ جو کچھ
کرتے رہے تھے اس کے بعد انہیں یہی کرنا چاہیے تھا۔(۱۶)

اردو اکثر افسانہ نگاروں نے البدر، الشمس، اسلامی چھاترو شنگھو اور جماعت اسلام پارٹی کی حامیوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔مگر ظفر پیامی اپنے افسانے 'فرار'' میں ہمیں تصور کا ایک اور پہلو دیکھایا ہے۔جس کے مطابق شہر میں ہونے والے فسادات کی ذمہ داری یہ لوگ اور بہاری لوگ ہیں: ظفر پیامی لکھتے ہیں:

''شہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی تھیں، شہر میں دھماکے بھی ہو

رہے تھے۔ شاید کسی نے بم پھینک دیا، شاید کسی بارود خانے میں چنگاری بھڑک اٹھی۔ گویا اب بھی بہاریوں کی ستم رانی قائم ہے۔ غالبا شہراب بھی رضا کاروں کی گرفت میں ہے۔ شہر میں جگہ جگہ اب بھی آگ لگی ہوئی ہے۔''[۱۶]

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے ۱۹۷۱ء کی جنگ آزادی کے بارے میں اردو افسانے بہت کم ملی ہے اور جو بھی ملی ہے ان سے حقیقت تک پہنچنا بڑی مشکل کی بات ہے۔ جنگ آزادی کی وجہ سے بنگلا دیش کی بہت ترقی ہوئی۔ آج بنگلا دیش کی کارنسی کی قیمت پاکستان کی کارنسی کی قیمت سے زیادہ ہے۔ آج بھی بنگلا دیش کے عوام پاکستان کے عوام الناس سے دوستانہ تعلق رکھتے ہیں۔ مگر بنگلا دیش کے عوام پاکستانی اور متحدہ پاکستان کے حامی رضا کاروں کے گھناؤنے حرکات کو نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس وجہ سے نقصان جو پہنچا ہے وہ بنگلا دیش کے اردو والوں کو پہنچا ہے۔ بنگلا دیش کی جنگ آزادی کے بعد پاکستانی فوج کے گھناؤنے جرائم کا انتقام ان اردو والوں سے لیا گیا جو بہاری کہلاتے ہیں۔ ان بدنصیبوں کو کوئی ملک اپنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ نہ وہ بنگالی ہے۔ نہ پاکستانی ہے اور نہ ہندوستانی ہے۔ دنیا کی ہر جگہ میں ان کے لیے جیلوں اور اذیت خانوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں رہنے والے بنگالی کی حالت کچھ ایسی ہے کہ وہ پاکستان میں محصور ہیں۔ شاید کسی نے ٹھیک کہا کہ: تقسیم ہند ہی ہمارے لیے بڑی غلطی تھی۔

حوالہ جات

(۱) شہزاد منظر: تیسرا وطن، انجمن پریس، کراچی، ۱۹۹۰، ص ۷۰۔۷۱۔

(۲) ایضا۔

(۳) ایضا۔

(۴) زاہد چودھری: مشرقی پاکستان کی تحریک علحدگی کا آغاز، لاہور، نگارشات، ۲۰۰۵ء ،ص ۲۵۔

(۵) شہزاد منظر: ندیا کہاں ہے تیرا دیش، انجمن پریس، کراچی، ۱۹۹۰، ص ۵۳۔

(۶) شہزاد منظر: ادب میں انتہا پسند رجحانات، لاہور، ماہ نامہ فنون، نومبر، دسمبر ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۔

(۷) مسعود مفتی: ریزے، اسلام آباد، دوست پبلکیشنز، ۱۹۹۶، ص ۱۴۲۔

(۸) ابراہیم جلیس: منتخب ابراہیم، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۵۸

(۹) شہناز پروین: مکتی، ماہ نامہ سیپ، کراچی، شمارہ ۲۴، ص ۱۱۲۔

(۱۰) غلام الثقلین نقوی: اردو کہانی کے پچاس سال، لاہور، ماہ نامہ اوراق، ۱۹۹۷، ص ۲۹۔

(۱۱) انتظار حسین: شہر افسوس، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵، ص ۲۱۲۔

(۱۲) ایضا، ص ۲۰۶۔

(۱۳) غلام محمد: لہو قطرہ قطرہ، نشری دائرہ پاکستان، کراچی، ۲۰۰۱، ص ۶۳۔۶۴۔

(۱۴) اختر جمال: زرد پتوں کا بن، لاہور، التحریر، ۱۹۸۱، ص ۴۲۔

(۱۵) زاہد چودھری: مشرقی پاکستان کی تحریک علحدگی کا آغاز، لاہور، نگارشات، ۲۰۰۵ء ،ص ۲۲۲۔

(۱۶) انتظار حسین: قصہ کہانیاں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۸۱۔

ڈھاکہ میں اردو چرچا: ایک مختصر جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں

Abstract

The practice of Urdu literature in Bangladesh refers to the Dhaka centric practice of Urdu literature since 1770. It is to be noted that an individual School of poetry was already founded in Dhaka, concentrating the practice of Urdu literature during the last quarter of 18th century in the practicing era of poet Mirza Jaan Tapesh, the court poet of Nawab Shams-Uddaullah (1770-1831). Nawab Shams-Uddaullah was a patron of Urdu literature. Besides, in order to satisfy the other Nawabs who came to Bengal at different times to govern, to work for them and to get work from them, the low-income, hard working people here used to learn the language of the Nawabs, namely Urdu.Thus day after day many poets and writers came to Dhaka and gradually a new manner of poetry was originated. The contribution of Khwaja family of Dhaka in Urdu literature of Bangladesh is undisputed. Written by khwaja Ahsan Ullah Shaheen the book "Tariq e Khandan e Kashmiri"

Urdu weekly newspaper, "Ahsan ul Qasas"was released from Dhaka on 15 February 1884. The reputed zamindar of Dhaka, Mir Ashraf Ali's grandson Nawab Syed Muhammad Azad was the writer of Lucknawi weekly newspaper "Awaaz e Pak". "Nawabi Darbar"written by Nawab Syed Mohammad Azad is believed to be the first literary drama of Urdu literature. Ahmad Hussain was a successful poet of Urdu literature who had written Urdu drama "Bimar e Bulbul". Munshi Rahman Ali Tayesh and Hakim Habibur Rahman have left immens contribution by writing socio-economic and cultural history of Dhaka. Moreover, Nawab Mahmood Azad, Khwaja Ahsan Ullah Shaheen, Khwaja Bedar Bhakt, Syed Shardul Hussein were successful poets of Urdu literature in Dhaka. With the contribution of these eminent contributors, a pleasant and enriched ambience was built for the practice of Urdu literature in Dhaka long before the partition of India. The discussion of the reflection of life and culture of Bangladesh in Urdu literature can be divided into three eras:a. British era, b. Pakistani era, c. Bangladeshi era.

اٹھارھویں صدی کی آخری چار دہائیوں میں نواب شمس الدولہ (۱۷۷۰۔۱۸۳۱) کے دربار کے رکن مشہور شاعر مرزا جان طپش کی شعر گوئی کی وجہ سے ڈھاکہ شہر میں ایک بے مثال شعری اسکول قائم ہوگیا۔ اس وقت نواب شمس الدولہ اردو ادب کے سب سے بڑے سرپرست ثابت ہوئے۔ لہذا ڈھاکہ کے نوابوں سے فیضیاب ہونے کے لئے لیے اس وقت ملک کے گوشے گوشے سے بالخصوص اردو ادب کے نام آور ادباء اور شعراء ڈھاکے میں تشریف لائے اور اردو ادب کی خدمات میں اپنے آپ کو نچھاور کیا۔ نتیجہ میں یہاں اردو شاعری کا ایک نیا رخ پیدا

ہونے لگا۔

ایسی حالت میں اردو ادب کی استوار و ترقی کے مقاصد کے خواہشمند خواجہ خاندان بھی اس وقت ترقی یافتہ سوچ بچار کے ساتھ اردو ادب کی تحریر میں اتر آئے۔ 1

واضح رہے کہ برطانیہ حکومت (۱۷۵۷-۱۹۴۷) کے دوران جغرافیائی حالت، مذہب کی اہمیت، رہائش کی سہولت اور سیاسی اور اقتصادی ضروریات کی بناء پر عہد قدیم سے ہی یہاں اہل زبان اردو اور اردو کو پیار کرنے والے لوگوں کی ایک کافی بڑی تعداد موجود تھی۔ لیکن سن ۱۷۷۰ کے بعد دارالحکومت ڈھاکہ میں اردو کے چرچا کو برقرار اور تیز تر کرنے میں تعلیمی اداروں، کئی ثقافتی تنظیموں، خواجہ خاندان، بنگلہ دیش بیتار، کئی رسالوں اور اس سے منسلک اور غیر منسلک ملک گیر پیمانے پر مشہور دانشمندوں نے اہم کردار ادا کیا۔

ڈھاکہ کے تعلیمی اداروں میں اردو کا چرچا

مختلف زبانوں کی آمیزش کا سنگم دارالحکومت ڈھاکہ میں اردو ادب کے چرچا کو شہرہ آفاق تک پہنچانے میں خصوصاً ڈھاکا یونیورسٹی اور اس کے اساتذہ اور عموماً دوسرے تعلیمی اداروں نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔

سن 1921 ڈھاکہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ یہ یونیورسٹی ملک کے سب سے بہترین تعلیم یافتہ، جدید ٹیکنالوجی سے موفور، ایک پیش رو یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کے اولین شعبوں میں "شعبہ اردو اور فارسی" شمار کیا جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی لازوال تاریخ کے خالص شاہد اور بنگلہ دیش میں اردو اور فارسی کے ایک منفرد رہنما کی حیثیت سے اہل درک و دانش کے نزدیک متعارف ہے۔ سن 1921 میں ہی ڈھاکہ یونیورسٹی میں "شعبہ اردو اور فارسی" قائم ہوا تھا۔ قیام شعبہ کے بعد پروفیسر فدا علی خان، معید الاسلام بور او غیرہ کی رہنمائی میں یہ شعبہ

اپنا کام انجام دے رہا تھا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کی عظیم رہنمائی کی وجہ سے سن 1944 سے 1969 تک یہ شعبہ اپنا عروج پر تھا۔

سن 1971 میں قیام بنگلہ دیش کے بعد پاکستانی اساتذہ یونیورسٹی سے چلے گئے۔ اس وقت شعبہ اردو کی حالت تھوڑی نازک تھی۔ لیکن بہت جلد ہی اس حالت میں تبدیلی آئی۔ کچھ عرصے بعد اساتذہ اور طلبہ نے پھر سے متفقہ طور پر اردو کی خدمات انجام دینے لگے۔2

سن 1971 سے بیسویں صدی کے آخر تک شعبہ اردو سے اردو کی خدمات انجام دینے والے استاذوں میں فیض احمد چودھری، محمد رستم علی دیوان، ڈاکٹر محمد عبداللہ، ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر ام سلمی، ڈاکٹر کنیز بتول اور ڈاکٹر زینت آرا شیرازی قابل ذکر ہیں۔

شعبہ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک بنیادی شعبہ ہے۔ 10 مارچ 2007 کو اس نے شعبہ فارسی و اردو سے علیحدگی اختیار کی اور ایک الگ شعبہ کے طور پر اپنا سفر شروع کیا۔ اس صد سالہ سفر میں شعبہ میں متعدد بین الاقوامی شہرت یافتہ ماہرین تعلیم نے کام کیا۔ شعبہ اردو کے معزز استاد خان بہادر فدا علی خان ڈھاکہ یونیورسٹی کے پہلے پراکٹر تھے۔ وہ 1926 میں مختصر مدت کے لئے کئی مرتبہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے قائم مقام خزانچی بھی مقرر ہوئے۔

خان بہادر فدا علی خان ڈھاکہ یونیورسٹی اکیڈمک کونسل کی سفارش اور ایگزیکٹیوٹ کونسل کے فیصلے کے مطابق ۱۹۲۱ سے ۱۹۳۵ تک شعبہ اردو کے سربراہ رہے۔ وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایمریٹس پروفیسر بھی تھے۔3

فی الحال ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں کل 9 اساتذہ اردو زبان اور ادب کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان اساتذہ کے نام پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھوئیاں، ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، ڈاکٹر محمد غلام ربانی، ڈاکٹر محمد اسرافیل، ڈاکٹر رشید احمد، ڈاکٹر رضا الکریم، محمد غلام مولا، حسین البنا اور حفصہ اختر ہیں۔ ان سب اساتذہ کے تحقیقی مقالے ملک اور بیرونی ممالک کے مشہور رسالے، جرنل اور اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں یہ بات بھی قابل ذکر

ہے کہ سن ۲۰۰۸ سے تقریباً ہر سال اس شعبہ سے "ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو" نامی ایک تحقیقی جرنل نکلتا ہے جس میں اردو کے مشہور دانشمندوں کے تحقیقی مقالے شائع کئے جاتے ہیں۔

دارالحکومت ڈھاکہ میں "ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو" ایک مستند اور معتبر رسالہ ہے جس میں بنگلہ دیش کے مشہور اردو داں کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک مثلاً جرمن، پاکستان، بھارت وغیرہ کے نامور ادبا و شعراء اردو کے تحقیقی مقالے شائع کیے جا چکے ہیں۔

سرور غزالی جو جرمن کے ہمبولڈ یونیورسٹی کے شعبہ تدریس ایشیائی اور افریقی زبانیں کے لیکچرار ہیں ان کے ایک مشہور مقالہ بعنوان "جرمنی میں اردو" 2020 میں "ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو" میں شائع ہوا ہے۔ اس مقالے میں موصوف نے جرمن میں اردو زبان کا آغاز آور اس زبان کی نشو ونما اور ترقی میں علامہ اقبال، آمنے میری شمل (Annemarie Schimmel)، کرسٹینا اوسٹر ہولڈ، جناب ہیلمٹ نسپٹل کے خدمات بیان کیا ہے۔4

بھارت کے مختلف صوبوں سے ڈاکٹر شہناز قادری - جموں اور کشمیر، پروفیسر صغیر افراہیم - یوپی، پروفیسر ڈاکٹر محمد کاظم - دہلی، ڈاکٹر وسیم انور - ایم پی، آسیہ یاسمین - حیدرآباد، پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری - میرٹھ، تبسم حسن - حیدرآباد، ڈاکٹر تسلیم عارف - جھارکھنڈ، توصیف احمد ڈار - کشمیر، سارہ بتول - حیدرآباد، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی - بہار، صفدر امام قادری - پٹنہ، ابوالبرکات جیلانی - مغربی بنگال، ڈاکٹر ریحان حسن - امرتسر، ڈاکٹر محمد منصور عالم - آسام، سیدہ مہریہ مرشد القادری - مغربی بنگال جیسی مشہور شخصیتیں اس جرنل میں چھپنے کے لیے اپنے اپنے مقالے بھیج چکی ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد کاظم جو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں انہوں نے اپنے مقالہ "اکیسویں صدی کی پیش کردہ داستانیں" میں عہد قدیم کے داستانوں کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر

کرتے ہوئے دور حاضر کی داستانوں کی خوبیاں بہت اچھی طرح بیان کی ہیں۔ اس میں موصوف نے دور حاضر کی داستانوں کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے۔5

جموں اور کشمیر کے گورنمنٹ مولانا آزاد میموریل کالج کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر شہناز قادری نے اپنے مقالہ "نئی صدی میں اردو ناول: جموں و کشمیر کے حوالے سے "میں عہد حاضر کے ناول کے موضوعات اور اس کی خصوصیات پر زبردست بیان پیش کیا ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ عالم کاری (Globalization)، لامرکزیت (Decentralization) اور علمی دھماکہ (Knowledge Explosion) کی وجہ سے اکیسویں صدی سے ابتک کے بیشتر ناولوں میں حسن، معنویت اور ندرت خیال بہت کم پایا جاتا ہے۔ لہذا ان ناولوں کے مطالعے سے کوئی نئی بات سامنے نہیں آتی۔6

حیدرآباد سے لکھنے والے شخصیتوں میں آسیہ یاسمین، تبسم حسن، سارہ بتول قابل ذکر ہیں۔ آسیہ یاسمین اپنا مقالہ ضلع "اکیسویں صدی کی خواتین ناول نگاروں کے ناولوں کا تنقیدی تجزیہ "میں شہناز فاطمی، ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر، شائستہ فاخری، ثروت خان کے ناولوں پر تبصرہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ سارہ بتول جو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر ہیں انہوں نے "اکیسویں صدی میں اردو ادب کے منتخب خودنوشت: ایک تجزیاتی مطالعہ "پر مقالہ لکھا۔7

مذکورہ بالا ادباء کے علاوہ دوسرے ادباء بھی زندگی و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بہت ہی دلکش انداز میں مختلف معلومات سے مزین مقالے بھیج چکے ہیں جو ذہنی خوراک کے اہم وسائل ثابت ہو چکے ہیں۔

بیرونی ممالک کے مشہور ہستیوں کے علاوہ ہمارے ملک کے عاشقین اردو میں سے مشہور دانشمندوں کے مقالے بھی اس جنرل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مشہور ہستیوں میں سے ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر ام سلمی، ڈاکٹر کنیز بتول، ڈاکٹر زینت آرا شیرازی، پروفیسر ڈاکٹر

جعفر احمد بھوئیاں، ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، ڈاکٹر محمد غلام ربانی، ڈاکٹر محمد اسرافیل، ڈاکٹر رشید احمد، ڈاکٹر رضا الکریم، محمد غلام مولا، جناب حسین البنا حفصہ اختر، ڈاکٹر محمد شہید الاسلام، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، ڈاکٹر لطیف احمد، ڈاکٹر محمد نصیر الدین قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض کے بارے میں بعد میں بیانات پیش کیا جائینگے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے علاوہ دارالحکومت ڈھاکے میں دو قسم کے مدارس موجود ہیں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ایک ہے قومی مدارس جو جامعہ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند (1866) کے نظام ونصاب کے مطابق چلتے ہیں۔ اور دوسری ہے سرکاری مدارس جو عالیہ مدارس کے نام سے بھی معروف ہیں۔ یہ مدارس مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے نظام ونصاب کے مطابق چلتے ہیں۔

بین بیئس (BANBEIS) کے ایک رپورٹ کے مطابق فی الحال بنگلہ دیش میں 13902 قومی مدارس ہیں۔ جن میں سے 4599 قومی مدارس دار الحکومت ڈھاکہ میں ہیں۔ 8 ان مدرسوں میں ابتدائی سے لے کر ہائر سیکنڈری تک تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیمی انتظام کے لئے بنگلہ دیش میں قومی مدارس کے چھ تعلیمی بورڈز ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یعنی "دورہ حدیث" کی نصاب تعلیم اور طریقہ امتحان معین کرنا، پرچہ جانچنا، سند عطا کرنا، وغیرہ کے لئے حکومت کی طرف سے "الھیئۃ العلیا للجامعۃ القومیۃ بنگلہ دیش" قائم کیا گیا جس کے ماتحت قومی مدارس کی اعلیٰ تعلیم یعنی ایم اے کی ڈگری فراہم کی جاتی ہے۔

بنگلہ دیش میں سرکاری عالیہ مدرسہ 1947 کے بعد سے شروع ہوا ہے۔ فی الحال اس میں دو جماعتوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ایک جماعت داخل ہے۔ جس میں 100 نمبر کے لئے اختیاری کی حیثیت سے اردو پڑھائی جاتی ہے۔ جس کے لئے مقدرہ کتاب "گوھر اردو" ہے۔ دوسری جماعت عالم ہے۔ جس میں اردو اختیاری کی حیثیت سے پہلا پرچہ 100 نمبر کے لیے پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے لیے مقدرہ کتاب "نوروز اردو" ہے۔ جس کا مصنف محمد آصف الحق ہیں۔ اس کورس کے تحت سرسید احمد خان، مولانا الطاف حسین

حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد حسین آزاد، علامہ اقبال، مرزا اسد اللہ خان غالب اور عبدالحق کے مختصر حالات زندگی اور ادبی کارنامے کے بارے میں پڑھائی جاتی ہے۔ بنگلہ سے اردو میں اور اردو سے بنگلہ میں تشریح کی جاتی ہے۔ اردو اختیاری (اضافی) کا دوسرا پرچہ کا نمبر 100 ہے۔ جس کی مقدر کتاب "مفید الطلاب" ہے۔

ڈھاکہ کے ثقافتی تنظیموں میں اردو کا چرچا

ڈھاکہ میں اردو ادب کے چرچا کو زندہ رکھنے میں تعلیمی اداروں کے قدم بہ قدم یہاں کی لسانی اور ثقافتی تنظیموں نے بھی بہت موثر اقدامات اٹھائے تھے۔ 1947 سے 1971 تک مشرقی پاکستان میں ایسے بہت ساری انجمن تھیں جو صرف اور صرف اردو زبان کے چرچا اور اس کے رواج وفروغ کے لیے کام کر رہی تھیں۔ لیکن سن 1971 کے بعد جب مشرقی پاکستان نہیں رہا اور آزاد بنگلہ دیش کا نام دنیا کے نقشے میں ابھرا تو اس وقت سے ان تنظیموں کی سرگرمیاں روز بروز کم ہوتی گئیں۔ مثال کے طور پر سن 1947 کے بعد کی ایسی ہی کچھ تنظیمیں اور ان کے عمل کے بارے میں کچھ معلومات ذیل میں آپ کے سامنے ہیں۔

انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان

یہ انجمن 1947 کے بعد کام کرنا شروع کیا۔ اس کا پہلا نام تھا "انجمن ترقی اردو مشرقی بنگال اور آسام"۔ بعد میں اس کا نام "انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان" میں بدل کیا گیا۔ اس انجمن نے 24 سال کے عرصے میں کئی بڑے مشاعرے کا انتظام کیا تھا۔ جس میں فیض احمد فیض، قتیل شفائی اور جوش ملیح آبادی جیسے بڑے بڑے شعراء نے شرکت کی تھی۔ انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان نے ڈھاکہ میں اپنی نجی عمارت بھی تعمیر کی تھی۔ اس انجمن کے ساتھ بہت سے مشہور اردو داں وابستہ تھے۔ جن میں احسن احمد اشک، پروفیسر اقبال عظیم، آصف بنارسی، ڈاکٹر حنیف فوق وغیرہ شامل تھے۔

حلقہ ارباب ذوق

یہ ادارہ دراصل سنہ 1939 میں لاہور میں قائم ہوا تھا۔ سن 1947 کے بعد اس کی ایک شاخ ڈھاکہ میں قائم ہوئی جس کے نگراں پروفیسر عندلیب شادانی تھے۔ ہر مہینے میں اس کے تنقیدی اجلاس ڈاکٹر عندلیب شادانی کے گھر پر منعقد ہوتا تھا۔ اس انجمن کے تنقیدی اجلاس میں سلیم اللہ فہمی، نوشاد نوری، محبوب خزاں وغیرہ شریک ہوتے تھے۔

انجمن ادب

یہ انجمن 1960 میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے صدر سرور بارہ بنکوی تھے۔ اس انجمن کے زیر نگرانی منعقدہ تنقیدی نشست میں بانو اختر شہود، احمد الیاس، زین العابدین، حسن سعید، معین صدیقی، جمال نقوی شریک ہوتے تھے۔ اس انجمن کے اکثر اراکین طالباء تھے جن کے سوچ بچار میں ترقی پسند نظریات دوڑتے تھے۔ سن 1964 میں اس انجمن کو لینن امن انعام سے نوازا گیا تھا۔ لیکن یہ انجمن کئی برسوں کے بعد بند ہوگئی تھی۔ سنہ 1975 میں نوشاد نوری کے گھر پر انجمن ادب کی سرگرمیوں کو دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس وقت اس انجمن نے جنوری 1978 میں رسالہ انجمن شائع کیا تھا جو اس انجمن کے سب سے بڑا کارنامہ ثابت ہوا۔ جس میں ہم عصر اردو اور بنگلہ کے شاعروں کی تخلیقات شامل ہیں۔

بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن

اس انجمن کی بنیاد سن 2007 میں ڈالی گئی۔ بنگلہ ادب کے مشہور شاعر اسد چودھری کی سربراہی میں شمیم زمانوی، جلال عظیم آبادی، اشرف الحق بابو، صابر علی صابر، عنایت اللہ صدیقی، محمد حسن، خالد حسین وغیرہ نے اس انجمن کو قائم کیا۔ اس انجمن نے کئی کتابیں اور

کتابچے شائع کیے۔ انجمن کی طرف سے نوشادنوری، ڈاکٹر سعید یوسف حسن، نعیم بازید پوری پر کتابچے شائع کئے گئے۔

مذکورہ بالا تنظیموں کے علاوہ دارالحکومت ڈھاکہ میں 1947 کے بعد بہت ساری ایسی تنظیمیں موجود تھیں جہاں اہل زبان اردو اور عاشقین اردو متفقہ طور پر اردو ادب کی خدمات میں کام کرتے تھے۔ ان تنظیموں میں بزم احباب (1948)، انجمن تلامیذ الرحمٰن (1948)، حلقہ دانش، بزم آصفی، بزم اکبری، بزم شاعری (1950)، بزم فنون، انجمن ترقی پسند مصنفین، حلقہ فکر و دانش (1960)، بزم محبوب، حلقہ ادب، حلقہ لوح وقلم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔9

ڈھاکہ کے خواجہ خاندان کا اردو چرچا

دارالحکومت ڈھاکہ میں اردو ادب کی خدمات کو انجام دینے والوں میں ڈھاکہ کے خواجہ خاندان کا کردار قابل تعریف ہے۔ صرف اس ایک خاندان نے اردو ادب کی خدمات میں اتنا زیادہ کام انجام دیا جو کسی ادارہ کے لیے بھی ناممکن تھا۔

مقاصد آفرینی کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے تاکہ ادب اور زندگی کے امکانات اجاگر ہوں۔ اردو ادب کی استواروترقی کے مقاصد کا خواہشمند خواجہ خاندان اسی ترقی یافتہ سوچ بچار کے ساتھ اردو ادب کی تحریر میں اتر آیا۔

اس سلسلے میں خواجہ احسن اللہ شاہین کی معروف تصنیف "تواریخ خاندان کاشمیریان" تاریخ اور ادب کے لحاظ سے ایک بہترین تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ نواب احسن اللہ کی ہدایت اور سرپرستی میں 10 فروری 1884 میں دارالحکومت ڈھاکے سے "احسن القصص" نامی ایک ہفتہ وار اردو اخبار نکلا تھا جبکہ ڈھاکے کے مشہور زمیندار میر اشرف علی کے پوتا سید محمد

آزاد لکھنوی نے "اودھ پنچ" نامی ایک ہفتہوار اخبار جاری کیا تھا۔ علاوہ ازیں نواب محمد آزاد کی کتاب "نوابی دربار" کو اردو زبان کے پہلا ڈراما خیال کیا جاتا ہے۔ احمد حسین وفیر زبان اردو کے ایک کامیاب شاعر تھے۔ انہوں نے "بیمار بلبل" نامی ایک ڈراما مرتب کیا تھا۔ منشی رحمٰن علی اور حکیم حبیب الرحمٰن نے اردو زبان میں بنگلہ دیش کی سماجی اور ثقافتی تاریخ پر زبردست کام کر کے اپنے آپ کو باعث فخر ثابت کیا۔

علاوہ ازیں نواب محمد آزاد (1842-1907)، خواجہ احسن اللہ شاہین (1840-1901)، خواجہ بیدار بخت بیدار (سن انتقال 1942)، کامیابی کے ساتھ زبان اردو میں شعر گوئی کی۔

بنگلہ دیش بیتار میں اردو کا چرچا

16 دسمبر 1939 میں نجیم الدین روڈ کے ایک رہائش گاہ پر آل انڈیا ریڈیو کے نام سے بنگلہ دیش بیتار کا کام شروع ہوا۔ اس کے بعد سن 1960 میں اس کو شاہ باگ میں اور 30 جولائی 1983 میں اس کو شیرے بنگلہ نگر، آگرگاؤں کے قومی بیتار بھابن میں منتقل کیا گیا۔ 1 جنوری 1972 میں اس کا بیرونی سروس کا آغاز ہوا۔ بیرونی نشریات کے ماتحت کل 7 زبانوں میں پروگرام نشر کیا جاتا تھا۔ جن میں سے ایک زبان کا نام تھا اردو۔ روزانہ رات کے ٹھیک آٹھ بجے 90FM میگا ہارج (Mega Harz) پر یہ پروگرام نشر کیا جاتا تھا۔ جس میں خبروں کے علاوہ اس پر تبصرہ، اقتصادی پرچہ، کھیل کود کا پرچہ، کسی خوبصورت جگہ یا شخصیت پر خصوصی مقالہ، بین الاقوامی خبریں وغیرہ نشر کیا جاتا تھا۔ فی الحال یہ پروگرام بند ہو گیا۔10

دارالحکومت ڈھاکہ میں تعلیمی اداروں، ثقافتی تنظیموں، خواجہ خاندان اور بنگلہ دیش بیتار کے ساتھ منسلک اردو داں دانشمندوں کے علاوہ بہت سارے ادباء و شعراء ایسے بھی تھے جو نجی طور پر اردو ادب کے لیے کام کر رہے تھے۔ ذیل میں ان سب ادباء اور شعراء میں سے چند اہم شخصیات کے نام، پہچان اور ادبی خدمات پر ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

سلیم اللہ فہمی

سلیم اللہ فہمی بیک وقت ایک مشہور نثر نگار، شاعر، مترجم، مضمون نگار اور نقاد تھے۔ وہ اردو و فارسی کے علاوہ بنگلا، انگریزی اور عربی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے چاروں زبانوں میں شاعری کی ہے۔

ان کا اصل نام ابو المکارم سلیم اللہ اور فہمی ان کا تخلص ہے۔ یہ مشہور شخص 14 اکتوبر 1905 میں ڈھاکہ کے مٹیا برج پیدا ہوئے۔

ان کا آبائی وطن ردولی شریف ضلع بارہ بنکی تھا۔ نواب واجد علی شاہ والئی اودھ کے ہمراہ آنے والے قافلے کے ساتھ بنگال آ؟ اور مٹیا برج میں سکونت اختیار کی۔

انہوں نے اپنے والد ماجد فہیم اللہ کے پاس عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد باقی تعلیم کلکتہ میں مکمل کی۔ انہوں نے پریسڈنسی کالج سے فارسی میں 1925 میں بی اے آنرز اور 1928 میں ایم اے پاس کیا۔ قیام پاکستان کے بعد سابقہ مشرقی پاکستان میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ انہیں حکومت پاکستان کے بنگال سول سروس کے پہلے " جائنٹ سکریٹری" بننے کا اعزاز ملا۔ جائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے ہی انہوں نے سرکاری ملازمت سے رخصت لے لی۔ وہ فطری شاعر تھے۔ ان کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ لیکن سنہ 1929 سے انہوں نے باقاعدہ شعر گوئی شروع کی۔

اس بارے میں ڈاکٹر محمد اسرافیل اپنا مقالہ "سلیم اللہ فہمی: حیات اور کارنامے" میں کہتے ہیں

> "وہ فطری شاعر تھے۔ شاعری ان کا نشہ تھا۔ فہمی کو شعر و شاعری کا شوق صغر سنی ہی سے تھا۔ لیکن انہوں نے باقاعدہ شعر گوئی اور شعر خوانی ۱۹۲۹ء سے شروع کی۔ فہمی نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کا خصوصی رجحان غزل کی طرف ہے۔ اس میدان میں

انہوں نے اپنے لئے ایک خاص جگہ بنالی ہے۔11

نثر نگاری میں بھی ان کی باکمال مہارت تھی۔ان کی عبارت پاکیزہ اور عام فہم ہے۔سلیم اللہ فہمی ملک گیر پیمانے پر مشہور ایک معروف مصنف تھے۔انھوں نے نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔وہ کافی مطالعہ کے بعد لکھتے تھے۔ان کی ادبی خدمات حسب ذیل ہیں۔

کتابیں

.1 مشرق: یہ کتاب 1952 میں ڈھاکا سے شائع ہوئی۔اس میں تیرہ مضامین موجود ہیں۔136 صفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں سابقہ مشرقی پاکستان سے متعلق مختلف پہلوؤں کے معلومات موجود ہیں۔اس میں نہایت عام فہم زبان استعمال ہوا ہے۔

.2 ذوق سلیم: یہ شعری مجموعہ 1990 میں شائع ہوا۔اس میں ایک حمد، ایک نعت، 34 غزلیں، 25 نظمیں اور چند قطعات موجود ہیں۔

.3 عمر خیام: یہ تحقیقی کارنامہ سن 1961 میں کراچی سے شائع ہوا۔اس میں عمر خیام کی حیات اوران کے ادبی کارنامے خاص کر رباعیات کے بارے میں تفصیلات ہیں۔

تحقیقی مقالات

1. مشرقی پاکستان کا تمدن
2. سماجی ماحول
3. پرانا قلعہ (ڈھاکہ)
4. مشرقی پاکستان میں اردو شاعری کے تیرہ سال
5. نذرالاسلام اور اردو داں طبقہ
6. دیہاتی زندگی
7. فارسی کا اثر بنگلہ پر وغیرہ

احسن احمد اشک

بیسویں صدی کے جن شاعروں، صحافیوں، اور قلم کاروں نے اپنے تخلیقات اور انسان پرستی کے ذریعے اہم کردار ادا کیا ہے احسن احمد اشک (1918-1993) ان میں پیش پیش رہے۔

اصل نام احسن احمد قلمی نام اشک ہے۔ اشک کی سن پیدائش کے بارے میں اختلاف رائے پائی جاتی ہے۔ لیکن اشک صاحب نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ فاری و اردو کی پروفیسر کنیز بتول کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ انکی پیدائش یکم جنوری، 1917ء کی ہے۔ اشک کے والد کا نام خان بہادر مولوی عبدالمقتدر تھا۔ اشک کے بیان کے مطابق انکے جد ماجد نواب شائستہ خان کے دور میں کہیں سے آکر چاٹگام کے بانس کھالی علاقے میں قیام پذیر ہوئے۔ اشک کے والد اوڑسیا، پٹنہ اور کٹک کے کالجوں میں فارسی کے پروفیسر تھے۔

1928ء میں اشک کے والد نے انہیں نو سال کی عمر میں کلکتہ عالیہ مدرسہ میں داخلہ کرادیا۔ یہاں سے انہوں نے میٹرک پاس کیا۔ 1938ء میں اشک نے کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ 1940ء میں اسی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور اول آنے کی بناء پر سونے کے طمغے سے نواز سے گئے۔ 1941ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے Modem Indian Language (پالی، ہندی، اردو، بنگلہ) کے شعبے سے اردو میں ایم اے، کیا اور اول آیا۔

1941 میں کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اشک اپنی معاشی زندگی کے آغاز میں برطانوی اور سینر سنسر سروس (ملیٹری) میں شامل ہو گئے۔ 1944ء میں کلکتہ کے مشہور پریسی ڈنسی کالج میں اردو کے لکچرار کی حیثیت سے اشک کا تقرر ہوا۔ 1947ء میں تقسیم ہندوستان کے بعد سابق مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلا دیش) چلے آ؟۔ پھر 1955 تک ڈھاکہ کالج، راج شاہی کالج اور سلہٹ کے ایم ہی کالج میں اردو و

فارسی کی تعلیم دینے کے فرائض انجام دیتے رہے۔ 1964ء سے 1984ء تک احسن احمد اشک صحافت سے وابستہ رہے۔ اس عظیم انسان کا انتقال ۱۷ دسمبر ۱۹۹۱ء کو ہوا۔ ان کی ادبی خدمات حسب ذیل ہیں۔

برق وباراں: یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو سن 1950 میں کلکتہ سے شائع ہوا۔

جاگتے جزیرے: یہ ان کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو 1962 میں شائع ہوا۔

آہنگ انقلاب: یہ ان کی تیسری کتاب ہے۔ یہ کتاب بنگلہ۔ اردو میں ترجمہ شدہ ہے۔ اس کتاب میں بنگال کے انقلابی شاعروں کے کلام کی اردو تراجم موجود ہیں۔ یہ کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ 12

ڈاکٹر عندلیب شادانی

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا اصل نام وجاہت حسین صدیق اور تخلص عندلیب۔ والد کا نام اشتیاق حسین صدیقی اور والدہ کا نام زینب بی بی تھا۔ ان کی پیدائش 1897ء میں ضلع مرادآباد میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ رامپور میں ہوئی۔ انہوں نے عربی اور فارسی کے تمام امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کئے۔ اس کے بعد وہ رامپور سے لاہور پہنچے۔ یہاں انہوں نے 1935ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے فارسی میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ لاہور میں ڈاکٹر محمد اقبال، سر عبدالقادر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، پروفیسر عابد اعلی عابد جیسے مشہور ادباء وشعرا سے ملاقات کا شرف حاصل رہا۔

1926ء میں ہندو کالج دہلی میں اردو فارسی کے لکچرار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ پھر 1928ء میں یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں لکچرار کی حیثیت سے وہ مقرر ہوئے۔ 1934ء میں انہوں نے لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی 1945 تا جون 1969 تک شعبہ اردو و فارسی ڈھاکہ یونورسٹی کے صدر

ہے۔انہیں دو بار آرٹ فیکلٹی کے ڈین بننے کا شرف بھی حاصل رہا۔ اس مشہور شخص نے 29 جولائی 1969 کو ڈھاکے میں انتقال کیا۔

ڈاکٹر عندلیب شادانی ایک مشہور شاعر تھا۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔انہوں نے عاشق محبوب کے دلی جذبات و کیفیات کی ترجمانی میں حقیقت سے کام لیا ہے۔ وہ علم عروض و بلاغت میں ماہر تھے۔انہوں نے حسن و عشق کے واردات اور معاملہ بندی کے بیان میں ابتذال سے اپنے دامن کو پاک رکھنے کی سعی کی۔ان کے ایک شعر پیش خدمت ہے:

وہ دور تھے نظر سے اور چاندی کھلی تھی
آنکھوں سے رات پیہم ٹوٹا گئے ستارے

ڈاکٹر شادانی ایک ماہر نقاد بھی تھے۔ شادانی کی تنقیدی کتاب ''تحقیق کی روشنی میں" اردو اب کے تنقیدی ذخیرے میں قابل قدر اضافہ ہے۔ان کی کتاب میں موجود مضامین اردو ادب کے تحقیقی و تنقیدی میدان میں ان تقاضوں کو پورا کرتے ہیں جن کی انہیں ضرورت تھی۔ شانی صاحب بیک وقت ایک معروف افسانہ نگار بھی تھے۔ وہ پریم پجاری کے نام سے افسانہ لکھتے تھے جو مختلف جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ بعد میں ان کی کہانیوں کا مجموعہ "چھوٹا خدا" اور "نوش و نیش" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

نوشاد نوری

نوشاد نوری کا شمار برصغیر کے بنگلا دیش، ہند، پاکستان اور کے ممتاز شاعروں، صحافیوں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ 21 اکتوبر 1926ء میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے دربھنگہ میں وہ پیدا ہو؟۔ان کا اصل نام محمد مصطفےٰ معصوم ہاشمی اور قلمی نام نوشاد نوری تھا۔ان کے والد اس زمانے کے ایک محترم وکیل تھے۔

نوشا نوری 1945ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد بہار کے پٹنہ بی این کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اسی دوران ان کے دل و دماغ میں انسانیت اور وطن پرستی کا احساس طاری ہو گیا۔ وہ کمونسٹ خیالات سے عقیدت رکھے تھے۔ زندگی کے آخری دم تک وہ اسی عقیدت و خیالات پر قائم تھے۔ 1952 میں وہ ڈھاکہ چلے آئے۔ 1952 میں ہی انہوں نے مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش میں ملازمت شروع کی۔

1952ء سے 1962ء تک انہوں نے پاکستان میں آڈیٹ اینڈ اکانوٹس' میں کام کیا۔ یہاں افسر کے عہد پر ڈھاکہ، کراچی اور کوئٹہ میں نوکری کی۔ ملازمت کے دوران پاکستان کے وزیر خواجہ شہاب الدین نے جب ریڈیو پاکستان پر بندر ناتھ ٹیگور کی موسیقی اور سنگیت کو نشر کرنا ممنوع قرار دیا تو اسی وقت سرکاری ملازم ہونے کے باوجود وزیر کے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ اس کے بعد 1958ء میں جاری ہوا پاکستان کے فیلڈ مارشل ایوب کے مارشل لا کے خلاف تحریک کرنے والے بنگالیوں کے ساتھ شرکت کی اور ساتھ ساتھ نوکری بھی چھوڑ دی۔

1969ء میں "جریدہ" کے نام سے ایک اور ہفتہ وار رسالہ شائع ہوا۔ ''وہ اس رسالے میں مدیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں ہیں۔ نوشاد نوری اپنی زندگی کے آخری دم تک شعرو شاعری میں مصروف تھے۔ نوشاد نوری کا جولائی 2000ء میں انتقال فرمائے۔ ڈھاکہ کے محمد پور میں انکو دفن کیا گیا ہے۔ 13

1۔ راہ و رسم آشنائی: اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 15 جنوری 2000 کو بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن نے شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن جنوری 2015 میں شائع ہوا۔ کتاب کے آغاز میں شاعر نوشاد نوری کے بارے میں پروفیسر اعجاز افضل، ظہیر انور، احمد الیاس، علیم اللہ صدیقی، شمیم زمانوی کے مقالے پیش کئے گئے۔ اس کے بعد نوشاد نوری کے کل 48 اشعار پیش کیے جا چکے

ہیں۔ان میں قابل ذکر ہیں حمد باری تعالیٰ، نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، دیباچہ، راہ و رسم آشنایی، آخری سنس کا پہلا نغمہ، کھلی فضا میں، روشنی، تقدیر کا ستارہ، شناسائی وغیرہ۔

126 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں شاعر نوشاد نوری نے اپنے افکار و خیالات کو پیش کیا ہے۔

.2روزن دیوار: اس کتاب کا پہلا ایڈیشن بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن نے جولائی 2002 میں شائع کیا تھا۔اس کے بعد دوسرا ایڈیشن اکتوبر 2018 میں جاری کیا گیا ہے. 132 صفحات پر مشتمل اس کتاب کا آغاز میں شاعر شمیم زمانوی، کمال لوہانی، اسد چودھری، احمد الیاس، شہاب الدین احمد، زین العابدین اور علیم اللہ صدیقی کے مضامین پیش خدمت ہیں۔بعد ازاں نوشاد نوری کی 44 مشہور نظمیں پیش کی گئیں ہیں جن میں خواب، تنہائی، الف لیلیٰ، دشت میں بہار، نیا احد نامہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ

ڈاکٹر محمد عبداللہ کی پیدائش 1 اپریل 1932 کو لکھی پور ضلع کے بنگا خان گاوں میں ہوئی۔انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے 1951 میں بی اے آنرز اور 1952 میں ایم اے مکمل کیا۔تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سنہ 1955 میں وہ سلہٹ مدرسہ عالیہ کے استاد مقرر ہوئے۔بعد ازاں قیام بنگلہ دیش کے بعد 1972 میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔انہوں نے سن 1979 میں ایم فل اور سن 1983 میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ان کی پی ایچ ڈی کا موضوع تھا " بنگلا دیش میں فارسی ادب "۔پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ ایک جلیل القدر محقق، مشہور مضمون نگار، معروف مترجم اور کامیاب ادیب تھے۔بنگلہ دیش کے اردو ادب کے آسمان پر وہ ایک روشن

ستارہ تھے۔انہوں نے اپنی مختصر زندگی میں 30 سے بھی زائد کتابیں اور سو سے بھی زائد مقالے لکھے ہیں۔سب سے پہلے انہوں نے 4 اپریل 1956 میں "مشرقی پاکستان میں اردو کا نیا روپ" تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ ان کے چند اہم کارنامے یہ ہیں:

1. نواب سلیم اللہ کی زندگی اور کارنامے
2. اقبال کی شاعری میں اسلامی خیالات
3. نذرل کی شاعری میں اسلامی خیالات
4. جدید تعلیم کی اشاعت میں بنگال کے چند مسلمان رہنما
5. مغربی بنگال میں فارسی ادب
6. بنگلہ دیش میں خلافت اور ترک موالات
7. نواب علی چودھری کی زندگی اور کارنامے
8. نذرالاسلام
9. ڈھاکہ کے چند ارباب فکر و دانش
10. مسلمانوں کی بیداری میں چند ادیبوں اور شاعروں کے حصے
11. حکیم حبیب الرحمٰن
12. سرسید احمد کے مذہبی اور سماجی افکار
13. پچھم بنگلا میں فارسی ادب

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی ولادت 11 فروری 1947 کو ممبئی میں ہوئی۔ان کے والد صاحب کا نام راجہ میاں اور والدہ صاحبہ کا نام شاہدہ خاتون ہے۔انھوں نے سن 1968 میں ممبئی یونیورسٹی ہند سے بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد 1968 میں اپنے شوہر

کے ساتھ ڈھاکہ آ گئیں۔ بعدازاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی میں داخلہ لیا اور سن 1971 میں ایم اے (اردو) کے امتحان کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ سن 1972 میں اسی شعبے سے ایم اے (فارسی) کا امتحان بھی پاس کیا۔ 1973 میں اردو لیکچرار کی حیثیت سے اسی شعبے میں ان کا تقرر ہوا۔ فی الحال محترمہ شعبہ فارسی میں پروفیسر کے حیثیت کام کر رہی ہیں۔ انھوں نے سنہ 1988 میں "ڈاکٹر عندلیب شادانی: حیات اور کارنامے" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر ممبئی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

موصوفہ کی ادبی خدمات کی فہرست کافی لمبی ہے۔ ان کی شائع شدہ کتابوں کی تعداد 16 ہے۔ ان کے تقریباً 63 ادبی اور تحقیقی مقالے اندرونی اور بیرونی ممالک کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ذیل میں ان کی ادبی خدمات کی ایک مختصر فہرست پیش خدمت ہے۔

کتابیں

1. ثلاثہ غسالہ: یہ کتاب سن 1989 کو شائع ہوئی۔ یہ کتاب دراصل بنگال کی اردو، فارسی اور عربی تصانیف کی ایک فہرست ہے۔ اس کتاب کے متعلق ایک تحقیقی مقالہ سن 1985 میں پاکستان کے مشہور جرنل 'دانش" میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے ایک نسخہ ابھی بھی ڈھاکا یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

2. ڈاکٹر عندلیب شادانی کی حیات اور کارنامے: یہ کتاب سنہ 1992 میں ڈھاکہ سے شائع ہوئی۔ یہ دراصل ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی پی ایچ ڈی ڈگری کا تحقیقی مقالہ ہے جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔

3. آسان اردو: یہ کتاب سن 1988 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو بنگلہ دیش نیشنل کاریکولام اور ٹیکسٹ بوک بورڈ ڈھاکہ نے نصاب نہم اور دہم کلاس کے لیے مقرر کیا۔ اس کتاب میں اردو ادب کے مشہور ادباء اور شعراء مثلاً منشی پریم چند، علامہ اقبال، میر انیس، میر

تقی میر، اسداللہ خان غالب وغیرہ کے ادبی کارنامے پیش کیے گیے ہیں۔

4. بنگلہ دیش میں اردو ادب: یہ کتاب سن 2015 میں بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کتاب میں اردو ادب سے متعلق گیارہ مقالے شامل کیے گیے ہیں۔

ڈایات امیر خسرو

5. ڈاکٹر عندلیب شادانی کی نصابی اور ترجمہ شدہ کتابیں

6. تاریخ شعبہ فارسی اور اردو ڈھاکہ یونیورسٹی

7. مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) میں اردو ادب کا ارتقا اور بتدریج ترقی (1801 تا 1947)

8. ڈاکٹر عندلیب شادانی: ہندوستان کے مسلم مورخ

9. غالب کی شاعری کا ایک رخ غم دوا۔

تحقیقی مقالے

1. بیسویں صدی میں بنگلہ دیش میں اردو صحافت

2. بنگلہ ادب میں سرسید احمد خان

3. بنگلہ دیش میں سرسید احمد خان کے معاصر رہنما

4. مثنو میں اردو ادب (بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک)

11. بنگلہ دیش میں اردو کا مختصر جائزہ (1971 تا 2014)

12. مشرقی بنگال کے چند اہم اردو جرائد (1906 تا 1954)

13. ہندوستان کے مسلم مورخین

14. ڈاکٹر حنیف فوق قریشی: بنگلہ دیش کے ایک مایہ ناز اردو نقاد

15. تاریخ خاندان کشمیر

ڈاکٹر ام سلمی

ڈاکٹر ام سلمی کی ولادت 2 جون 1947 کو برھمن باریا میں ہوئی۔ ان کے والد شمس الدین صاحب وزارت دفاع پاکستان میں انجینئر تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و پرورش اسلام آباد میں ہوئی۔ انہوں نے سن 1962 اور 1964 میں روالپنڈی سے بالترتیب سکنڈری سکول اور انٹر میڈیٹ سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ انہوں نے 1966 میں Rawalpindi Government College Women سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے 1968 اور 1970 میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور بی ایڈ کی ڈگری لی۔ اس کے بعد ڈھاکہ چلے آئیں اور سن 1976 میں ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور سن 1988 میں اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا "بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی ماخذ (انیسویں صدی)"۔ 17 جون 1974 کو ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں بطور لیکچرار ان کا تقرر ہوا۔ پھر ترقی کرتے کرتے 1995 میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ محترمہ نے 11 اکتوبر سن 2008 میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔

موصوفہ کے ادبی خدمات قابل تعریفیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ اردو، فارسی، انگریزی اور بنگالی ان چاروں زبانوں میں مہارت رکھتی تھیں۔ قومی اور بین الاقوامی رسالوں میں ان کے بہت سارے مقالے چھپ چکے ہیں۔ ذیل میں ان کے ادبی خدمات کی ایک مختصر فہرست پیش خدمت ہے۔

کتاب

پروفیسر ڈاکٹر ام سلمٰی کی تحقیقی مقالہ '' بنگلہ دیش کے فارسی اور اردو ادب میں تاریخی مأخذ (انیسویں صدی)'' نام سے کتابی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس کو ساہتیہ وگیشنا کندرا نے ۲۰۲۲ میں شائع کیا ہے۔

تحقیقی مقالے

1. عبدالغفور نساخ کی اردو اور فارسی کی خدمات، اکتوبر 1980، ہماری زبان، نئی دہلی
2. جادو- جنوری 1984 فروغ اردو، لکھنؤ
3. خالد بنگالی: ایک مطالعہ- جون 1984، وجود، ڈھاکہ
4. اردو کا پہلا نثری ڈرامہ "نوابی دربار"، جنوری 1988، ماہ نو، لاہور
5. میرزا جان طپش کی ادبی و سیاسی سرگرمیاں، مئی 1988، ماہ نو، لاہور
6. انیسویں صدی میں خواجگان ڈھاکہ کی اردو و فارسی خدمات، اکتوبر، 1988، ماہ نو، لاہور
7. ثلاثہ غسالہ (حصہ اردو) پر ایک نظر- جولائی 1990، قومی زبان، کراچی
8. نواب سید محمد آزاد کی اردو خدمات، اکتوبر، 1990، قومی زبان، کراچی
9. احمد حسین وافر بہ حیثیت ڈرامہ نویس اور شاعر، مئی 1991، قومی زبان، کراچی
10. آغا احمد علی اصفہانی، اکتوبر، 1992، دانش، اسلام آباد
11. ڈاکٹر عندلیب شادانی: ایک جائزہ، جولائی، 1993 قومی زبان، کراچی
12. بنگلہ دیش کے لوک گیت، ستمبر 1993، روح ادب، کلکتہ
13. انیسویں صدی میں فرید پور کے قاضی خاندان کی اردو فارسی خدمات، نومبر 1993، قومی زبان، کراچی
14. اقبال کی نظر میں عورت، قومی زبان، کراچی
15. بنگلہ زبان پر اردو زبان کا اثر، 1996، شعبہ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کا یادگاری نمبر میگزین

16. عبدالغفور کی شاعری، 1998، روح ادب، کلکتہ
17. محمد اقبال اور قاضی نذرالاسلام: ایک تقابلی جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول

معروف مصنفہ ڈاکٹر کنیز بتول کی پیدائش 14 دسمبر 1951 کو پرانے ڈھاکہ کے ایک مشہور نوابی خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد کا نام سید علی محمد (نواب چھوٹن) اور والدہ کا نام جعفری بیگم ہے۔ انہوں نے سن 1971 میں SSC اور 1973 میں HSC کا امتحان پاس کیا۔ انہوں نے 1981 میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے اردو میں بی اے آنرز اور 1982 میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1987 میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ 2003 میں انہوں نے ڈاکٹر ابوبکر صدیق صاحب کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ 9 جولائی 2006 سے آخری دم تک وہ شعبہ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدے پر فائز رہیں۔

ان کی کتابوں اور مقالوں کی فہرست حسب ذیل میں پیش خدمت ہے۔

کتابیں

1. اردو زبان میں نذرل کا چرچا: بنگلہ ادب کے مشہور شاعر نذرل الاسلام کو پوری دنیا کے اردو داں طبقے کے ساتھ متعارف کرانے کے لیے انہوں نے یہ کتاب لکھی۔ یہ کتاب 2001 میں نذرل انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ سے شائع ہوئی۔

2. آتش گل: یہ کتاب بنگلہ میں لکھی گئی۔ اس میں نذرل کے منتخب نظموں، افسانوں، ناول، گیتوں ور ڈراموں کے اردو تراجم موجود ہیں۔ یہ کتاب بھی 2001 میں نذرل انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ سے شائع ہوئی۔

3. بنگلہ دیش میں اردو ادب (1947-1990): یہ کتاب ڈھاکہ کے شاہتیہ وگویشنا

کینڈرا سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں بنگلہ دیش میں مقیم سو سے بھی زائد اردو ادیبوں اور شاعروں کی حیات اور ادبی کارنامے پر بحث کی گئی ہے۔

تحقیقی مقالے

پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول کے علمی، ادبی اور تحقیقی مقالوں کی تعداد تقریباً 41 ہے۔ ان میں کچھ مقالوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

1. اقبال کی نظر میں عورت، اقبال اسٹاڈیز رسالہ علامہ اقبال سنگساد۔ بنگلہ دیش، مارچ 1988، صفحہ 26-31

2. اقبال ایک کامل انسان، اقبال اسٹاڈیز رسالہ علامہ اقبال سنگساد، بنگلہ دیش، اپریل 1998، صفحہ 74-75

3. بنگلہ دیش کی اردو شاعری میں مقامی خصوصیات کی عکاسی، تحقیقی رسالہ الماس، جلد 7، 2004، شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور، سندھ، پاکستان۔

4. نواب شمس الدولہ: حیات اور کارنامے (1770 - 1838)، ادب، ڈھاکا کا سہ ماہی ادب اردو رسالہ، مئی، 2000

5. نوشاد نوری کی شاعری، روح ادب، مغربی بنگال کا سہ ماہی ادبی رسالہ، اردو اکاڈمی، کلکتہ، مارچ 2002

6. نوشاد نوری کی یاد میں، ادب، ڈھاکہ کا سہ ماہی ادبی اردو رسالہ، مئی 2003

7. بنگلہ دیش میں اردو ادب، ایک مختصر جائزہ: ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف فارسی اور اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، 2004

8. احسن احمد اشک سے ایک گفتگو، فنون، سہ ماہی اردو رسالہ، لاہور، 1996، صفحہ 110-124

9. اردو زبان میں نذرل کا چرچا، رسالہ نذرل انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ، پیدائش نذرل

کے سالگرہ کا رسالہ، 1999

10. بنگلہ دیش میں اردو تحقیق وتنقید (1947 تا حال)، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف فارسی اور اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، سال-3، جلد-3، 2006

پروفیسر ڈاکٹر زینت آرا شیرازی

ڈاکٹر زینت آرا شیرازی کی پیدائش پرانے ڈھاکہ کے بیگم بازار شیرازی خاندان میں 14 دسمبر 1947 کو ہوئی۔ انہوں نے سن 1966 قمر النساء گورنمنٹ ہائی اسکول سے SSC اور 1968 میں بدر النساء گورنمنٹ گرلز کالج سے HSC کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں 1971 میں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے اردو میں بی اے آنرز اور 1972 میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ سن 1990 میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں لکچرار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ بعد میں وہ پروفیسر بنیں۔ فی الحال ملازمت سے فارغ ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی مختلف رسالوں میں ان کے 15 سے بھی زائد تحقیقی مقالے شائع ہو چکی ہیں۔

ان کے چند مقالوں یہ ہیں۔

1. کلام اقبال میں اشارات قرآنی، ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف پرشین اینڈ اردو، شمارہ2، سال 2005

2. میر امن کی باغ و بہار؛ ایک تنقیدی جائزہ: جرنل آف پرشین اینڈ اردو، شمارہ 3، سال2006

3. غالب بحیثیت نثر نگار؛ ایک تحقیقی جائزہ، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ2، سال 2009

4. ظہور الحق مبارکی اور ان کا کلام غزالان حرم: ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف پرشین اینڈ اردو، شمارہ 1، سال 2004 وغیرہ

پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں

راقم الحروف پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں کی پیدائش 1 مارچ سن 1969 کو نواکھالی ضلع کے بیگم گنج میں ہوئی۔ انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے 1988 میں بی اے آنرز اور 1989 ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ سن 1995 میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی میں (فی الحال جس کا نام شعبہ اردو ہے) بحیثیت لکچرار ان کا تقرر ہوا۔ وہ سن 2002 سے 2005 تک شعبہ اردو کے چیئرمین رہے۔ سن 2003 میں اسی شعبے سے انہوں نے "احسن احمد اشک: حیات کارنامے اور افکار" کے عنوان پر پی - ایچ - ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ فی الحال وہ اس شعبے میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں اور بہت سارے تحقیقی مقالات لکھے ہیں۔ ذیل میں اس کی فہرست پیش خدمت ہے۔

کتابیں

1. احسن احمد اشک: حیات، کارنامے اور افکار۔ یہ موصوف کی پی ایچ ڈی کے مقالہ ہے جو سنہ 2003 میں شائع ہوا تھا۔ اس کو کتابی شکل سن 2008 میں بنگلہ اکاڈیمی سے شائع کیا گیا۔ اس کتاب میں احسن احمد اشک کے حیات، کارنامے اور افکار کے علاوہ ان کے ہم عصر شعراء اور ادباء کے تذکرے بھی درج ہیں۔

2. بنگلہ دیش میں اردو ادب۔ یہ کتاب سنہ 2004 میں شائع ہوئی۔ بنگلہ دیش میں اردو ادب کی تاریخ اور اس ادب سے منسلک مشہور اردو داں حضرات کے بارے میں اس کتاب میں بہت کچھ معلومات موجود ہیں۔

3. سرسید احمد کے ادبی کارنامے۔ یہ کتاب سن 2009 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں سرسید احمد خان کے حالات زندگی اور ان کے ادبی کارنامے پر بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

تحقیقی مقالات

1. ڈھاکا میں اردو اور فارسی ادب کا مطالعہ
2. اردو ادب میں نواب سید محمد آزاد کا حصہ
3. تقسیم سے پہلے اردو ادب
4. احسن احمد اشک: حیات اور کارنامے
5. اقبال کی شاعری میں انسان اور انسانیت
6. اقبال کی فکر میں انسان اور فطرت
7. مورخ کی حیثیت سے علامہ شبلی نعمانی کی اہمیت
8. دکن کے نثری تاریخ میں ملا وجہی کا حصہ
9. اردو ادب میں عبدالغفور نساخ کا حصہ
10. پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول: حیات اور کارنامے
11. اردو ادب کی ابتدائی نشونما میں دکن کی ادبی خدمات کا جائزہ
12. سعادت حسن منٹو کی صحافت نگاری

پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام

پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام 21 فروری 1976 میں بگورا ضلع کے دوپچانچیا تھانہ کے متھوراپور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی سے 1996 میں بی اے آنرز اور سن 1998 میں ایم اے کا امتحان کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ اس کے

بعد 2005 میں اسی شعبے سے پی ایچ ڈی کا ایوارڈ کامیابی کے حاصل کیا۔ 2004 میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت لکچراران کا تقرر ہوا۔ 2008 سے 2011 تک شعبہ اردو میں چیئرمین کے عہدے پر فائز رہے۔ ترقی کرتے کرتے وہ 26 مارچ 2014 میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ فی الحال اسی شعبہ میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں رہے ہیں۔ ان کے ادبی کارناموں میں تین کتابیں اور بہت سارے تحقیقی مقالے شامل ہیں۔

کتابیں

1. اردوادب پرمغرب کے اثرات۔ پروفیسرڈاکٹر محمد محمودالاسلام کی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا "اردو ادب کی سرپرستی میں انگریز افسران کا حصہ اور اردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر۔ اسی تحقیقی مقالے کو سن 2018 میں کتابی شکل دی گئی اور اس کتاب کا نام "اردو پر مغرب کے اثرات" رکھا گیا۔ اس کتاب میں موصوف نے اردو زبان کے آغاز اور ارتقا، اس کے مختلف اصناف پر انگریزی ادب کے اثرات کو بڑے ہی موثر انداز میں پیش کیا۔

2. مختلف زبانوں کا باہمی تعلق۔ یہ کتاب سن 2016 میں شائع ہوئی۔ یہ دراصل پانچ تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان مقالات میں انہوں نے مثالوں کے ذریعے اردو، ہندی، بنگلا، فارسی اور انگریزی زبانوں کے باہمی تعلق، مشابہت، مماثلت اور ایک دوسرے پر اثرات کو عام فہم زبان میں بیان کیا۔

3. اردو گرامر اور کمپوزیشن۔ یہ کتاب سن 2009 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں قواعد اردو کے مختلف پہلوؤں پر بہت دلچسپ بحث پیش کی گئی ہے۔ بنگلہ گو طلبہ اور طالبات کو بنگلہ زبان کے ذریعے قواعد اردو سکھانے کے لیے یہ ایک اہم کتاب ہے۔

تحقیقی مقالات

1. اقبال کی شاعری میں شاہین کا تصور
2. مغربی علوم کی اشاعت میں دہلی کالج کی خدمات
3. بنگلہ میں اردو کا آغاز
4. شعبہ فارسی و اردو کی چند ادبی شخصیتیں
5. اردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر
6. بنگلہ ادب میں فطرتی ماحول کی نمائندگی
7. اردو کی ترقی میں یورپین کا حصہ
8. سرسید کے تعلیمی افکار میں جدیدیت کی جھلکیاں
9. اردو کی پیدائش اور ترقی پر ایک ناقدانہ نظر
10. بنگلہ دیش میں اردو کی صورت حال
11. اردو اور ہندی زبان: ایک تقابلی مطالعہ
12. سماج کی تعمیر میں بنگلہ ادب کا کردار
13. اردو اور بنگلا زبان کا باہمی رشتہ
14. بنگلہ سے اردو تراجم: ایک تجزیہ
15. اردو پر فارسی کا اثر
16. The influence of Fort William College on Urdu language and literature.
17. Evolution of the world in Iqbal and Tagore's poetry.

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی کی پیدائش 29 اگست 1974 میں کشور گنج ضلع کے پاکوندیہ کے بہادیہ میں ہوئی۔ انہوں نے ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے 1997 میں بی اے آنرز اور 1999 میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انہوں نے 2006 میں "اقبال کی شاعری میں تاریخی معلومات اور شخصیت" کے عنوان سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ موصوف 2011 سے 2014 تک اسی شعبے کے چیئرمین تھے۔ چیئرمین رہنے کے دوران سن 2011 میں "برصغیر کے مشہور علماء کی اردو ادبی خدمات (1857-1947)" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ فی الحال وہ اسی شعبے میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے کل تیرہ کتابیں اور بہت سارے تحقیقی مقالات لکھے ہیں۔

کتابیں

۱۔ اردو ادب میں مشہور علماء کی خدمات۔ یہ کتاب سن 2014 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں موصوف نے اردو افسانہ، ناول، خطوط نگاری، مقالہ نگاری، آپ بیتی، اور اردو شاعری میں علامہ شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، مولانا ابوالکلام آزاد، اسماعیل میرٹھی جیسے مشہور شعراء اور ادباء اردو کی خدمات بیان کی ہیں۔

۲۔ علامہ اقبال کی شاعری میں مذکورہ شخصیات۔ یہ کتاب سن 2012 میں پہلا مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انہوں نے اقبال کی شاعری میں انبیاء رسل (مثلاً حضرت محمد مصطفیٰ ص، حضرت آدم، حضرتِ ابراہیم) اصحاب کرام (مثلاً حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان) راجا بادشاہ (مثلاً بادشاہ سکندر ذوالقرنین، بادشاہ نادر شاہ، تیمور لونگ) ادباء و شعراء (مثلاً مرزا اسد اللہ خاں غالب، علامہ شبلی نعمانی) کے بارے میں تذکرہ پیش کیا۔

۳۔ نبی جی کے گھر میں ایک دن۔ یہ کتاب سن ۲۰۰۷ میں شائع ہوئی۔

۴۔ قرآن حدیث کی کہانی جاسوس صحابی۔ یہ کتاب ۱۹۹۹ میں شایع ہوئی ہے۔

۵۔ آج کی اردو، یہ ۲۰۱۳ میں شائع ہوئی ہے۔
۶۔ طریقۂ حج، ۲۰۱۷ میں شائع ہوئی ہے۔
۷۔ بڑے گھر کی بیٹی۔ اردو افسانوں کا بنگلہ تراجم۔
۸۔ حج عمرہ زیارت مدینہ، ۲۰۲۲ میں شائع ہوئی ہے۔
۹۔ رمضان میں عورتوں کے سو مسائل، ۱۹۹۸ میں شائع ہوئی ہے۔
۱۰۔ تخلیقات جہاں آرا۔ مرتبہ کتاب۔ ۲۰۲۱ میں شائع ہوئی ہے۔ وغیرہ۔

تحقیقی مقالات

1. بنگلہ دیش میں اردو صحافت: ماضی اور حال
2. علامہ اقبال کی شاعری میں مکالماتی انداز
3. غالب کی امن پسندی ان کے مکاتیب کی روشنی میں
4. خطوط غالب میں ظرافت نگاری
5. سعادت حسن منٹو کی انسان دوستی ان کے افسانوں کی روشنی میں
6. شام بارک پوری کے افسانوں میں بنگلہ دیش کے قدرتی مناظر
7. اردو افسانے میں بنگلہ دیش کے سماج اور ثقافت
8. مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے خطوط نگاری
9. خطوط غالب کے آئینے میں اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی
10. مولانا عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول
11. اردو درس و تدریس میں ٹیکنالوجی کا استعمال
12. ارمان شمسی اور ان کی افسانہ نگاری وغیرہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل 10 نومبر 1979 میں برہمن باڑیا ضلع کے بنچارام پور تھانہ کے کالئی نگر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے 1999 میں بی اے آنرز اور 2000 میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ سنہ 2004 میں لیکچرار کی حیثیت سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ان کا تقرر ہوا۔ سنہ 2014 سے 2017 تک وہ اس شعبے کے چیئرمین رہے۔ فی الحال وہ پروفیسر کی حیثیت سے اسی شعبے میں کام کر رہے ہیں۔ سن 2010 میں انہوں نے "حکیم حبیب الرحمٰن: سماجی کارکن و ادبی کارکن" موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی مکمل کی۔ ان کی ادبی خدمات حسب ذیل ہیں۔

تحقیقی مقالات

1. سلیم اللہ فہمی: حیات اور ادبی کارنامے
2. مولانا حالی کی نعتیہ شاعری
3. قاضی نذرالاسلام کی نعتیہ شاعری
4. نذیر احمد کے ناولوں میں عورت کا تصور
5. پریم چند کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کی عکاسی
6. امراؤ جان ادا میں لکھنوی سماج کی عکاسی
7. حکیم حبیب الرحمٰن کی صحافت نگاری
8. خالد بنگالی ایک مایہ ناز ادیب
9. اکیسویں صدی میں بنگلہ دیش کے اردو ادباء
10. درہ حاضر میں اردو ادب کے بنگلہ مترجم
11. ڈھاکہ کے چند اردو شعراء وغیرہ

ان کے یہ سارے مقالات "ڈھاکہ کا یونیورسٹی جرنل آف اردو"، "ایشیاٹک سوسائٹی

جرنل" ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل" وغیرہ سے شائع ہوئے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد

ڈاکٹر رشید احمد کی پیدائش بیسویں صدی کے نصف آخر کے وسط میں بنگلہ دیش کے مشہور ضلع کوملا کے ایک چھوٹا سا گاؤں "فرید پور" کے ایک دینی گھرانے میں ہوئی۔

ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے دینی مکتب میں ہوئی۔ بعدازاں انہوں نے ڈھاکہ ڈمرا کے نرائی باغ مدرسہ سے حفظ القرآن مکمل کیا۔ پھر ڈھاکہ کے مشہور دینی ادارہ جامعہ قرآنیہ عربیہ لالباغ اور جامعہ رحمانیہ عربیہ محمد پور ڈھاکہ سے جماعت مشکوۃ شریف تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد دارالعلوم دیوبند سے سند فضیلت حاصل کی اور پھر جامعہ رحمانیہ عربیہ محمد پور اور اشرف العلوم بڑا کٹرہ مدرسہ ڈھاکہ سے حصولِ سندِ افتاء کی سعادتیں بھی حاصل کیں۔

اسی درمیان میں انہوں نے "داخل" اور "عالم" کا امتحان بالترتیب 1993 اور 1995 میں پاس کیا۔ اس کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں 1995-1996 سیشن میں بی اے آنرز میں داخلہ لیا۔ 1998 میں انہوں نے بی اے آنرز کی سند حاصل کی اور پھر 2000 ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اور دونوں امتحان میں درجہ اول میں اول رہے اور دو دو گولڈ میڈل سے نوازے گئے۔ 2008ء میں جناب رشید احمد کا شعبہ اردو ڈی یو میں بحیثیت لکچرار تقرر ہوا۔ اب وہ ایسوسیٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ادبی خدمات

اب تک ڈاکٹر رشید احمد کے 15 سے زائد تحقیقی مقالات ملکی اور غیر ملکی جرنیلوں میں چھپ چکے ہیں۔ ان کی دو تحقیقی کتابیں "علامہ اقبال کی شاعری میں اسلامی تصورات اور ہندوستان کے چند مخصوص شاعر اور ادیبوں کی نظر میں عورت" شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دو شائع شدہ اردو سے بنگلہ میں مترجمہ کتابیں بھی ہیں: ۱۔ تاریخ الاسلام حصہ سوم مرتبہ مولانا

محمد میاں صاحب اور ۲۔سلاسل طیبہ مصنفہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ۔

جناب حسین البناء

جناب حسین البنا فی الحال ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔انہوں نے 2004 میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بی اے آنرز اور 2005 میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔اور دونوں امتحان میں اول درجے کی میں اول ہوئے۔بعد ازاں 2012 میں اسی شعبہ میں لکچرار کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔اب تک ان کے کل 9 تحقیقی مضامین اور 14 کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

انہوں نے بنگلہ دیش، بھارت اور ترکی کے مختلف بین الاقوامی سیمینارز میں تحقیقی مقالے پڑھے اور متعدد مقامی اور غیر ملکی جرائد میں مقالے شائع کیے ہیں۔ان کی لکھی ہوئی ایک کتاب جس کا عنوان ہے 'عسکریت پسندوں کی غلط تشریح اور قرآن وحدیث کی صحیح تشریح' RAB ہیڈ کوارٹر سے شائع ہوئی ہے اور اندرون و بیرون ممالک میں اس کا خوب چرچا ہے۔وہ ایک اسلامی اسکالر اور میڈیا میں ایک جانا پہچانا چہرہ ہیں۔

حفصہ اختر

حفصہ اختر کی پیدائش 26 مارچ 1990 کو نرائن گنج میں ہوئی۔انہوں نے ابتدائی تعلیم نرائن گنج میں ہی مکمل کی۔؟ پھر میٹرک اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے 2012 میں بی اے آنرز اور 2013 میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔انہوں نے دونوں امتحان میں اول درجے میں اول پوزیشن حاصل کی۔موصوفہ نے 17 نومبر 2014 میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت لیکچرار ملازمت اختیار کی۔سن 2018 میں وہ اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ 14

تحقیقی مقالے

1. بنگلہ دیش میں اردو ادب کے خدمت گزار: جلال عظیم آبادی، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، بنگلہ دیش، شمارہ 7، سال اشاعت 2020

2. ترکی کے اردو دوست خلیل تو کار کی شاعری کا فنی تجزیہ، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو،، بنگلہ دیش، شمارہ 6، سال اشاعت 2020

3. ڈھاکا یونیورسٹی میں اردو کی تدریس و تحقیق، NCPUL، کلکتہ، سال 2018ء

4. احمد ندیم قاسمی کی شاعری: متنوع جہات کا تجزیہ، جرنل آف اردو اورینٹل اسٹڈیز، استنبول یونیورسٹی، ترکی، شمارہ 12، 2018

5. احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا فنی تجزیہ: ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، بنگلہ دیش، سال 2018

6. انتظار حسین کے افسانوں کا فن و افکار، اردو اسکالر کی دنیا، بین الاقوامی کانفرنس جرنل آف اردو، نئی دہلی، شمارہ 4

7. مسرور جہاں کی فکری اساس اور افسانہ نگاری، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ 8، سال اشاعت 2020

حوالہ جات

1. ڈاکٹر جعفر احمد بھوئیاں، احسن احمد اشک، زندگی، کارنامے اور افکار، بنگلہ اکاڈمی، ڈھاکہ، بنگلہ دیش۔

2. پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، بنگلہ دیش میں اردو تحقیق: 1971 سے تا حال

3. محمد ابوالکلام سرکار، ڈھاکہ یونیورسٹی کی سو سالہ تحقیقاتاً ایم فل، پی ایچ ڈی، ایتی برتی پروکاشنی، دسمبر ۲۰۲۱ء

.4 سرور غزالی، جرمنی میں اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، سال 2014، شمارہ: 7، صفحہ 170

.5 ڈاکٹر محمد کاظم، اکیسویں صدی کی پیش کردہ داستانیں، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، سال 2015، شمارہ: 8، صفحہ 160

.6 ڈاکٹر شہناز قادری، نئی صدی میں اردو ناول: جموں و کشمیر کے حوالے سے، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، سال 2015، شمارہ: 8، صفحہ 103

.7 سارہ بتول، اکیسویں صدی میں اردو ادب کے منتخب خودنوشت: ایک تجزیاتی مطالعہ، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، سال 2014، شمارہ: 7، صفحہ 155

.8 مشتاق احمد، روزنامہ پروتھم آلو، ۱۴ ہزار قومی مدرسوں میں ۱۴ لاکھ طالب علم، ۲۲ مئی ۲۰۱۵ء۔

.9 احمد الیاس، بنگلہ دیش میں اردو، بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، سال اشاعت: جون/2014، ڈھاکہ، بنگلا دیش

10. www.betar.gov.bd

.11 ڈاکٹر محمد اسرافیل، سلیم اللہ فہمی: حیات اور کارنامے، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، سال: 2008، شمارہ: 01، صفحہ: 7-15

.12 ڈاکٹر جعفر احمد بھوئیاں، احسن احمد اشک: حیات اور کارنامے، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، سال: 2008، شمارہ: 01، صفحہ: 15-27

.13 ڈاکٹر رضاء الکریم، نوشاد نوری اور ان کی شاعری، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، سال: 2015، شمارہ: 08، صفحہ: 57-71

.14 ڈاکٹر ان م احسان المالکی، بنگلہ دیش میں اردو کے فروغ میں خواتین کی خدمات، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، سال 2015، شمارہ: 8، صفحہ 208

بنگلہ اور اردو کا لسانی رشتہ

حفصہ اختر

Abstract

[Urdu & Bangla both are modern languages and members of Indo-Aryan group within the Indo European family of languages. Both are south Asian languages. Bangla is the lingua franca of the Bengal region of the Indian Subcontinent & most widely spoken language of Bangladesh. On the other hand Urdu has no specific region and is most widely spoken languages of Indian Subcontinent. It is spoken in Bengal region also. Urdu has a very ancient relationship with Bangla. From the very beginning, Urdu had been used as a medium of communication in this sub-continent and was the official language a few times. Gradually Urdu language and literature have been developed and took an important place in this subcontinent. As Urdu & Bangla both of the languages have been simultaneously used in this subcontinent since long, both languages accepted the influence of each other. Fort William College of Kolkata (West Bengal) played an important role in the development of Urdu language & literature. The purpose of this study is to elaborate & analyze those influences. The core objective of this paper is to present similarities between Bangla and Urdu

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی

words, origin and language family of Bangla & Urdu, a special study on Bangladeshi's Urdu & Kolkata's Urdu, Urdu phrase & idioms in Bangla. Conclusively this paper will attempt to describe in details, the reason behind the influence of Bangla language on Urdu.]

اردو اور بنگلہ دونوں ہی جدید ہندوستانی زبانیں ہیں۔ دونوں کا وطن سرزمین ہند ہے۔ اردو زبان نے تھوڑے ہی زمانہ کے اندر اپنی دلآویزی اور دلچسپی کے باعث جس قدر ترقی حاصل کی ہے وہ یقیناً تعجب خیز ہے۔ اردو ایک ترقی یافتہ اور مقبول عام زبان ہے جو ہندوستان کے ہر حصے میں رائج ہے۔ یہ زبان جہاں بولی بھی نہیں جاتی وہاں بھی بخوبی سمجھی جاتی ہے۔ بنگلہ زبان بنگال کے علاقے کی عوام کی زبان ہے۔ بنگال غیر منقسم برصغیر کا وہ مشرقی جغرافیائی علاقہ ہے جو تقسیم ہند ۱۹۴۷ء میں دو حصوں میں بٹ گیا۔ وہ علاقہ جو پہلے مشرقی بنگال کے نام سے جانا جاتا تھا مشرقی پاکستان کے نام سے موسوم ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے خلاف جنگ آزادی کے بعد پاکستان سے علیحدہ ہو کر ایک نئے نمودار آزاد ملک بنگلادیش کے نام سے عالمی نقشے میں نمودار ہوا۔ بنگال کا دوسرا علاقہ ہندوستان کی ایک ریاست یعنی مغربی بنگاک کے نام سے منسوب ہے۔ بنگلہ زبان کی طرح اردو کے کوئی مخصوص اور محدود علاقہ نہیں ہے۔ اردو بولنے والے پورب یا پچھم، اتر یا دکن ہر علاقے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جیسے بنگلہ بولنے والوں کو بنگالی کہا جاتا ہے اسطرح اردو بولنے والوں کو کسی ایک نام سے پکارا بھی نہیں جا سکتا۔ اس کے باوجود اردو ایک ایسی زبان ہے جو لاکھوں اور کروڑوں کی مادری زبان ہے، یہ بے حد مقبول زبان ہے، ایک ایسی ترقی یافتہ زبان ہے جس کی وجود سے، علمی و ادبی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔[۱] حاجی محمد عبدالقادر بنارسی انکی کتاب 'رہنمائے تاریخ اردو' میں بیان کرتے ہیں:

''اکثر ذی علم تجربہ کار یورپین اصحاب کی بھی یہ رائے ہے کہ
اردو ہندوستان کی عام زبان کہی جانے کی مستحق ہے، صرف
ہندوستان ہی نہیں بلکہ دیگر اقالیم میں بھی اس کے قدرداوں
بکثرت موجود ہیں، اسی مقبولیتِ عام کی وجہ سے اردو زبان
نے ۱۸۳۲ء میں سرکاری دفتر میں جگہ پائی۔''[۲]

جہاں تک بنگلہ اور اردو کے باہمی تعلقات کی بات ہے تو یہ سب کو معلوم ہے کہ بنگال سے اردو کا بہت ہی قدیم تعلق رہا ہے۔ اور اس بات کو قطع انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اردو زبان اور ادب نے اپنے ارتقا کی ایک بڑی منزل اسی سرزمین میں طے کی ہے۔ شگفت آور ہے کہ اردو زبان اور ادب نے اپنی ترقی کی بیش تر منزلیں ان علاقوں سے طے کی ہے جہاں اسکی خمیر نہیں تھی۔ بیشتر ماہرین لسانیت کی یہ رائے ہے کہ اردو کھڑی بولی سے نکلی اور کھڑی بولی کا علاقہ دلی اور اس کا گرد و نواح ہے لیکن اس زبان نے اپنی نشو نما کے ابتدائی مرحلے دکن کی سرزمین میں طے کیے جہاں غیر آریائی زبانیں مروج تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ اردو زبان شمالی ہندی میں زیادہ نکھر کر نئے رنگ و روپ کے ساتھ جلوہ گر ہوئی اور شمالی ہند میں تصنیف و تالیف کا کام جس تیز رفتاری سے بنگال کی سرزمین میں ہوا وہ اردو کی ان علاقوں میں نہیں ہوا۔ کلکتے میں فورٹ ولیم کالج کی قیام کے بعد بہت ہی کم عرصے میں جتنی تخلیقات و تصنیفات سامنے آئیں وہ صدیوں میں نہیں آسکتی تھیں[۱] سرزمین بنگال کا اردو پر بہت بڑا احسان ہے۔ اردو شروع سے ہی برصغیر کی رابطے کی زبان رہی اور پنجاب سے بنگال تک بولی جانے والی اردو زبان نے ہر جگہ کی اثرات قبول کیے اور اس لیے بنگلہ کے اثرات بھی اردو پر ہیں اور بنگلہ میں بھی اردو کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ اس مضمون میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی کہ اردو اور بنگلہ دونوں نے جدید زبانیں ہونے کے وجہ سے ایک دوسرے سے کیا کیا قبول کیا دونوں میں کیا کیا مماثلت ہیں اور کس نے کس کو کتنا متاثر کیا ہے۔

اردو و بنگلہ کے لسانی خاندان اور ماخذ

دنیا کی زبانوں کو ماہرین لسانیات نے انکی لسانی خصوصیات کی بنا پر چند خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔اسے زبانوں کا خاندان یا Family of Languages کہتے ہیں۔اردو زبان کا تعلق ہند یورپی خاندان سے ہے۔اس خاندان کے ہند ایرانی شاخ کی ایک زبان ہند آریائی ہے۔جو بعد میں سنسکرت اور پراکت کے دور سے گزر کر جدید آریائی تک پہنچتی ہے۔ پراکت مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے موسوم کی گئی۔جیسے شورسین علاقہ میں بولی جانے والی پراکت کو شورسینی پراکرت، مگدھ میں بولے جانے والی پراکت کو مگدھی پراکت، گوڑھ میں بولی جانے والی پراکرت کو گوڑی پراکرت کا نام دیا گیا ہے۔ بیشتر ماہرینِ لسانیات کی رائے یہ ہے کہ اس شوسینی پراکت سے برج بھاشا کا جنم ہوا اور برج بھاشا سے اردو پیدا ہوئی۔ ماہر لسانیت کے ایک گروپ کی رائے یہ ہے کہ پراکت کی بگڑی ہوئی شکل کو ''بھرشٹ'' زبان یا اپ بھرنش کہلائی۔ڈاکٹر سہیل بخاری کی رائے یہ ہے کہ:

> ''اردو کی اصل شورسینی آپ بھرنش ہے جو شورسینی پراکت سے پیدا ہوئی۔شورسینی پراکت کے حدودِ اربعہ وہی تھے جو قدیم ہند آریائی دور میں 'مدھیہ دیش' یعنی شمالی وسط ہند میں کے تھے اور جہاں سنسکرت پروان چڑھی تھی۔غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو مدھیہ دیش کی اسی قدیم زبان کی آخری کڑی ہے۔''[۳]

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ہندوستانی لسانیت میں یہ نظریہ پیش کیا ہے اردو زبان کا آغاز عام مستند رائے کے مطابق اس وقت سے ہوتا ہے جب محمد غوری نے ۱۱۹۳ء میں دہلی کی سلطنت فتح کی۔[۴]

بنگلہ زبان کے ماخوذ کے بارے میں مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر محمد شہید اللہ کی رائے یہ ہے کہ

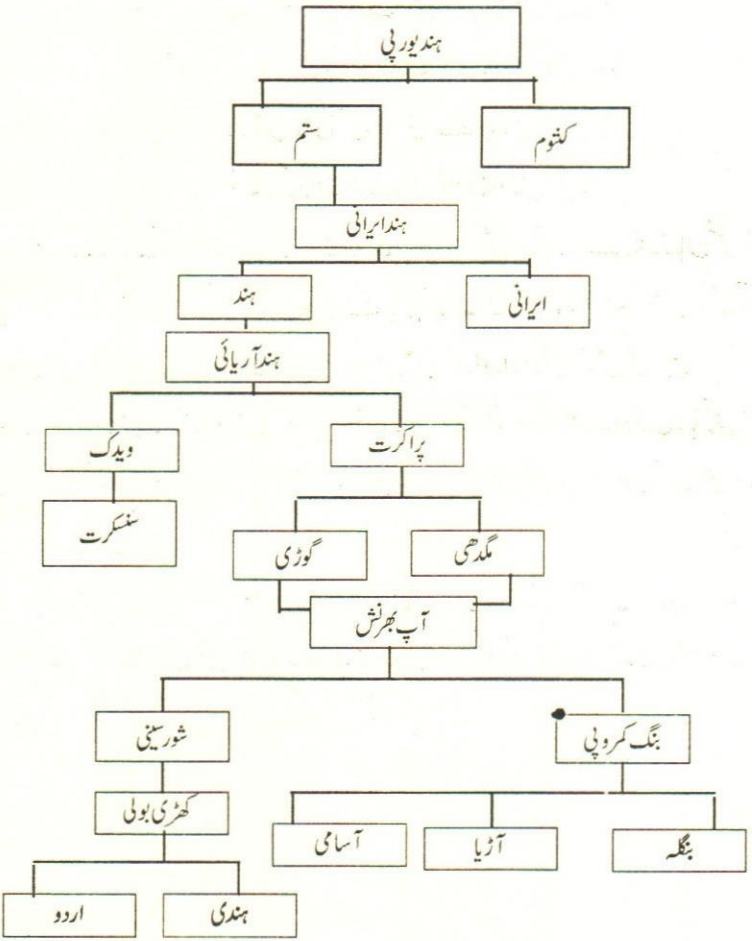
''ہم اس قدیم بھارتی آریائی بول چال کی زبان کا زمانہ سنہ

۸۰۰ ق م سے سنہ ۵۰۰ ق م تک متعین کر سکتے ہیں۔ یہ زبان
تدریجی طور پر پراکرت زبان میں مدغم یا تبدیل ہوگئی۔ وہی
پراکت جو گوڑ میں رائج تھی۔ اسی سے ہماری مادری بنگلہ
زبان سنہ ۷۰۰ء کے لگ بھگ رفتہ رفتہ وجود میں آئی۔''[۵]

اور بنگلہ کے بارے میں اور ایک مقبول رائے یہ ہے کہ مگدھی پراکت سے بنگلہ زبان عمل میں آیا۔ اور اسکے برعکس ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے بیان کیا کہ سنہ ۱۰۰۰ء میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جدید ہندوستانی زبانوں کا جنم ہوا جن میں بنگلہ اور اردو بھی شامل تھی۔[۶]

مذکورہ بالا ماہر لسانیت کے اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اردو اور بنگلہ یہ دونوں زبانیں ایک ہی لسانی خاندان سے پیدا ہوئی ہیں، ایک ہی سرزمین میں جنم لیا اور عموماً ایک ہی صدی میں وجود عمل میں آئیں۔

مذکورہ بالا بحث سے بنگلہ اور اردو زبان کے جو لسانی خاندان سامنے آتے ہیں اسے ایک چارٹ کے ذریعے حسب ذیل پیش کیا جا رہا ہے تا کہ ان دونوں کے ماخذ اور لسانی رشتہ سمجھنے میں آسانی ہو سکے:


ہندیورپی
ستم
کنتوم
ہندایرانی
ہند
ایرانی
ہندآریائی
ویدک
پراکرت
سنسکرت
گوڑی
مگدھی
آپ بھرنش
شورسینی
بنگ کمروپی
کھڑی بولی
آسامی
آڑیا
بنگلہ
اردو
ہندی

اردو میں بنگلہ زبان کے الفاظ:

کہتے ہیں کہ ایک زندہ زبان کی نشانی یہی ہے کہ وہ کتنی تیزی اور آسانی سے تبدیلیوں کو اپنانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ دوسری جانب مگر بے تحاشا ہر لفظ کو کسی زبان میں شامل کرنا اس زبان کے وجود کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ اور اردو ایک ایسی زبان ہے جو خود مختلف زبانوں کا مجموعہ ہے چونکہ اردو مختلف اھل زبان لشکریوں کی زبانوں کے میل جول سے یہ زبان وجود میں آئی تھی اور اسی وجہ سے اسے لشکری زبان بھی کہا جاتا ہے۔ اردو کے لغوی معنی لشکر ہے مندرج بالا قرائن پتہ چلتا ہے کہ سرزمین میں عمل میں آیا اور سرزمین بنگال میں اردو کو ترقی ملی اور یہاں اردو زبان ابھی تک رائج ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اردو زبان میں بنگلہ الفاظ بھی داخل ہوئے لیکن دوسرے علاقوں کے دیگر الفاظ کے مقابلے ان کی تعداد بہت کم ہیں۔ اس کے باوجود اردو نے جو بھی الفاظ بنگلہ زبان سے قبول کئے ہیں یا سرزمین بنگال اور بنگالیوں کی تہذیب و تمدن کی وجہ سے اردو کے خزانۂ الفاظ میں جو بھی اضافہ ہوا ہے وہ بھی کم توجہ طالب نہیں ہیں۔ چونکہ بنگلہ زبان صرف بنگلہ دیش اور مغربی بنگال میں رائج ہے اور اس سرزمین میں اردو بھی رائج ہے اس لئے اردو میں داخل ہوئے بنگلہ الفاظ کے پیچھے اس سرزمین کا بڑا اثر رہا۔ اور ان دونو علاقے میں جو اردو رزبان انج ہے ان میں بنگلہ زبان کی اثرات زیادہ ملتے ہیں۔ اب بنگلہ دیش اور کلکتہ کی اردو زبان میں مشتمل بنگلہ الفاظ کے بارے میں بیان کیا جائے گا اور آگے چل کر عام اردو میں جو بنگلہ الفاظ ملتے ہیں اس کی ایک فہرست پیش کیا جائے گا۔

کلکتوی اردو اور بنگلا دیشی اردو :

ہر علاقہ کی ایک مخصوص زبان ہوتی ہے جسے علاقی بولی کہا جاتا ہے۔ ایسے علاقی بولی کے بے شمار الفاظ ہیں جو صرف اس خاص علاقے کی اردو زبان میں ہی استعمال ہوتے ہیں۔ جو اُس خاص علاقہ کی اردو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جیسے دکن میں رائج اردو کو دکنی اردو، بمبئی کی اردو

Journal of

وغیرہ۔اس طرح کلکتہ میں رائج اردو کو کلکتیا اردو کہا جاتا ہے۔بنگلہ دیش میں رائج اردو کو بنگلہ دیشی اردو کہا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ اس پر بنگلہ زبان کا گہرا اثر ہے۔کلکتوی اردو میں چند تصانیف بھی منظرِ عام پر آئی۔

بنگلہ دیشی اردو: ڈھاکہ میں مسلم ثقافت کی آمد سلطنت کے دور میں ہوئی۔ بعد میں ڈھاکہ مغل دور میں دارالحکومت بنا۔ حالانکہ اردو زبان اس ملک میں بہت پہلے نمودار ہو چکی تھی۔بنگال کے اشرفیہ خاندانوں میں اردو زبان کا رواج نمایاں تھا۔ ڈھاکہ کے قدیم باشندے، ڈھاکہ کے کُٹی طبقے کے لوگوں کی زبان تو بنگلہ ہے لیکن وہ اردو سمجھتے ہیں اور بول بھی سکتے ہیں۔ڈھاکہ کے زمینداروں اور شاعروں کی جانشین بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو بھی بولتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغل دور میں شمالی ہندوستان میں جس شاندار ثقافت کی نشونما ہوئی، ڈھاکہ کے مسلم اشرافیہ اس روایتی ثقافت کی علمبردار تھے لیکن ان کی زبان میں، رسم ورواج میں بنگالی مٹی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔انکی اردو زبان کا اثر بنگلہ زبان پر پڑا اور ان کی زبان میں بنگلہ الفاظ کا اطلاق ہوا۔ے

چند ایسے الفاظ پیش کرتی ہوں:

گنڈاری: اردو لفظ گنا کو بنگلہ دیش میں گنڈاری کہا جاتا ہے۔اور بنگلہ دیش کے اردو داں گنا کے لئے یہی گنڈری لفظ کو ہی استعمال کرتے ہیں۔

پنجابی: اردو میں کرتا ہے۔لیکن بنگلا دیش میں کرتا کے لئے عام فہم لفظ پنجابی ہے جو اس علاقائی اردو میں بھی رائج ہے۔

ترکاری: ترکاری کے اردو معنی سالن ہے۔بنگلہ دیش میں ترکاری لفظ سالن کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا ہے۔اردو بنگلہ دیش میں رائج اردو میں بھی یہی لفظ عام ہے۔

ڈاب: یعنی کچا ناریل۔بنگلہ یش میں سبز اور کچا ناریل کو ڈاب کہا جاتا ہے اور اسکا صرف پانی پیا جاتا ہے۔کچے ناریل کے لئے ڈاب کا لفظ بنگلہ زبان سے اردو زبان نے قبول کیا۔

بھات : بنگلہ میں پکے ہوئے چاول کو بھات کہا جاتا ہے اور بنگلہ دیش کے اہل اردو داں چاول کے جگہ بھات ہی استعمال کرتے ہیں۔

پاگول : اردو میں پاگل ہے لیکن بنگلہ دیش کی اردو میں پاگول تلفظ میں تبدیلی کے ساتھ استعمال ہوتے ہے۔

انگول : اردو میں انگلی لیکن بنگلہ میں انگول استعمال ہوتا ہے۔اور بنگلہ دیش میں رائج اردو میں انگول ہی استعمال کیا جاتا ہے۔مثلاً: انگول پکڑ کے چلنا۔

بیگون : یہ ایک سبزی ہے، اردو میں بینگن ہے لیکن بنگلہ دیش کی اردو میں بیگون کہا جاتا ہے اور بنگلہ لفظ بھی بیگون ہی ہے۔مثلاً: بازار سے بیگون لے آنا۔

شادہ : اردو میں سفید لیکن بنگلہ دیش کی اردو میں عام طور پر شادہ ہی استعمال ہوتا ہے۔

بھاڑا : کلکتوی اردو میں عام فہم لفظ بھاڑا ہے اردو میں اس لفظ کے معنی کرایہ ہے۔ بنگالی بھی کرایہ کے لئے اہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔

شادھین : اردو میں آزاد اہے لیکن بنگلا دیش کی اردو داں شادھین استعمال کرتے ہیں۔

بنگلہ دیش کی اردو کے چند جملے مثال کے طور پر پیش کیا گیا:

۱۔آج ہم نیر امیش کھائیں گے : اس جملہ میں ''نیر امیش'' لفظ بنگلہ ہے۔

۲۔یہ آم کا گاش ہے: اس جملہ میں گاش بنگلہ لفظ ہے جو اردو میں درخت ہے

۳۔ہم کا باڑی: باڑی بنگلہ لفظ ہے جس کو اردو میں گھر کہا جاتا ہے۔

۴۔یہ کتاب میرا ہے: بنگلہ دیش کی اردو زبان میں ایسے کہا جاتا ہے جب کہ صحیح اردو ہے یہ کتاب میری ہے۔[۸]

کلکتوی اردو:

تلا : تلا کے معنی منزل ہے۔ کلکتے کی اردو میں لفظ تلا نہایت عام بول چال میں استعمال ہوتا

ہے۔

ٹٹکا: ٹٹکا کے معنی تروتازہ کے ہوتے ہیں جو بنگلہ سے آیا ہے۔ یہ خالص کلکتوی اردو کا لفظ ہے ۔

خبردار: جس کا معنی ہوشیار ہے۔ کلکتوی اردو اور بنگلہ میں یہ لفظ عام فہم ہے۔

ماتھا خراب: ماتھا خراب کو اردو میں دماغ خراب کو کہتے ہیں۔ یہ بنگلہ لفظ ہے جو صرف کلکتہ کے اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ کلکتہ کے ایک اردو شاعر سید لطیف الرحمٰن لطیف نے اپنی ایک شعر میں بھی اس لفظ کا استعمال کیا ہے۔[۹]

اب کچھ ایسے الفاظ مثال کے طور پر پیش کرنے جا رہی ہوں جن کے صرف تلفظ بنگلہ اور اردو میں ایک جیسے ہی نہیں بلکہ مترادف معنی کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً

اردو	بنگلہ
تالا	تالا
نرم	نروم
آلو	آلو
آج	آج
سات	شاتھ
کیلا	کولا
کمبل	کمبل
تیر	تیر
دودھ	دودھ

سورنگ	سرنگ
بنگلہ	اردو
رات	رات
خرگوش	خرگوش
گاجر	گاجر
آم	آم

ذیل میں چند ایسے خاص بنگلہ الفاظ پیش کیا گیا جو بنگلہ زبان سے اردو کے دامن میں آ گئے ہیں۔

التا: ایک سرخ روغن جسے عورتیں پاؤں رنگنے کے لے لگاتی ہیں۔

باٹالی: کھجور اور تاڑ کے درخت کا رس نکال کر ایک قسم کی گڑ تیار کیا جاتا ہے جسے باٹالی گڑ کہا جاتا ہے۔

بَوڑی: بنگلہ تلفظ بوڑی ہے۔ دال پیس کر بنائی ہوئی گول گول ٹکیاں جو دھوپ میں سکھائی جاتی ہیں اور بعد میں پکوان میں ذائقہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

ٹسر: بنگلہ لفظ تسر ہے یہ بنگلہ کا مشہور اور قدیم ریشم ہے۔

ڈھینک: دھان کوٹنے کی ایک قسم کی اوکھلی جسے پاؤں کے داب سے چلاتے ہیں۔

ساکھا: یہ ایک خاص قسم کی چوڑیاں ہیں۔ سنکھ کی بنی ہوئی ان چوڑیاں ہندو بنگالن بطور اپنے سہاگ کی نشانی پہنا کرتی ہیں۔

سیتل پاٹی: بنگال کی بنی ہوئی علیٰ قسم کی چٹائی کا نام ہے جو بہت ٹھنڈی بھی ہوتی ہے۔ یہ چٹائی جس گھاس سے تیار ہوتی ہے وہ صرف بنگال میں ہی پیدا ہوتی ہے۔ میرامن نے اپنے

تصنیف باغ و بہار کے دوسرے درویش کی کہانی میں بنگلہ لفظ سیتل پاٹی کا اور پوکھر کا استعمال کیا تھا۔۱۰

شاکو: ایک قسم کے پُل ہے جو دو تین بانس نیچے اور دو تین بانس اوپر بندھ کر بنائے جاتے ہیں۔ بنگال کے اردو مصنفین نے بھی اپنی تصانیف میں یہی بنگلہ لفظ شاکو استعمال کیا۔ مثلاً فضل کریم فضلی کا مشہور ناول ''خون جگر ہونے تک'' میں شاکو کا ذکر ملتا ہے۔۱۱

گمچھا: بنگالیوں کے ایک قسم کا تولیا ہے۔

رس گلا: یہ مشہور بنگالی مٹھائی کا نام ہے۔ اردو میں ہی نہیں بلکہ دیگر زبانوں میں بھی یہی نام عام ہے۔

کھیر موہن: یہ بھی ایک خالص بنگالی مٹھائی ہے۔

چھانا: اصلی دودھ سے چھانا تیار کیا جاتا ہے۔ بنگال کی مٹھائیاں اسی چھانا سے بنتی ہیں۔ چھانا کے لئے اردو میں کوئی مترادف لفظ نہیں ہے اس لئے اس بنگلہ لفظ چھانا کو ہی اردو میں استعمال کیا جاتا ہے۔۱۲

ان کے علاوہ بنگالیوں کے چند اور مٹھائیاں بھی ہیں جن کے لئے اردو میں بنگلہ زبان کے نام ہی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً سندیش، پان توا، کملا بھوگ وغیرہ۔

بنگلہ کے تہذیب تمدن کے ساتھ جوڑے ہوئے کچھ خاص گانوں کے نام کے سلسلے میں بنگلہ میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہی الفاظ کو اردو زبان نے اپنا لیا ہے۔

مثلاً: بھٹیالی گیت، جاری گیت، ساری گیت، باول گیت، منگل کتھاؤں کی گیت

اس طرح کچھ آلات موسیقی کے نام کے سلسلے میں بھی بنگلہ الفاظ اردو میں داخل ہو چکے ہیں۔ مثلاً:

دھاک، دھول، اسراج، سریرنگ، ایک تارا وغیرہ۔۱۳

بنگال کے پھولوں میں کئی پھول ایسے ہیں جن کے لئے اردو میں بنگلہ زبان کے نام رائج ہیں

مثلاً: کرشن چورہ، اپاراجیتا، کندھراج، شاپلا، رجنی گندھا وغیرہ۔

بنگلہ میں اردو محاورے اور ضرب المثال:

محاورات وضرب الامثال کو زبان کے زیور کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ ان کی موجودگی سے سادہ بات کا بیان نہ صرف خوبصورت اور سحر انگیز ہو جاتا ہے بلکہ بسا اوات کلام کی بلاغت بھی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ محاوروں اور کہاوتوں کی اپنی ایک تاریخ ہوتی ہے اور انکا مطالعہ ہماری تہذیبی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ بنگلہ و اردو دونوں زبانوں میں محاوروں اور کہاوتوں کی تعداد بھی لگ بھگ برابر ہی ہیں۔ مشہور مصنف شری سوشیل کمار دے نے اپنی تصنف ''بنگلہ پرباد'' میں بنگلہ زبان کے نو ہزار سے زیادہ محاوروں اور کہاتوں کو شامل کیا۔ یہ مجموعہ ۴۷-۱۹۴۶ء میں منظور عام پر آیا۔[۱۲] اور بقول شانتی رنجن بھٹا چاریہ ''اردو میں دس ہزار محاورے اور ضرب المثال ہوں گے۔''[۱۳] بہت سے ایسے ضرب الامثال اور محاورات بنگلہ زبان میں رائج ہیں جن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ اردو کی بدولت بنگلہ زبان میں داخل ہوئے ہیں یا پھر ایسے ہیں جن کو ایک زبان والوں نے دوسرے سے اپنا لیا ہے۔ پہلے چند ایسے اردو محاورات بطور مثال پیش کرتی ہوں جو ذرا تبدیلی کے ساتھ بنگلہ زبان میں داخل ہوئے۔ مثلاً

بنگلہ محاورے اور ضرب المثال	اردو محاورے اور ضرب المثال
آگے کاجی پرے حاجی، شیشے پاجی	آگے قاضی بعد میں حاجی آخر کار پاجی
آسمان زمین فرق	زمین آسمان کا فرق
جتو حاجی تتو پاجی	جتنا حاجی اُتنا پاجی

کاج یر بیلا کاجی کاج پھر ولے پاجی	کام پڑے تو قاضی کام نکل جانے پر پاجی
خدارناودعاے چلے	خدا کی کشتی دعا پر چلے
عیدیر چاند	عید کا چاند
اس پار کی اس پار	اس پار یا اس پار
خدارا پر خودکاری	خدا پر خودکاری
دنیاداری مسافری صرف آنا گونا	دنیاداری مسافری صرف آنا جانا
نمک کھئے نمک حرامی	نمک کھا کر نمک حرامی
دِنے تارادے کھا	دن میں تارے نظر آنا
ملاّ ردوڑ مسجد تک	ملاّ کی دوڑ مسجد تک
سات گھاٹیر پانی	سات گھاٹ کا پانی
آپ بھلا تو جگت بھلا	آپ بھلا تو جگ بھلا
حاکم نزے تو حکم نزے نا	حاکم بدلے تو حکم نہ بدلے

اور کچھ ایسے محاورے ہیں جو ہو بہو ویسے ہی بنگلہ میں داخل ہوئے جیسے اردو میں ہیں۔ مثلاً:

بنگلہ محاورے اور ضرب المثال	اردو محاورے اور ضرب المثال
سات خون معاف	سات خون معاف

آج امیر کل فقیر	آج امیر کل فقیر
اپنا ہاتھ جگنا تھ	اپنا ہاتھ جگنا تھ
ایک دم بر باد	ایک دم بر باد
من میں شیخ فرید بغل میں اینٹ	من میں شیخ فرید بغل میں اینٹ
چوکیداری کی جھک ماری	چوکیداری کی جھک ماری
مرد کا بات ہاتھی کا دانت	مرد کا بات ہاتھی کا دانت
سات خون معاف	سات خون معاف
دلی کا لڈو جو کھایا سو پچھتایا جو نہ کھایا سو بھی پچھتایا	دلی کا لڈو جو کھایا سو پچھتایا جو نہ کھایا سو بھی پچھتایا

وغیرہ

اردو اور بنگلہ کے حروف تہجی:

تہجی سے مراد ہجے کرنا، الفاظ کے زیر زبر کو الگ الگ ادا کرنا۔ حرفِ تہجی مفرد حروف اور انکی مقررہ ترتیب کرنے کا نام ہے۔ یعنی حروف تہجی سے مراد وہ علامتیں ہیں جنہیں مختلف آوازوں کو لکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو حرفِ تہجی مختلف زبانوں سے مشتق ہے۔ جن میں عربی، فارسی، ایرانی، ہندی زبانیں شامل ہیں۔ اردو حرف تہجی کی درست تعداد پر ابھی تک کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کیا گیا۔ کیونکہ مختلف ناقدین نے اپنی تحقیق سے انکی تعداد بھی مختلف ہی بتائی ہے۔ شان الحق حقی نے تعداد ۵۲ بتائی ہے جبکہ شمس الرحمان فاروقی کے مطابق ۳۷ درست تعداد ہے۔ اس کے برعکس بنگلہ زبان میں سنسکرت کے سارے حروف ہیں۔ بنگلہ زبان میں چند ایسے حروف ہیں جن کی آوازیں بنگلہ زبان میں نہیں اور بنگلہ زبان کو قلم بند کرنے

کے لئے درحقیقت غیر ضروری ایجاد ہیں۔ مثلاً بڑی ای، بڑی او، ث، ص، ع، و، درمیانی نو غیرہ۔ اسی طرح اردو میں بھی چند ایسے ایجاد ہیں جو لسانی اعتبار سے محض بھرتی کے ہیں جو عربی فارسی سے داخل الفاظ کو لکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً: ف، خ غ، ز، ظ، ض، ذ، ق اور ع حروف۔ لیکن ہجوں میں ان حروف کی درست استعمال پر اہل زبان زور دیتے ہیں۔ عربی فارسی کے داخل الفاظ کو سمجھنے کے لے ہی ہجے میں فرق کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اردو حروف تہجی میں ث، س، ص کے لئے بنگلہ میں عموماً شین یا س آتا ہے۔ اسی طرح بنگلہ میں اردو حرف خ لے لئے کھ، اور ذ، ز، ض، ظ، ج ان پانچ حروف کے لے صرف ج ہی استعمال ہوتا ہے۔ ع کے لے الیف، غ کے لئے گ، ف کے لئے پھ اور ق کے لئیک ہی کا استعمال ہوتا ہے۔[۱۵]

اعداد: اعداد کے شمار میں اردو بنگلہ کا طریقہ ایک ہی ہے۔ مطلب یہ کہ بنگلہ اور اردو میں پورے ہندسہ کو واحد آواز میں ادا کیا جاتا ہے۔ دس کے بعد انگریزی کی طرح دو آوازوں میں گنتی نہیں کی جاتی۔[۱۶] مثلاً:

بنگلہ	اردو
اکوش	اکیس
بائیش	بائیس
تیش	تیس
اکتیس	اکتیس

اردو اور بنگلہ میں فارسی الفاظ:

فارسی زبان کے الفاظ اردو اور بنگلہ دونوں زبانیں میں بکثرت شامل ہوئے ہیں۔ ان میں ایسے

فارسی الفاظ بھی ہیں جو سوا کوئی تبدیلی ایک ہی تلفظ کے ساتھ اردو وار بنگلہ دونوں زبانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ایسے چند فارسی الفاظ بطور مثال پیش کیا گیا۔

اردو	بنگلہ
چادر	چادر
شال	شال
کباب	کباب
صابن	شابن
باورچی	بابرچی
گلاب	گلاپ
بلبل	بلبل
پلاؤ	پلاؤ

بنگلہ زبان پر اردو زبان کے اثرات کے اسباب:

بنگلہ زبان پر اردو زبان کے اثرات کے کئی سارے اسباب ہیں۔ان میں سے اہم اسباب ہیں:

عالم وعلما : بنگلہ کے مسلم عالم علماء عربی کے بعد اردو کو بہت اہمیت کے ساتھ سیکھتے ہیں اور اپنے مذہبی تقریر میں استعمال کرتے ہیں۔اور ان مذہبی علماء کے ساتھ معاشرے کے عام لوگوں کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔عام بنگالیوں نے لاشعوری طور پر اردو کے اثرات کو قبول کیا۔اس لئے اردو زبان کی اشاعت میں علماء کا گہرا کردار رہا۔

دارالسلطنت:

ایک عرصے تک ہندوستان کا دارالسلطنت دہلی رہا۔جس کی وجہ سے سرکاری اور غیر سرکاری

افراد وافراج کی مسلسل آمد ورفت جاری رہی۔ چونکہ اردو بازاری زبان تھی تو آہستہ آہستہ عوام اردو سے مانوس ہوتے گئے اور۔ اور بنگال کے لوگ بھی اس میں شامل تھے۔ جس وجہ سے یہ دونوں زبانیں ایک دوسرے سے اثرات قبول کرتے گئے۔

تجارت:

دریائے برہم پتر کے معاون دریا بوڑھی گنگا کے کنارے واقع شہر ڈاکہ ملک بنگلہ دیش کا دارالحکومت ہے۔ عہدِ مغل میں یہ شہر جہانگیر نگر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ دریا کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے مغل دور کے قبل سے ہی ڈھاکہ مقامی تجارت کا مرکز تھا۔ برطانوی حکومت میں یہ کلکتہ کے بعد ریاست بنگال کا دوسرا بڑا شہر بن گیا۔ بنگال کی ململ اور ریشم دنیا بھر میں مشہور تھی۔ یہ شہر پٹ سن کی بہت بڑی منڈی اور صنعت وتجارت کا مرکز تھا۔ چونک اظہار خیال اور لین دین کا ذریعہ اردو زبان تھی۔ اس لے تاجروں کی آمد ورفت سے اردو کو اس علاقے میں ترقی ملی۔

دفتری زبان:

سرکاری سطع پر بھی اردو کو بنگال میں پشت پناہی حاصل تھی۔ ۱۸۳۹ء میں صدر عدالت دیوانی اور صدر صدر نظامت کلکتہ نے مشترکہ طور پر فیصلہ کیا کہ کل عدالتی زبان فارسی کے بجائے اردو میں نافذ کردی جائے۔ ڈپٹی گورنر نے حکم دیا کہ تمام عدالتی کاروائیاں اور اجرائے احکام میں اردو زبان استعمال ہوگی۔ ۱۷

غرض اردو کے مراکز دہلی اور لکھنؤ سے دور ہونے کے باوجود بنگال کا رشتہ اردو سے کسی طرح کم نہیں رہا۔ یہاں عبدالغفور نساخ، حکیم حبیب الرحمٰن، سید محمد آزاد، وحشت کلکتوی، راحت

آرا بیگم وغیرہ جیسے اردو کے بہت لکھنے والوں نے جنم لیا۔ بنگال میں لوگ کب سے اردو میں شعر وشاعری کرنے لگے، اس پر تحقیق کرنے کے لئے بنگال میں اردو شاعری کے ابتدائے نقوش اور دور اول کے متعلق صحیح واقفیت حاصل کرنے کے لئے بنگلہ زبان کے پوتھی ادب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ بنگلہ اور اردو زبان کے بارے میں شیر بنگال فضل الحق کی صاحبزادی رئیس بیگم کی رائے یہ ہے کہ:

> ''انگریزی حکومت سے بہت پہلے بھی بنگال میں ہندو مسلمان اور دوسرے مذہب کے لوگ آباد تھے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح بنگال کے باشندوں کی مذہبی اور ثقافتی زبان عربی ملی ہوئی فارسی تھی ۔ بعد میں اردو ہندوستان کے لوگوں کی زبان بنی جس میں بنگال کے لوگ بھی شامل تھے۔ راجہ رام موھن رائے ان میں سے ایک تھے ۔ضلع فرید پور میں موضع راجہ پور کے عبدالغفور نساخ اور ان کے برادر خورد نواب عبداللطیف بنگالی مسلمانوں کے ممتاز لیڈر اور اردو کے مشہور شاعر تھے ان کے صاحبزادے مشہور اردو شاعر رضا علی وحشت کے استاد تھے۔''[۱۸]

دنیا کی ہر زبان حالات اور اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ زبان کا لین دین کا یہ لسانی عمل ضروری بھی ہے اور فطری بھی۔ اور یہی زبان کی خوبصوتی بھی ہے۔

حوالہ جات

۱۔شانتی رنجن بھٹا چاریہ، اردو ادب اور بنگالی کلچر، مغربی بنگال اردو اکاڈمی ،۱۹۸۲ء،کلکتہ، ص۔۱۰

۲۔حاجی محمد عبدالقادر بنارسی، رہنمائے تاریخ اردو، بنارس،ص۔۱۴

۳ ۔ڈاکٹر سہیل بخاری اردو زبان کا آغاز و ارتقا ، اردو زبان کی تاریخ،مرزا خلیل احمد بیگ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۹۵ء،ص۔۱۰۳

۴۔ڈاکٹر محمد محمودالاسلام، مختلف زبانوں کا باہم تعلق،تقوی پبلکیشن بنگلا بازار، ڈھاکہ،۲۰۱۷ء،ص۵۴

۵۔ڈاکٹر محمد شہیداللہ، بنگلا ادب کی تاریخ (دور قدیم تا دور جدید)، دور قادیم تا وسطی، ڈھالہ یونیورسٹی، جون ۱۹۵۷ء،ص۔۶

۶۔ڈاکٹر سنیتی کمار چٹر جی، بنگلہ بھاشا پر سنگے،کلکتہ،۱۹۷۵ء،ص۔۶

۷۔ ঢাকা শহরে উর্দু সংস্কৃতি, রফিকুল ইসলাম রফিক, রিদম প্রকাশনা সংস্থা, ফেব্রুয়ারী ২০০৬, পৃষ্ঠা : ৮-১০

۸۔ (پرانہ ڈھاکہ،محمد پور میں رہنے والے اہلِ اردو داں سے حاصل کردہ ڈیٹا)

۹۔شانتی رنجن بھٹا چاریہ،ایضاً،ص۔۴۰

۱۰۔ایضاً،ص۔۳۵

۱۱۔ایضاً

۱۲۔ایضاً،ص۔۳۷

۱۳۔ڈاکٹر محمد محمودالاسلام،ایضاً،ص۔۴۲

۱۴۔شانتی رنجن بھٹا چاریہ، ایضاً، ص۔۱۹

۱۵۔ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، ایضاً، ص۔۷۲

۱۶۔ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، ایضاً، ص۔۷۳

۱۷۔یادلبود ہفتاد و پنجمین سال تاسیس بخش فارسی واردو در دانشگاہ، پروفیسر کلثوم ابوالبشر، بخش فارسی واردوی دانشگاہ داکا، بنگلادیش، ۱۹۹۴ء، ص۔۱۱۴

۱۸۔ایضاً، ص۔۱۱۲

اکیسویں صدی کے چیلینز کے مقابلہ کرنے کے لئے شعبۂ اردو کے فضلاء: حال اور مستقبل

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی

The Urdu Department of Dhaka University completed its centenary. The department has seen the faces of many meritorious students in this long journey. The students of this department have devoted themselves to various important sectors. At present, students of the Urdu Department are working efficiently in different fields. In the 21st century, the needs and perceptions of the country and the nation have changed a lot. Hence. the capability of the students of the Urdu department to face the challenges of the 21st century will be discussed in this article. The article will also address the following issues: What are the contributions of the students of the Urdu Department to the governance of the country? What are their contributions to politics and sports? Who is contributing in which field of the culture? Who is spreading the country's reputation to other countries? What is the contribution of Urdu Department students in earning foreign remittances? There is no alternative to quality education in the building process of a nation? What is the contribution of this department in building a nation? All these issues have been focused in this article.

شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

جب ۱۹۱۱ میں تقسیم بنگال کو رد کیا گیا تو مشرقی بنگال ڈھاکہ میں اس رد کے خلاف احتجاج شروع ہوا۔ ڈھاکہ کے رؤساء نے اس کو ترقی کے خلاف فیصلہ قرار دیا۔[۱] اس وقت مسلمان سیاست داں کے ایک وفد نے ۳۱ جنوری ۱۹۱۲ میں لارڈ ہارڈنگر (Lord Hardinge) کے ساتھ ملاقات کی۔ جن میں نواب سلیم اللہ، نواب نواب علی چودھری، شیر بنگال اے کے فضل الحق تھے۔ انہوں نے ڈھاکہ میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے مطالبہ پیش کیا۔ مسلمان قائدوں کے سامنے ڈھاکہ میں یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ اعلان کیا گیا۔ اس کے بارے میں ۲ فروری کے روزنامہ میں خبر چھاپی کہ بھارت حکومت نے ڈھاکہ میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لئے ناتھان کمیٹی کو رپورٹ دینے کو کہا گیا۔ اس کمیٹی میں ذیل شخصیات شامل تھیں:

1۔ جی ڈبلیو کچلر،

2۔ ڈاکٹر راش بہاری گوش،

3۔ دھن باڑی کے نواب-نواب علی چودھری،

4۔ خان بہادر نواب سراج الاسلام،

5۔ ڈھاکہ کے وکیل اور زمین دار بابو آنند چندر رائے،

6۔ علی گڑھ کالج کے محمد علی

7۔ کلکتہ پریزیڈنسی کالج کے پرنسپل ایچ آر جمس،

8۔ ڈھاکہ کالج کے پرنسپل ڈبلیو اے جے آرچبولڈ،

9۔ بابو ستیس چند آچارز،

10۔ جگن ناتھ کالج کے پرنسپل بابو لالیت موہن چٹارجی،

11۔ کلکتہ پریزیڈنسی کالج کے پروفیسری ڈبلیو پیک،

12۔ ڈھاکہ مدرسہ کے سپرنٹینڈنٹ شمس العلماء ابونصر محمد وحید

13۔ڈی ایس فیجار۔[۳]

1913 میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی۔پہلی جنگ عظیم شروع ہوجانے کی وجہ سے ڈھاکہ میں یونیورسٹی قائم ہونے میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔اس کے بعد 1917 میں پھر دوبارہ یہ سوال زیر بحث آیا۔آخر کار 23 مارچ 1920 میں "ڈھاکہ یونیورسٹی اکٹ" پاس ہوا۔[۴]

یکم جولائی 1921 سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں باقاعدہ درس وتدریس شروع ہوا۔ڈھاکہ یونیورسٹی نے 3 فیکلٹی (آرٹس، سائنس اور لاء، اور 12 شعبہ کے تحت 877 طلباء اور 60 اساتذہ کو لے کر مشرقی بنگال میں علم کی شمع کو روشن کرنے کی ذمہ داری شروع کی۔[۵] صد سالہ سفر کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں فی الحال 84 شعبے، 13 انسٹی ٹیوٹ، 13 فیکلٹی کے ماتحت 2007 اساتذہ کے زیرنگرانی تقریباً 46150 طلباء اپنی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔اب تک اس یونیورسٹی سے 1733 پی ایچ ڈی، 1620 ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں 19 ہال اور 4 ہوسٹل ہیں۔ڈھاکہ یونیورسٹی کے ماتحت اور 142 کالجز ہیں۔ جن میں مزید 171863 طلباء اور 10686 اساتذہ ہیں۔[۶]

ڈھاکہ یونیورسٹی کی ابتدا جن 12 بارہ شعبے کے ساتھ ہوئی تھی ان شعبوں میں ہیں 1) بنگلہ اور سنسکرت، 2) انگریزی، 3) تعلیم، 4) تاریخ، 5) عربی اور اسلامک سٹڈیز، 6) اردو اور فارسی، 7) فلسفہ، 8) اقتصادیت اور سیاست، 9) طبیعیات، 10) کیمسٹری، 11) ریاضی اور 12) قانون۔[۷]

ڈھاکہ یونیورسٹی قیام کے وقت شعبہ اردو پر زور دیا گیا۔ کیوں کہ اس وقت امراء اور شرفاء کی زبان اردو تھی۔

جن لوگوں کی 600 ایکر زمین پر ڈھاکہ یونیورسٹی بنی ان لوگوں کی زبان بھی اردو تھی۔[۸] قیام پاکستان کے 26 سال پہلے شعبۂ اردو کی بنیاد پڑی۔ اردو زبان وادب کا چرچا ڈھاکہ میں اس وقت فخر کی بات تھی۔ شعبۂ اردو کے پہلے صدر ڈاکٹر فدا علی خان تھے۔ ان کے بعد اب تک ۲۲ صدور شعبۂ اردو کے گزرے۔ اب شعبۂ اردو میں ۹ اور پارٹ ٹائم ۶ کل ۱۵ اساتذہ ہیں۔ تقریباً 400 طلباء ہیں۔ شعبۂ اردو کے بارے میں "آج کی اردو" سے کچھ ملاحظہ ہو۔

> شعبہ ۱۹۲۱ء میں قائم ہوا۔ اولاً اسکے ساتھ شعبہ فارسی بھی منسلک تھا۔ ۲۰۰۷ء سے شعبۂ اردو علیحدہ شعبہ کی حیثیت سے قائم ہے۔ یہاں چار سالہ بی اے آنرز کی ڈگری کرائی جاتی ہے۔ ایک سالہ ایم اے ہے۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی اس شعبہ سے دیجاتی ہے۔ اس شعبہ میں پندرہ استاد ہیں اور تقریبًا چار سو طلباء اور طالبات ہیں۔ یہ شعبہ کلا بھون (آرٹس بلڈنگ) کی تیسری منزل پر واقع ہے۔ شعبۂ اردو میں اردو ادب اور صحافت پڑھائی جاتی ہے۔[۹]

شعبہ اردو نے اپنے صد سالہ سفر میں بہت سے عالمی شہرت یافتہ، مایہ ناز اردو فضلاء کو جنم دیا۔ یہ سب اپنی اپنی دنیا میں ستارہ امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں۔

ان میں سے چند شخصیات کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ، ڈھاکہ یونیورسٹی۔

۲۔ ڈاکٹر ابوسعید نورالدین۔
۳۔ ڈاکٹر اقبال عظیم۔
۴۔ پروفیسر کلیم سہسرامی، راجشاہی یونیورسٹی۔
۵۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد شمیم خان، راجشاہی یونیورسٹی۔
۶۔ پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈھاکہ یونیورسٹی۔
۷۔ پروفیسر ڈاکٹر ام سلمیٰ، ڈھاکہ یونیورسٹی۔
۸۔ ڈاکٹر کنیز بتول، ڈھاکہ یونیورسٹی۔
۹۔ شمس الحق شیدائی، سیکرٹریٹ ڈھاکہ۔
۱۰۔ جہان آرا چودھری، جگن ناتھ کالج، ڈھاکہ
۱۱۔ ڈاکٹر عبدالحق، راجشاہی یونیورسٹی۔ وغیرہ

شعبہ اردو کو اس صد سالہ سفر طئے کرنے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مختلف مصائب اور اعتراضات کے باوجود شعبہ اردو کا دامن پھیلتا ہی رہا۔ گزشتہ سال 2020 میں گیارہ ممالک کی شرکت سے شعبۂ اردو نے ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اسی سال فضلاء کے اجتماع کا بھی اہتمام کیا گیا۔ یہ فضلاء دن بدن اپنی ذمہ داریوں کا احاطہ بڑھاتے رہے ہیں۔ اکیسویں صدی میں بھی شعبۂ اردو کے طلباء اور فضلاء نے اپنے کو مقتضائے حال کے مطابق تیار کر رہا ہے۔ تاکہ قوم اور ملک کے چیلنجز کا مقابلہ کر سکیں اور اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکیں۔ فضلاء شعبہ اُردو جن جن میدان و مراحل پر اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہیں ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

1۔ علمی خدمات

بنگلہ میں کہا جاتا ہے کہ "শিক্ষা জাতির মেরুদণ্ড" یعنی "تعلیم قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے"۔ تعلیم یافتہ قوم ہی ترقی یافتہ قوم ہوتی ہے۔ تعلیم کے میدان میں جو قوم زیادہ ترقی کرتی ہے وہی قوم زیادہ معزز بھی ہوتی ہے۔ اس لئے دیکھا جاتا ہے کہ ترقی یافتہ قومیں اپنی تعلیم و تربیت میں سب سے زیادہ رقم خرچ کرتی ہیں۔ بنگلہ دیش آج ترقی پذیر ممالک کی قطار میں ہے۔ اس لئے اکیسویں صدی کے چیلنجز مقابلہ کرنے کے لئے تعلیم پر زور دینا ضروری ہے۔

شعبۂ اردو کے فضلاء اپنی ذمہ داریاں مختلف تعلیمی اداروں میں ادا کر رہے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں پڑھاتے ہیں، کالج میں پڑھاتے ہیں، مدارس میں پڑھاتے ہیں۔

شعبۂ اردو کے فضلاء میں سے کلثوم ابوالبشر، شمیم خان، کنیز بتول، زینت آرا شیرازی، ممتاز بیگم، شمیم بانو، جعفر احمد بھویاں وغیرہ گذشتہ صدی سے اپنی اپنی یونیورسٹیوں اور کالج میں پروفیسر رہ چکے ہیں۔ اب اکیسویں صدی میں ڈاکٹر محمود الاسلام، راقم الحروف ڈاکٹر محمد غلام ربانی، ڈاکٹر محمد اسرافیل، ڈاکٹر رشید احمد، غلام مولا، حسین البنا، حفصہ اختر شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کے معلم کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔ کمال بن علی، عبدالحلیم، میر اپروین وغیرہ بی سی ایس (تعلیم) [BCS (Education)] کیڈر کی حیثیت سے ایم سی کالج سلہٹ، کارمائیکل کالج رنگ پور اور مدرسہ عالیہ سلہٹ میں پنی ذمہ داری ادا کر رہیں ہیں۔ ابوذر غفاری کالج میں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کی حیثیت سے لیپی بیگم، ایشٹرن آئی ڈیئل کالج میں ڈاکٹر اے کے ایم امین الحق پرنسپل کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری ادا کر رہیں ہیں۔

اس قوم کو منور کرنے میں شعبہ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ اکیسویں

صدی کے نئی نسل کو تعلیم دینے کے لئے محمد امداد الحق شریف نے ساوار میں یونڈم انٹرنیشنل اسکول قائم کیا۔ روشن آرا، نورالنبی، فرحانہ یاسمین، منہاج الدین، راشدہ اختر روما، فاطمہ اختر، محمد شفیق الاسلام شہاب، شفیق الاسلام، محمد مختار حسین، شمی اختر، مرجان اختر، فاطمہ الزہرا، ڈاکٹر محمد عالمگیر حسین، آئرین انوارہ، ڈاکٹر محمد امین الحق، ڈاکٹر بہار الاسلام، ڈاکٹر مسرور الحق تنویر، عبداللہ المامون، سریتی خاتون، تہمینہ اختر مختلف اسکول اور کالجوں میں ذمہ داری ادا کر کے اکیسویں صدی کے بنگلہ دیش کو آگے بڑھانے میں حصہ لے رہے ہیں۔[۱۰]

الحمد للہ تعلیم میں بنگلہ دیش کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ شعبہ اردو کے فارغ التحصیل فضلاء کی کوششوں سے اور بھی آگے بڑھے گا۔ کیونکہ شعبہ اردو کے طلباء اور فضلاء اپنی مادری زبان بنگلہ پر کافی زور دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر ملکی زبان کی حیثیت سے اردو اور انگریزی سیکھتے ہیں۔ شعبہ اردو کے اساتذہ کو عربی اور فارسی بھی آتی ہے۔ اس لئے اپنے طلباء کی تعلیم دینے میں وہ بھرپور کامیاب رہتے ہیں۔ اس دور میں بیرونی ملک کے زبان سیکھنا رابطہ کے لئے بہت مفید ہے۔ شعبہ اردو کے فضلاء اپنے درسگاہوں میں استعداد کے ساتھ درس و تدریس کی خدمات انجام دے کر اکیسویں صدی کے ایک اہم چیلنج کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

2۔ بطور مترجم

اب ایک لفظ بہت زیادہ ہم سنتے ہیں وہ یہ کہ گلوبال ولیج (Global Village) یعنی پوری دنیا ایک گاؤں جیسی ہے۔ ایک منٹ میں ہم دنیا کے خبریں معلوم کر سکتے ہیں۔ دنیا کے کونے کونے میں کیا کیا ہو رہا ہے وہ ہم ایک کلک سے معلوم کر لیتے ہیں۔ کسی بھی ملک کی بات ہو، کسی بھی زبان کی بات ہو، وہ ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ ہم اپنی مادری زبان میں پڑھ لیتے

ہیں۔اپنی مادری زبان میں انفارمیشن جاننے کے لئے ہم سہارا لیتے ہیں تراجم کا۔مثلاً اگر کوئی خبر جرمن کی ہو وہ پہلے جرمنی زبان میں شائع ہوتی ہے۔پھر اس کو انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔اس کے بعد بنگلہ زبان میں یا اردو زبان میں ترجمہ کیا جاتا ہے۔تو ہم اس طرح سے جرمن کی خبریں اپنی مادری زبان میں پڑھ سکتے ہیں۔

اسی طرح بنگلہ دیش کی کوئی بھی خبر پہلے انگریزی میں ترجمہ ہوتی ہے۔اس کے بعد اس کو اردو، ہندی، نیپالی، عربی وغیرہ زبان میں ترجمہ کر کے بیرونی ملک نشریات سے اس کو مختلف ممالک میں نشر کیا جاتا ہے۔شعبۂ اردو کے تعاون سے، شعبۂ اردو کے طلباء کے ذریعے اب انگریزی کے واسطہ کے بغیر بنگلہ زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔اسی طرح اردو زبان سے بنگلہ زبان میں بھی ترجمہ کا کام ہو رہا ہے۔صرف خبر ہی کا ترجمہ ہوتا ہے ایسا نہیں بلکہ مذہبی کتاب، ادبی کتاب، سائنسی کتاب، قانون وغیرہ کی کتابیں بھی ترجمہ ہو رہی ہیں۔ شعبہ اردو کے طلباء یہ خدمت بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

2007 میں فارغ التحصیل محمد عبدالجلیل اس وقت مملکہ قطر کے سرکاری قانون سینٹر "پابلیک پروسیکیوشن" میں مترجم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔محمد شراف الاسلام بھی مترجم کی حیثیت سے اہم ذمہ داری ادا کی۔عالمی تبلیغی اجتماع میں بھی شعبہ اردو کے طلباء مترجم کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔مختلف کتاب سے ترجمہ کر کے بہت سارے فضلاء بنگلہ ادب کو مزید زینت بخش کر رہے ہیں۔بنگلہ ادب کے مشہور شخصیات ٹیگور، قاضی نذر الاسلام، شمس الرحمن، جسیم الدین وغیرہ کے ادبی شاہکاروں کو اردو میں ترجمہ کر کے ساری دنیا کے اردو داں حضرات کو بنگلہ ادب کا ذائقہ پہنچا رہے ہیں۔

3۔ حکومت کے مختلف اداروں میں اردو طلباء

شعبۂ اردو کے طلباء کو بی اے آنرز اور ایم اے کی سندیں حاصل ہوتی ہیں۔ ان سندوں سے حکومتِ بنگلہ دیش کے مختلف اداروں میں ملازمت کرنے کا انہیں موقع ملتا ہے۔ اس وقت مختلف سرکاری اداروں میں اردو فضلاء اہم ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں۔ کمال حسین سلہٹ کے بیشو ناتھ میں پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے کارکن ہیں۔ کاکولی اختر بی آر بی (BRB) کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔ سائبہ زرین انکم ٹیکس میں، ثریا خاتون محکمہ سماجی خدمات میں، محمد جمال الدین آڈٹ میں، شیخ عین الحق بنگلہ دیش اوپن یونیورسٹی میں، محمد اسماعیل حسین راسل ایمیگریشن میں اور نازنین سلطانہ محکمہ مدرسہ تعلیم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

ساگر احمد، فواد احمد، معین الاسلام وغیرہ بنگلا دیش پولیس میں ایس آئی (SI) کی ذمہ داری ادا کر رہیں ہیں۔ حبیبہ سلطانہ این ایس آئی (NSI) میں ذمہ داری ادا کر رہی ہیں۔[11]

4۔ صحافت اور میڈیا میں اردو فضلاء

صحافی کو 'ملک کا آئینہ' کہا جاتا ہے۔ صحافی ملک کے اچھے اور برے سب حالات کو سب کے سامنے حاضر کرتے ہیں۔ صحافت نگار قوم کو صحیح راہیں دیکھاتے ہیں۔ جو کام برسوں سے نامکمل پڑے رہتے ہے وہ کام ایک ہفتہ میں ہو جاتا ہے جب میڈیا میں اس کا اچھا کاوارز (Coverage) کیا جاتا ہے۔ اس لئے اکیسویں صدی کے چیلنجز مقابلہ کرنے کے لئے صحافت کو آزادی دینا ہوگا اور میڈیا کو اس کی راہ پر چلنے کے لئے چھوڑ دینا ہوگا۔ صحافت اگر صحیح راہ پر گامزن ہوئی تو قوم کو اس سے نور اور روشنی ملتی رہے گی اور اس نور اور روشنی سے ملک کی ترقی ہوگی۔

ترقی کی اس راہ میں شعبۂ اردو کے طلباء بھی گامزن ہیں۔میڈیا میں جنت الفردوس مومو کام کر رہی ہے۔ وہ دیپتو ٹی وی (Depto TV) میں ہیں۔ان کے ساتھ ابراہیم، اورنسرین بھی ہیں۔ جنت الفردوس اینی بھی میڈیا میں تھی۔محمد منیر الاسلام روزنامہ "مانوب زمین" (দৈনিক মানব জমিন) میں کام کرتے ہیں، مائید الاسلام روزنامہ "اتفاق" (দৈনিক ইত্তেফাক) میں کام کرتے ہیں، اسم اعظم روزنامہ بنیک برتا (দৈনিক বণিক বার্তা) میں رپورٹر ہیں۔ شہید اللہ شاہ نور روزنامہ "جاگو پرتیدن" (দৈনিক জাগো প্রতিদিন) کے مدیر ہیں۔محمد عالمگیر روزنامہ "مون" (The Daily Moon) کے مدیر اور ناشر ہیں۔

راقم الحروف پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی بھی ماہنامہ "آدرش ناری"، ماہنامہ "رحمانی پیغام" اور ماہنامہ "کعبر پوتھے" وغیرہ کے ادارت کی ذمہ داری ایک زمانہ تک سنبھالی۔ فی الحال ملک و بیرونی ملک کے مختلف اخباروں میں خبریں ارسال کرنے کا کام کرتے ہیں۔اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو کے مدیر ہیں۔

دوسری طرف بے تار بنگلہ دیش (Radio Bangladesh) میں محمد عنایت اللہ صدیقی، عبدالسلام، نورالنبی، فرحانہ اختر مسٹی، جنت الفردوس مومو، محمد شفیق الحسن شہاب، حبیب الرحمٰن وغیرہ صحافت کا کام کر رہے ہیں۔اردو زبان میں بنگلہ دیش کی کچھ اہم خبریں پڑھتے ہیں۔یہ ایف ایم ریڈیو میں نشریات ہوتی ہے۔ بنگلہ دیش کے بارے میں دنیا والوں کو باخبر کرنے میں شعبۂ اردو کے یہ سب طلباء اہم ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں۔

5۔ سیاسی میدان میں شعبۂ اردو کے فضلاء

بنگلہ دیش میں جمہوری حکومت ہے۔ سیاست کے نام پر لوگ الگ الگ راہیں اختیار کرتے ہیں۔ سیاست میں تقسیم بندی کے باوجود شعبۂ اردو کے اکثر طلباء اپنے اپنے پسندیدہ سیاسی مسلک پر چلتے ہیں۔ کوئی تو عوامی لیگ کی چھاترا لیگ کرتے ہیں اور کوئی چھاترا دل کرتے ہیں جو بی این پی کے طلباء گروہ ہے۔ ایک ہی کلاس میں دو مخالفین گروہ کے طلباء موجود ہونے کے باوجود آپس میں مل جل کر چلتے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے مختلف رہائشی ہال میں شعبہ اردو کے طلباء اور طالبات اپنی سیاسی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔ رقیہ ہال میں لیپی اختر چھاترا لیگ کی صدر رہی اور فی الحال سر ایف اے رحمان ہال میں سٹوڈینٹ لیگ کے سیکرٹری منتخب ہوئے ہیں منعم شہریار مون۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے مرکزی اسٹوڈنٹ یونین (Dhaka University Central Students Union, DUCSU) میں بھی لیپی اختر نے اپنی ذمہ داری ادا کی۔ صفیہ کمال ہال میں دوتی آرنا چودھری منتخب ہوئی اور ذمہ داری ادا کی۔

صدیقی نجم العالم چھاترا لیگ (BSL) میں مرکزی کمیٹی کے سیکرٹری رہے پانچ سال۔ محمد مہید الاسلام ہیرو نے ڈھاکہ یونیورسٹی چھاترا دل کے صدر رہے۔ فی الحال جاسد طلباء لیگ کے سیکرٹری بھی شعبۂ اردو کے طالب علم مسعود العالم ہیں۔

اس کے علاوہ امیر امجد منا، محمد شفیع الاسلام، محمد شریف الاسلام تعلقہ دار، ساجد حسن بابو، ابو سعید، محبوب الرحمان میٹھون، محمد امین الاسلام، محمد عطاء الغنی، محمد وجیہ الزمان، سہیل احمد، ماشئ الرحمٰن طارق، محمد راشد الاسلام راشد، پلاش شکدار، نور النہار پولی، ابراہیم خلیل، امر القیصر وغیرہ سیاست کے ساتھ وابستہ ہیں۔

6۔ سماجی فلاح و بہبودی میں

شعبہ اردو کے طلباء سماج کی فلاح اور بہبودی میں بھی کام کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں سیلاب، طوفان، کرونا وغیرہ کی مصیبت میں شعبہ اردو کے طلباء اپنے تعاون اور امداد کی چادر پھیلا دیتے ہیں۔ سردی میں کپڑے تقسیم کرتے ہیں۔ غریب طالب علموں کی مدد کرتے ہیں۔ غریب و نادار طلباء کی فیملی کی آمدنی کے بندوبست بھی کر دیتے ہیں۔ سماج کی فلاح کے لئے جو بھی کام مناسب ہو اس میں حصہ لینے میں شعبہ اردو کے طلباء کبھی پیچھے نہیں رہتے ہیں۔ پروفیسر جعفر احمد بھوئیاں، راقم الحروف پروفیسر غلام ربانی، رشید احمد، حسین البنا، غلام مولا، حفصہ اختر، عنایت اللہ صدیقی، عبدالجلیل، امداد الحق شریف، ہمایون کبیر، ماشئ الرحمن، محمد شراف الاسلام، محمد اختر الزمان، ممتاز بیگم، حبیب الرحمن ہیرو، محمد میزان الرحمن، محمد حفیظ الرحمن، محمد حبیب الرحمان وغیرہ وقتاً فوقتاً سماج کی فلاح و بہبودی میں حصہ لیتے ہیں۔

7۔ تجارت

ملک کی ترقی میں تجارت کا ایک اہم رول ہے۔ غیر ملکی لوگوں کے ساتھ تجارت سے ملک کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔ تجارت میں شعبہ اردو کے فارغین بھی شامل ہوئے ہیں۔ اس میں محمد ہمایون کبیر بہت آگے بڑھ رہے ہیں۔ محمد شریف الاسلام، شراف الاسلام، محمد نور بخش، محمد جمیل احمد، سیف الدین شوو، فیض احمد، محمد معصوم باللہ، عنایت اللہ صدیقی، مشرف حسین، محمد حفیظ الرحمن، علی اشرف صدیقی، ابو صائم خان، محمد مجیب الرحمن، قاضی محمد مظہر الحق وغیرہ تجارت کر رہے ہیں۔ تجارت کے ذریعہ انشاءاللہ یہ طلبہ اکیسویں صدی کی حاجات کو پورا کریں گے۔

8۔ بینک میں

ملک کی معاشی ترقی میں بنک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ملک کے شعبہ بنک میں شعبہ اُردو کے سو سے زائد طالب علم اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں۔ سلمٰی خاتون، حبیب اللہ مصباح اور راسل احمد سونالی بینک (Sonali Bank) میں، سوجن ملا این آر بی بینک (NRB Bank) میں، عبداللہ المامون آگرونی بینک میں، مفخر الحسن فجار ڈاچ بنگلہ بینک (Dutch Bangla Bank) میں ملازم ہیں۔ جانتا بینک (Janata Bank) میں سلمٰی اختر رنی، محمد مشرفی بن جلال، اسلامی بینک بنگلا دیش (Islami Bank Bangladesh) میں ڈاکٹر محمد نور الاسلام، محمد لقمان حاکم اور شمس النہار جیمی، کریشی بینک میں مہدی حسن وغیرہ اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔

9۔ ثقافت

اردو کی ایک الگ تہذیب اور ثقافت ہے۔ اسی طرح بنگلہ کی بھی اپنی تہذیب اور ثقافت ہے، جو کچھ الگ ہے۔ جیسے اردو مشاعرہ جب ہوتا ہے تو شاعر کے ہر مصرع کو سامعین بہت غور سے سنتے ہیں اور اپنی زبان میں دہراتے ہیں۔ کبھی کبھی "واہ-واہ"، " کیا بات ہے!"، " زبردست "اس طرح کے تاثراتی الفاظ سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن جب بنگلہ زبان میں کوئی شعر پیش کیا جاتا ہے تو سامعین اسے محظوظ ہو کر سنتے ہیں۔ اپنے دل اور دماغ میں اس کو بیٹھا لیتے ہیں۔ اس سے کیا تعلیم ملی ہے اس کو ذہن نشی کرتے ہیں۔ نظم ختم ہونے پر تالیاں بجاتے ہیں۔ اس دو زبان کی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے شعبۂ اردو کے طلباء بنگلہ اردو مشاعرہ کا انتظام کرتے ہیں۔

محمد عنایت اللہ صدیقی اور دیگر طلباء اس طرح کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ جاسیہ علی، رینا اختر اور معصومہ نے بھی اس میدان میں اپنا نام لکھوائے ہیں۔ اردو سے بنگلہ زبان میں ڈرامہ کی ڈاونگ (Dubbing) کرنے میں جنت الفردوس مومو، نسرین، ابراہیم خلیل وغیرہ بہت مصروف کار ہیں۔ ان سب طالب علموں نے ثابت کر دیا کہ اردو میں علوم وفنون کا بڑا ذخیرہ ہے۔ اور اس کو بنگلہ زبان میں پیش کر کے ناظرین کی چاہت پوری کی جا سکتی ہیں۔ اکیسویں صدی کے ''ثقافتی مبادلہ'' (Cultural Exchange) کے دور میں شعبہ اردو کے فضلاء اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

10۔ کھیل کود

شعبۂ اردو تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کے کھیل کود پر بھی بہت زور دیتے ہیں۔ فٹبال، کرکٹ، باسکٹ بال وغیرہ کھیل میں بارہا فتح بھی حاصل کی ہے۔ شعبۂ اردو کے طلباء میں کئی کھیلاڑی ہے جنہوں نے قومی ٹیم میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ مہدی حسن، سعید الرحمٰن ٹیپو، محمود الحسن رضا، کمال بن علی، شریف الاسلام، عمر فاروق، شاہین عالم، توفیق الاسلام شاہین، بلال حسین، عمران حسین وغیرہ کھیل کود کے میدان میں شعبہ اردو کا نام آگے بڑھانے میں کامیاب رہے ہیں۔ مائید الاسلام بابو روزنامہ ''اتفاق'' کے کھیل کود صفحہ میں خبریں لکھتے ہیں۔

11۔ قانون کا پیشہ

ملک میں انصاف قائم کرنے کے لئے جج اور وکیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ شعبہ اردو سے جج

بننے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن شعبہ اردو میں پڑھنے کے بعد پھر قانون پر ڈگری حاصل کر کے بہت سے فاضلِ اردو نے قانون کا پیشہ اختیار کیا ہے۔ اردو کے مشہور شاعر علامہ اقبال کا پیشہ بیرسٹری تھا۔ اسی طرح ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایس ایم معین الکریم شعبہ اردو سے بی اے آنرز کرنے کے بعد برطانیہ سے بیرسٹری کی ڈگری بھی حاصل کی۔ اب وہ ڈھاکہ سپریم کورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالسلام بھی شعبہ اردو سے ایم اے کرنے کے بعد کالج سے ایل ایل بی کر کے اب کورٹ میں وکالتی کرتے ہیں۔

شعبہ اردو کے زیر تحصیل اور فارغ التحصیل طلباء استعداد اور قابلیت میں نمایاں ہیں لیکن چونکہ بنگلہ دیش میں اردو ماحول بہت کم ہے۔ اس لئے فضلاء اپنی کسب حلال کے لئے مختلف فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ سب فرائض ادا کرتے ہوئے وہ اکیسویں صدی کے چیلینجز کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح یہ سب فضلاء سو سال سے ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ شعبہ اردو کے فضلاء اور بھی اہم کاموں میں اپنی صلاحیت کو اجاگر کریں گے۔

حوالہ جات

۱۔ انوپم حیات، نواب پر بیبار ایر ڈائری تے ڈھاکر سماج و سنسکریتی، ڈھاکہ: بنگلہ دیش کو اپارٹو بک سوسائٹی، دسمبر 2001-ص ۶۲

۲۔ محمد اشرف الاسلام، ڈھاکہ یونیورسٹی اور علاقے کی تاریخ۔ خوش روز کتاب محل، ڈھاکہ، دسمبر 2014، ص ۱۹۵

۳۔ ایضاً،ص۱۹۶

4. 45th Convocation, 2009, P 19
5. 51th Convocation Souvenir, Dhaka University, 2018, P18

۶۔ ڈھاکہ یونیورسٹی دیبس یادگار،ڈھاکہ یونیورسٹی،۱ جولائی ۲۰۲۰،ص۴

7. 44th Convocation, 2008, P 20

۸۔ ڈھاکہ کے نواب فیملی ممبر سے گفتگو۔

۹۔ پروفیسر ڈاکٹر مفتی محمد غلام ربانی، آج کی اردو، ساہتیہ و گیشنا کندرا، ڈھاکہ، تیسرا ایڈیشن،۲۰۲۱،ص۲۱

۱۰۔ پروفیسر ڈاکٹر مفتی محمد غلام ربانی،شعبہ اردو کے فضلاء اجتماع یادگار،۲۰۲۰

۱۱۔ ایضاً۔

سو سال اور مشاہیر شعبۂ اردو

ڈاکٹر رشید احمد

Abstract

Dhaka University, the Oxford of the East, after overcoming various obstacles, the university got off to a good start on July 1, 1921. It started the journey with 12 departments, of which Urdu was worth mentioning. The Nawab family of Dhaka was the ruler of this region at that time. Their family language was Urdu. As a result, Urdu was a very familiar language to the common city dwellers. Being the language of the Nawab family, Urdu was also revered by the aristocrat people of various ancient cities and towns of the region. Chittagong and Sylhet were the cities after Dhaka. That's why Urdu was able to take its honorable place among the twelve selected departments of Dhaka University, known as the 'Oxford of the East'. The golden history of her hundred years of proud endurance bears witness to the arrival of Mahiruh in this section from the auspicious time of its establishment to the auspicious moment of its 100th anniversary)Thursday, July 1, 2021(Some of the most notable among them are-Khan Bahadur Feda Ali Khan, Dr. Moidul Islam Bora, S. M. Z. H. Azad,Prof. Wajahat Hussain Andalib Shadani, Aftab

---

شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

Ahmed Siddiqui;Fayez Ahmad Chaudhury, Rustam Ali Dewan, Professor Dr. Muhammad Abdullah, Professor Dr. Umme Salma, Professor Dr. Kaniz -E-Batul etc. Our aim is to give a brief introduction of them and a brief account of their contribution to the Urdu department in the present article.

ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام اور شعبۂ اردو کی ابتداء

ڈھاکہ یونورسٹی کا قیام اور شعبۂ اردو کی ابتداء چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پہلا جولائی ۱۹۲۱ء جو ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا پہلا دن ہے وہی شعبۂ اردو کے قیام کا بھی پہلا دن ہے۔ مسٹر پی، جے .ہارٹوگ (Mr. Philip Joseph Hartog) اس یونیورسٹی کے اولین وائس چانسلر تھے۔ قیام ڈھاکہ یونیورسٹی کے ابتدائی مرحلے میں اس کی صرف تین فیکلٹیاں (Faculties) تھیں۔ فیکلٹی آف آرٹس (Arts)، فیکلٹی آف سائنس (Science) اور فیکلٹی آف قانون (Faculty of Law)۔ فیکلٹی آف آرٹس نے جن چند شعبوں کو لے کر اپنی کاروائیاں شروع کیں ان میں اس وقت کا شعبۂ اردو و فارسی ایک قابل ذکر شعبہ تھا۔ سابق مشرقی بنگال کے لئے وہ دن ایک مبارک یادگار وقت ہے جس کی بناء پر آگے چل کر اس خطے کے تعلیمی حالات، خواہ دینی ہوں یا مادّی اور یہاں کی تہذیب، تمدن اور ثقافت روز افزوں ترقی کی راہ پر گامزن ہونے لگیں۔ یہاں کے عوام بیدار ہونے لگے۔ ہر قسم کے اور ہر طبقہ کے تعلیمی اداروں میں رونق آنے لگا۔ مغربی بنگال کے جو حاسدین یہاں کے عوام کو پسماندگی کا طعنہ دیتے ہوئے قیام ڈھاکہ یونیورسٹی کے مخالف تھے وہ بھی اب حیران رہ گئے، خصوصاً وہ وقت ان حاسدین کو کیسا لگا ہوگا! وہ تو خدا ہی بہتر جانے جبکہ ان کی "ناخواستہ" اس یونیورسٹی کو "آکسفورڈ آف ایسٹ" کا نام وخطاب بھی ملا تھا![1]

غرض بیداری اور ترقی کا جو سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا، آگے چل کر اسی سے انگیزوں کی

غلامی سے آزادی کی فکر ابھری، یہاں کے عوام کے دلوں میں ایک نئی امنگ، جذبہ اور ولولہ پیدا ہوا اور نتیجہ میں ان کے شکنجہ سے چھٹکارا ملا اور پھر بعد میں مغربی پاکستان کی ظالم قیادت کے ہاتھ سے بھی نجات ملی۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا مقصد

اس موقع پر قیامِ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ابتدائی مرحلے کی تاریخ کی اوراق گردانی بھی خالی از فائدہ نہ ہوگی۔ خصوصاً یہاں کے جو باشندے آج اس یونیورسٹی سے براہِ راست فائدہ اٹھا رہے ہیں ان کے لئے تو تاریخ کے وہ اوراق ان کے روشن مستقبل کے لئے مشعلِ راہ بنیں گے۔ جبکہ علمِ تاریخ کا مقصد بھی یہی ہے کہ ماضی کے واقعات سے مستقبل کے لئے عبرت حاصل کی جائے۔ اس ضمن میں یہاں پایۂ تخت ڈھاکہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے مقصدِ قیام کا ذکر کردینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ چنانچہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا اولین مقصد اس خطے کے باشندوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں پیدا کرنا تھا، جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر " یکم جولائی ۱۹۲۱ میں مشرقی بنگال کی راجدھانی ڈھاکا میں، ڈھاکا یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس یونیورسٹی کا سب سے اہم مقصد مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنا اور ایک نئے طرز کی رہائشی یونیورسٹی قائم کرنا، جو ہندوستان کی موجودہ یونیورسیٹیوں سے جدا ہو، اس کے علاوہ کلکتہ یونیورسٹی پر اس وقت جو تعلیم کا زبردست بوجھ لدا ہوا تھا، اسے حتی الامکان طریقے سے کم کرنا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ چند سالوں تک اس شعبہ کا نصاب تعلیم دیگر شعبوں کی طرح کلکتہ یونیورسٹی کے نصابِ تعلیم پر مبنی تھا۔ غرض انہیں چند مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈھاکہ یونیورسٹی نے اپنے تعلیمی سال کا آغاز کیا"۔[2]

درحقیقت قیامِ ڈھاکہ یونیورسٹی کا واقعہ جولائی ۱۹۰۵ء میں مسلمانوں کی چاہت کے مطابق

ہندوستان کے حکمران انگریزوں کی جانب سے "بنگو بھنگو" بل کو پاس کر دینے کا ایک اچھا نتیجہ تھا، جسے حاسدین اور خودغرض گنے چنے چند افراد برداشت کر نہ سکے اور اس کے خلاف فوری ردّعمل کے طور پر انہوں نے "بنگو بھنگو ردّ" کی آواز اٹھائی، اور پھر ۱۹۱۱ء کی ۱۲ دسمبر کو ان کی "بنگو بھنگو ردّ" تحریک بظاہر کامیاب بھی ہوئی۔ لیکن حاسدین اس کے اوّلین نیک نتیجے کو مٹا نہ سکے اور مشرقی بنگال کے پایۂ تخت میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آ ہی گیا۔ جو اوّلاً "بنگو بھنگو" اور پھر "بنگو بھنگو ردّ" ہی کا نیک فال تھا۔

مشرقی بنگال کے اس وقت کے تعلیمی حالات پر نظر ڈالنے سے دیکھا جاتا ہے کہ ۱۹۰۵ء میں تقسیمِ بنگال کے وقت نئے بننے والے "مشرقی بنگال" نامی اس صوبے میں پرائیویٹ سکولوں کے علاوہ ایک بھی پرائمری سکول نہیں تھا۔ درحقیقت نئے بننے والے "صوبۂ مشرقی بنگال" میں پرائمری تعلیم کی بنیاد تقسیمِ بنگال کے بعد رکھی گئی اور زود ترقی کا ایک حیران کُن سلسلہ چلتا رہا۔ چنانچہ ایک حساب کے مطابق مکاتب کی تعداد ۸۔۱۹۰۷ء میں ۱۲۹۹ سے بڑھ کر ۱۲۔۱۹۱۱ء میں ۱۵۷۸۴ ہوگئی اور ان پانچ سالوں میں مکتب کے طلبہ کی تعداد ۴۰۱۸۸ سے بڑھ کر ۵۴۷۰۳ ہوگئی۔ اس وقت کے حالات اور تقاضا کے پیشِ نظر مشرقی بنگال اور آسام کی حکومتوں نے مسلم طلبہ کے لیے خصوصی اسکالرشپ کا انتظام کیا ہے اور اسکالرشپ کی تعداد میں بھی اضافہ کیا۔ اسی دوران تقریباً ہر کالج اور سکول میں ہوسٹل قائم ہوئے۔ بنگال کی تقسیم کے وقت مسلمان اساتذہ اور سب انسپکٹر کی یہ تعداد تقریباً صفر تھی لیکن ۱۹۱۲ء تک مسلم سب انسپکٹرز کی تعداد ۱۱۴ اور اساتذہ کی تعداد ۱۴۳۵۶ ہوگئی۔ لیکن بنگال کی تقسیم اور مشرقی بنگال اور آسام کی صوبائیت کو دہلی کے ایک خاص دربار میں یکم نومبر اور ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء میں ایک اعلان کے ذریعے ختم کر دیا گیا۔ ورنہ ڈھاکہ میں یونیورسٹی کا قیام نئے بننے والے اس صوبے کے محکمۂ تعلیم میں ہونے والی پیش رفت کا فطری نتیجہ ہوتا۔ تقسیمِ بنگال کے ردّ کے بعد، وائسرائے لارڈ ہارڈنگز نے جنوری ۱۹۱۲ء کے آخر میں مشرقی بنگال اور آسام کا دورہ کیا۔ انہوں نے ۳۱ جنوری

کو ڈھاکہ میں ایک وفد سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ " گذشتہ چند سالوں میں مشرقی بنگال کے محکمۂ تعلیم میں جو ترقی آئی اس سے حکومتِ ہندوستان خوش ہے اور ہندوستان کے سکریٹری کے پاس وہ ڈھاکہ میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور مشرقی بنگال کی تعلیمی ترقی کے لئے ایک خاص افسر کے تقرر کے لئے سفارش کرے گی"۔ لارڈ ہارڈنگز کے ڈھاکہ کے دورے کے بعد کلکتہ واپس جانے کے بعد ایک وفد ڈاکٹر راش بہاری کی قیادت میں ان کے پاس آیا اور ۱۶ فروری ۱۹۱۲ء کو راش بہاری گھوش نے ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات میں انہوں نے ڈھاکہ میں یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت میں ایک یادداشت پیش کی۔ لارڈ ہارڈنگز نے وفد کو تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ اگر ڈھاکہ میں یونیورسٹی قائم بھی کی جائے تو وہ مسلم یونیورسٹی نہیں بلکہ ایک عام یونیورسٹی ہوگی۔ غرض اس وقت بنگال کی تقسیم کے ردّ کے معاوضے کے طور پر ڈھاکہ میں یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز پکی ہوئی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر بنگال کی تقسیم کو ردّ نہ کیا جاتا تو جس طرح ڈھاکہ میں یونیورسٹی کا قیام ناگزیر تھا، اسی طرح ردِّ تقسیمِ بنگال کے بعد بھی اس یونیورسٹی کا قیام ناگزیر ہوگیا، ردِّ تقسیم کے وقت اس خطے کے مسلمانوں کو اسی کی آس دلائی گئی تھی۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بنگال کی پہلی تقسیم اور پھر اس تقسیم کے خاتمے کی وجہ سے تلافیٔ نقصان کے طور پر ڈھاکہ میں ایک یونیورسٹی کا قیام ایک ناگزیر امر بن چکا تھا۔ چنانچہ یہ بھی دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تقسیمِ بنگال اگر نہ ہوتی اور پھر ردِّ تقسیم نہ ہوتا تو ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام بھی نہ ہوتا۔

پایۂ تخت ڈھاکہ میں یونیورسٹی کے قیام کی منصوبہ بندی نیز ڈھاکہ یونیورسٹی کے سلسلے میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی سفارش کے باوجود اس میں تاخیر کی وجہ بیان کرتے ہوئے "ڈھاکہ ' رگوتھا " کے محترم مصنف رفیق الاسلام لکھتے ہیں:

"اس وقت کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے سفارش کی تھی کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے کونسل ہاؤس کے پانچ

میل کے دائرے کو ڈھاکہ یونیورسٹی کا حصہ سمجھا جائے۔ ڈھاکہ میں مجوزہ یونیورسٹی کے بارے میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کی تیرہ سفارشات، کچھ ترامیم کے ساتھ ۱۹۲۰ء کی ہندوستانی قانون ساز اسمبلی میں ڈھاکہ یونیورسٹی ایکٹ کے طور پر منظور کی گئی تھیں اور ۲۳ مارچ ۱۹۲۰ء میں گورنر جنرل نے ان کی منظوری دی تھی"۔

اس سلسلہ میں موصوف مزید لکھتے ہیں:

> "ڈھاکہ میں یونیورسٹی کے قیام کی منصوبہ بندی کے لیے مئی ۱۹۱۲ء میں ناتھن کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے لئے حکومت ہند کی طرف سے درج ذیل سرگرمیوں کا خاکہ مقرر کر دیا گیا تھا کہ: مجوزہ یونیورسٹی تعلیمی اور رہائشی ہوگی نہ کہ وفاقی یا مرکزی۔ ڈھاکہ شہر کے اندر کے کالجز اس یونیورسٹی کے ماتحت ہونگے، ڈھاکہ شہر سے باہر کے کالجز نہیں۔ ناتھن کمیٹی نے کل ۲۵ ذیلی کمیٹیوں کی سفارش کی بنا پر اپنی رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ میں یونیورسٹی کی تعمیر پر ۵۳ لاکھ روپے اور ۱۲ لاکھ روپے سالانہ لاگت کا تخمینہ لگایا گیا تھا۔ ناتھن کمیٹی نے تجویز پیش کی کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کو حکومت کے زیر انتظام سٹیٹ یونیورسٹی قرار دیا جاوے اور سرکاری ملازمین کے ذریعے اسے چلایا جاوے۔ ناتھن کمیٹی اس حق میں تھی کہ ڈھاکہ شہر کے کالجوں کو اس مجوزہ یونیورسٹی کی رہائشی اکائیوں یعنی یونٹوں کے طور پر غور کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس یونیورسٹی میں سائنس، انجینئرنگ، قانون، طب، اسلامیات، آرٹس، اور نیز سائنس میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا نظام بھی شامل کیا جاوے"۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام میں تاخیر کی ایک اور وجہ بیان کرتے ہوئے اور کلکتہ یونیورسٹی کے

منتظمین کی مخالفت کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے رفیق الاسلام رقمطراز ہیں:

"ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام میں تاخیر کی وجہ صرف پہلی جنگِ عظیم یا حکومت ہند کی انتظامی سرخ فیتہ والی سرگرمی ہی نہیں تھی بلکہ غیر منقسم بنگال میں دوسری یونیورسٹی کے قیام میں کلکتہ یونیورسٹی کے منتظمین کی مخالفت اور دشمنی بھی اس کی بڑی وجہ ہے۔ ڈاکٹر راش بہاری گھوش کی مخالفت کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ لیکن ڈھاکہ میں یونیورسٹی کے قیام کے سخت ترین مخالف سر آشوتوش مکھر جی اور سُر ندر ناتھ بنر جی تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک زمانے کے وائس چانسلر ڈاکٹر رمیش چندر مجموعہدار نے اپنے مضمون "ڈھاکہ کی یادیں" میں لکھا ہے کہ لارڈ ہارڈنگز نے سر آشوتوش مکھر جی کو بتایا تھا کہ وہ ڈھاکہ میں یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے پرعزم ہیں۔ آخر میں، آشوتوش مکھر جی نے کلکتہ یونیورسٹی کے لیے چار نئے پروفیسرز کا تبادلہ کر کے اپنی مخالفت ختم کی۔ آشوتوش مکھر جی خود کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے رکن تھے، جس کمیشن کی تجویز پر جولائی ۱۹۲۱ء میں قیام ڈھاکہ یونیورسٹی عمل میں آیا۔ اس یونیورسٹی کا پہلا وائس چانسلر یونیورسٹی آف لندن کے اکیڈمک رجسٹرار فلپ جیکوب ہارٹوگ کو مقرر کیا گیا۔ یونیورسٹی کی تعلیمی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز یکم جولائی ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ تین رہائشی ہالوں سمیت یونیورسٹی کی کارروائیاں شروع ہونے کے بعد مسلم ہال، ڈھاکہ ہال اور جگن ناتھ ہال میں بالترتیب ۱۸۷، ۳۸۶، اور ۳۱۳ مجموعہ ۸۷۷ طلبہ ستمبر مہینہ کے پہلے ہفتے تک ہو گئے تھے"۔ 3

جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا، نیز اس خطے کے اربابِ علم و دانش بھی بخوبی جانتے ہیں کہ جن بارہ ابتدائی شعبوں کو لے کر ڈھاکہ یونیورسٹی اپنے تعلیمی دور کا آغاز کیا، خوش قسمتی سے ان میں سے ایک آج کا شعبۂ اردو (Department of Urdu) بھی شامل تھا۔ البتہ اُس وقت شعبۂ اردو اور شعبۂ فارسی مشترکہ شعبے تھے۔ یہاں ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ابتدائی ادوار میں ایک طویل عرصے تک اس مشترکہ شعبہ کے فارسی پڑھنے والے طلبہ اردو کو

اختیاری (Subsidiary) طور پر اور بالعکس اردو پڑھنے والے طلبہ فارسی کو اختیاری (Subsidiary) طور پر پڑھا کرتے تھے۔اس کے بعد حال ہی میں چند سال پہلے یعنی سن ۲۰۰۷ء میں یہ دونوں شعبے الگ ہوئے اور اپنی الگ الگ شناخت وحیثیت بحال کی۔ اُس وقت یعنی تقسیمِ شعبہ کے دوران شعبۂ اردو کے اساتذہ کی تعداد سات تھی اور ان کے نام یہ ہیں: محترمہ پروفیسر ڈاکٹر ام سلمٰی، ڈاکٹر کنیز بتول، ڈاکٹر زینت آرا شیرازی، ڈاکٹر جعفر احمد بھوئیاں، ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، جناب محمد غلام ربانی اور جناب محمد اسرافیل۔ تقسیم شعبہ کے بعد پہلی بار اس شعبہ میں سن ۲۰۰۸ء میں اور دو اساتذہ کا تقرر ہوا، ان میں ایک راقم الحروف رشید احمد اور دوسرے جناب غلام مولا ہیں۔ پھر سن ۲۰۱۲ء میں اور دو (۲) اساتذہ اس شعبہ کے ساتھ منسلک ہوئے، وہ ہیں جناب حسین البناء اور مسز حفصہ اختر۔ اس کے بعد سب سے اخیر میں راجشاہی یونیورسٹی کے شعبۂ السنہ کے سابق پروفیسر ڈاکٹر رضاء الکریم ۲۰۱۴ء میں اس کے ساتھ بطور ایسوسیٹ پروفیسر منسلک ہوئے۔ ان میں سے اول الذکر دو خواتین پروفیسر یعنی ڈاکٹر ام سلمٰی اور ڈاکٹر کنیز بتول اللہ تعالیٰ کی پیاری ہو چکیں اور پروفیسر ڈاکٹر زینت آرا شیرازی ابھی چند سال سے ریٹائرمنٹ میں گئی ہوئی ہیں اور ماشاء اللہ محترمہ ابھی حینِ حیات ہیں۔ چنانچہ اب کل ۹ اساتذہ شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی میں باضابطہ طور پر اردو کی تدریسی خدمات انجام دیئے جا رہے ہیں۔ یہ ہے فی زمانہ شعبۂ اردو کے اساتذہ کا مختصر جائزہ۔

ذیل میں ۱۹۲۱ء سے اب تک کے چند اہم مشاہیر شعبۂ اردو اور ان کے کارنامے قارئین کے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں۔

چند اہم مشاہیر شعبۂ اردو اور ان کے مختصر کارنامے

یہاں جن اہم مشاہیرِ شعبۂ اردو اور ان کے مختصر کارنامے ناظرین کے پیش خدمت ہیں وہ ہیں

خان بہادر فدا علی خان، ڈاکٹر معید الاسلام بوڑا، ایس ایم زیڈ ایچ آزاد، پروفیسر ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، ڈاکٹر حنیف فوق قریشی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر طاہر فاروقی، ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر فیض احمد چودھری، پروفیسر رستم علی دیوان، پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ، پروفیسر ڈاکٹر ام سلمیٰ اور پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول۔ یہ وہ حضرات وخواتین ہیں، ڈھاکہ یونیورسٹی شعبۂ اردو میں جن کے کارنامے روز روشن کی طرح درخشندہ ہیں۔ چنانچہ یہاں ان کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی سے متعلق ان کے کارنامے اجاگر کرنا ہمارا اصل مقصد ہے۔

خان بہادر فدا علی خان

مرحوم خان بہادر فدا علی خان صاحب کی پیدائش ۱۸۷۰ء میں ہندوستان کے مشہور ضلع شہر رامپور میں ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن رامپور میں حاصل کی۔ پھر علی گڑھ محمڈن کالج سے انٹر اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں موصوف نے کلکتہ یونیورسٹی سے عربی اور فارسی میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔

۱۹۲۱ء میں مرحوم فدا علی خان کا تقرر ڈھاکہ یونیورسٹی شعبۂ اردو و فارسی کے اولین صدر اور ریڈر کی حیثیت سے ہوا۔ اس سے پہلے آپ ڈھاکہ کالج میں بھی استاد رہ چکے تھے۔ اپنی تعلیمی لیاقت واستعداد کی بدولت ۱۳ جنوری ۱۹۳۴ء تا ۲۷ اپریل ۱۹۳۵ء ڈھاکہ یونیورسٹی آرٹس فیکلٹی کے ڈین بننے کا شرف بھی انہیں حاصل ہوا۔ چند سال پروکٹر کے عہدے پر بھی فرائض منصبی ادا کئے۔ جولائی ۱۹۲۳ء تا اکتوبر ۱۹۲۴ء Acting صدر کے طور پر شعبۂ عربی اور اسلامک اسٹڈیز میں بھی آپ نے خدمات انجام دیں۔ آپ قیام شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کے شروع سے ۳۰ جون ۱۹۳۵ء تک چودہ سال کا ایک طویل عرصہ اس شعبہ کے صدر رہے۔ [۴]

اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ بنگلہ زبان پر انھیں کافی عبور حاصل تھا۔ مشہور بنگالی ادیب بنکم

چٹرجی کے ناول "وِش برکھا" کا اردو ترجمہ انہوں نے "بس کا روکھ" یا "زہریلا درخت" کے نام سے کیا۔ اس کتاب کے سرورق میں یوں لکھا تھا:

اس ترجمہ کو انجام دینے کی اصل وجہ اور غرض وغایت کیا ہے؟ اس کو اجاگر کرتے ہوئے خان صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کو حضراتِ قارئین کے معلومات میں ایک مفید اضافہ خیال کرتے ہوئے یہاں پیش کیا جارہا ہے:

> اپنے مونھ، میاں مٹھو بننا جیسا برا ھے ہر ایک جانتا ھے۔ ھم یہاں اپنے ناچیز ترجمہ کے نہ گیت گانا چاھین نہ منگل۔ فقط اتنا ھی کہنا چاھتے ھیں کہ ھم نے اس پر کیون ھاتھ ڈالا جبکہ اس ناول کا ترجمہ اس سے پہلے ہی اردو میں ھو چکا ھے اور وہ ترجمہ اگر چہ آنکھ سے تو نہیں دیکھا مگر کانون سے سنا ھے کہ بہت اچھا ھے۔ اور جو چیز آنکھوں دیکھی ہی نہیں اوس سے ہم اپنے مال کو نہ اچھا بتا سکتے ھین نہ بتانا چاھتے ھین۔ بات اتنی ہے کہ ہم نے یہ کام نہ کسی کی ریس سے کیا ھے نہ کسی کا مونہہ چڑانے کے لئے نہ اپنی واہ واہ کرانی ہے۔ بلکہ یہہ دکھانا ھے کہ اگر ہندو مسلمان اپنی اپنی ھٹ چھوڑ دین نہ ھندو سنسکرت پراکرت اور بھاکھا کی بھرمار کرین نہ مسلمان عربی فارسی کی بوچھار، تو اردو بغیر ہلدی پھٹکڑی لگے سارے دیس کی زبان بن سکتی ہے۔ یہ تو سب ھی جی سے چاھتے ھین کہ سارے ملک کی زبان ایک ھو جاے مگر جو چیز ایس کیکرنے سے روکتی ھے وہ یہ ھے کہ ھند و چاھتے ھین کے سارے بدیسی لفظوں کو دودہ میں سے مکھی کیطرح نکال پھینکین اور اونکی جگھہ ھندی کے اٹ پٹے لفظوں کو دین۔ یہہ نہ سمجھ بوجھہ کا کام دکھائی دیتا ھے نہ ملنساری کا۔ وہ لفظ

جوانپڑھ لوگون کی کیا کہ گاؤن والون تک کی زبانون پہ چڑھے ھوئے ہین اگر ھندی سے نکال دئے جائین تو اوسکی سو بہا بھی بہت کم ہو جائیگی اور دھن دولت بہی ۔ اسکے سوا یہ کوششین کبھی پھل لانے والی بھی نھین ۔ جیتے جاگتوں کو مارنا اور مرے ھوؤں کو جلانا جیسے بے تکی بے سمجھی کی بات ہے کہنے کی ضرورت نہین ۔ اسی طرح وہ مسلمان جو اس پر تلے ھوے ھین کہ ہندی لفظوں کے ھوتے ساتیے بہی فارسی عربی کے پتھر برسائیں بڑی بھاری بے سمجھی کرتے ہیں ۔ یہ لوگ اردو کو جتنا عام بول چال سے الگ کرتے اور مٹاتے جاتے ہین اوتنا ہی اوسکو ملک کی زبان بننے سے روکتے ہیں ۔ ہم نے اس ترجمہ میں کوشش کی ہے کہ فارسی عربی کے وہی لفظ کام مین لائے جائین جو انپڑھ اور گنوار لوگ بھی برابر برتتے ہیں اور بنگالی مرہٹی گجراتی ہندی میں بھی برابر بولے اور برتے جاتے ہیں ۔ ہم دکھانا چاھتے ھین کہ عربی فارسی کے وہ سب لفظ جو عام بول چال میں نہیں آتے اگر اردو سے نکال بھی دئے جائین تب بھی یہ زبان سہج مین سارے کام دیسکتی ھے اور جو کچھہ کہنا ھو، دل کھولکے کہہ سکتے ھین یعنی تھوڑی سی کاٹ چھانٹ کتر بیونت سے ہم اردو کو ایک ایسی زبان بنا سکتے ھین جو ہندوستان کے ہر کھونٹ میں آسانی سے سمجھی اور بولی جا سکے ۔ اردو اور ہندی دو مونہہ بولی بہنین ہین . اوکسانے لمسا نے والے دونوں کو اوبھارے دے دیکر نہ لڑاتے بھڑاتے تو نہ انمین جوتیون مین دال بٹتی نہ تو تو مین ہوتی ۔ اب بھی اکڑ پہون سے ہاتھ اوٹھالیا جاے تو ابھی سب بکھیڑا چکا جاتا ہے ۔ اردو فارسی کا اور

ہندی سنسکرت کا اورا نہ لے" کچھ ہم سمجھے کچھ تم سمجھے" کچھ یہ دبے کچھ وہ لچے چلئے چھٹی ہوئی۔ مگر برا ہو لڑانے والوں کا کہ بیچاریوں کو گلے ملنے بھی کو نہین چھوڑتے۔ نجانے انکی سمجھ پر کیا پتھر پڑے ہین۔ اتنا نہین سوجھتا کہ جبتک سارے ملک کی بولی ایک نہو نہ اس کا بول بالا ہو سکے نہ لوگون میں سچا ایکا اور بھائی چارہ۔

-فدا علیخان

ڈاکٹر پروفیسر فدا علی خان کی کتاب 'بس کا روکھ' کا نمونۂ ترجمہ درج ذیل ہے:

" نگندر کا دریائی سفر

نگندر دت کشتی میں بیٹھا چلا جاتا تھا - جیٹھ کا مہینہ آندہی مینہ کے دن۔ اوسکی بیوی سورج مکھی نے اپنے سر کی قسم دیکر کہدیا تھا کہ دیکھو ناؤ چوکسی سے لیجانا آندہی اوٹھتی دیکھتے ہی کنارے لگالینا اور آندھی کے وقت کبھی ناؤ مین نہ رہنا - نگندر اقرار کر کے ناؤ مین بیٹھا تھا نہین تو سورج مکھی جانے ہی ندیتی اور کلکتہ بن جاے بہی نبنتی تھی کیونکہ بہت سے کام تھے۔

نگندر ناتھ بڑا روپیہ پیسہ والا زمیندار تھا۔ گوبند پور میں رہا کرتا تھا یہ گاؤن جس ضلع مین تھا اوسکا ہم نام نہ لینگے ہری پور کہکر ذکر کرینگے۔ جوان آدمی تھا تیس برس کی عمر تھی۔ بجرے مین بیٹھا چلا جا رہا تھا۔ پہلے دو دن چین چان سے گزرے۔"[۵]

پروفیسر فدا علی خان نے اردو اور انگریزی میں بہت سے مقالے لکھے، جن کی تعداد بیس سے

زائد ہے۔ چند اہم اہم مقالے یہ ہیں:

ا۔ مسلمان اور علوم ہند ۲۔ زبان ۳۔ اسلام اور فنون لطیفہ ۴۔ مسلمانوں کے ابتدائی ذرائع خبر رسانی۔

اس کے علاوہ انہوں نے کئی اہم پبلک لکچر بھی دئے، جن میں سے چند اہم لکچر درج ذیل ہیں:

1. Treatment of subject races by Arab.

2. India from the point view of Early Arab Historians.

غرض شعبۂ اردو و فارسی کے کی اولین خدمت کا سہارا ڈاکٹر پروفیسر فدا علی خان کے سر رہا اور پھر اس کے بقا اور ترقی میں بھی انکا حصہ بڑا بھاری تھا۔[۶]

ڈاکٹر معید الاسلام بورہ

ڈاکٹر معید الاسلام بورہ ہندوستان کے شہر آسام میں پیدا ہوئے۔ آپ شعبۂ اردو و فارسی کے اولین فارغ التحصیل طالب علم تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۴ میں فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ یکم جولائی ۱۹۲۴ء میں ان کا تقرر اسسٹنٹ یعنی جونیر لکچرار کی حیثیت سے ہوا۔ ستمبر ۱۹۲۹ء سے ستمبر ۱۹۳۱ء تک آپ تعلیمی رخصت پر تھے۔ اس عرصہ میں انہوں نے لنڈن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۴ء میں معالجہ کے لئے آپ ہندوستان گئے تھے اور اسی سفر میں وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ انہوں نے فارسی کی ایک کتاب "بہارستان غیبی" کا ترجمہ مع تصحیحات انگریزی زبان میں کیا۔ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل اس کتاب کو حکومت آسام نے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا تھا۔[۷] اس کتاب کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنگلہ اکیڈمی ڈھاکہ نے "بہارستان غیبی" کا ترجمہ بنگلہ زبان میں کیا۔ وقتاً فوقتاً ان کے تحقیقی مقالات مختلف ادبی جریدوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کا ایک اہم مقالہ "امیر حسین دہلوی: زندگی اور کارہائے نمایاں" اس سلسلے میں ان کی اہم خدمت ہے۔

ڈاکٹر بورہ جناب فدا علی خان کے بعد اس شعبہ میں پہلی بار یکم جولائی ۱۹۳۵ء سے ۳۰ جون ۱۹۴۲ء تک اور پھر دوبارہ یکم جولائی ۱۹۴۳ سے ۴ مئی ۱۹۴۴ء تک اس شعبہ کے صدر رہے۔شعبہ کی ترقی میں ان کا بڑا حصہ رہا۔۸

ایس ایم زیڈ ایچ آزاد

ایس ایم زیڈ ایچ آزاد صاحب دراصل شعبۂ اردو و فارسی میں فارسی کے استاد تھے۔ان کا تعلق پنجاب کے لاہور سے تھا۔آپ ڈھاکہ یونیورسٹی کے مایہ ناز پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ کے اساتذہ میں سے تھے۔آزاد صاحب روحانیت کے سخت عقیدتمند شخص تھے۔بقول پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ "اگر طلبہ بڑے پیر عبدالقادر جیلانیؒ اور خواجہ معین الدین چشتیؒ جیسے لوگوں کے ناموں کے ساتھ لفظ "حضرت" نہ بولتے تو آپ ناراض ہو جاتے تھے"۔لاہور میں وہ ڈاکٹر اقبال کے ہم جماعت تھے۔وہ علامہ اقبال کے بارے میں بہت کچھ بتاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اقبال حسب معمول درس میں حاضر نہیں ہوتے تھے۔ایک دن جب وہ درس میں دیر سے آئے تو کلاس ٹیچر ان سے ناراض ہو گئے۔پھر اقبال نے عاجزی سے کہا: میرا نام اقبال ہے جس کا مطلب ہے خوش نصیبی۔اور خوش نصیبی دیر ہی سے آتی ہے۔اقبال کی اس عمدہ وضاحت سن کر کلاس ٹیچر نے مسکرا دیا اور انکی ناراضگی دور ہو گئی۔

ایس ایم زیڈ ایچ آزاد یکم جولائی ۱۹۴۲ء سے ۳۰ جون ۱۹۴۳ء تک ایک سال ڈھاکہ یونیورسٹی شعبۂ اردو و فارسی کے Acting صدر رہے۔ریٹائر ہونے کے بعد جناب آزاد لاہور چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔شعبۂ اردو و فارسی کے لئے آپ کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔۹

ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی

آپ کا نام وجاہت حسین ہے۔ اصل وطن سنبھل، ضلع مرادآباد ہے۔ آپ وہیں یکم دسمبر ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کا ننہال رامپور ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ دسویں درجہ میں پڑھتے ہوئے آپ رامپور سے لاہور چلے گئے۔ وہاں حصول تعلیم میں مصروف رہے۔ ۱۹۲۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۲۶ء میں ہندو کالج دہلی میں آپ کا تقرر فارسی کے لکچرار کے طور پر ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں آپ ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر بنے۔ ۱۹۳۳ء میں جناب شادانی نے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ مرتے دم تک ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر رہے۔ ۱۰

ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی ۱۹۴۴ء سے ۱۹۶۹ء تک ۲۵ سال کے طویل عرصے تک شعبہ اردو و فارسی کے سربراہ رہے۔ آپ برصغیر کے بڑے دانشمند، مشہور اردو شاعر، اور اردو کے ممتاز ادبی نقاد تھے۔ وہ تنقید کے دلدادہ تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ شاعروں اور ادیبوں کی خطاؤں کو کیسے معاف کیا جائے۔ انہوں نے فارسی میں ایم اے کیا تھا۔ لیکن انہوں نے فارسی اور اردو دونوں ہی میں تدریسی خدمت انجام دی۔ ان کا انتقال ۱۹۶۹ میں ہوا اور ڈھاکہ کے عظیم پور کے نئے قبرستان میں دفن ہوئے۔

اردو زبان وادب میں ان کے معروف ومشہور کارنامے یہ ہیں:

۱۔ نشاط رفتہ ۲۔ تحقیقات۔ ۳۔ تحقیق کی روشنی میں ۴۔ دور حاضر اور اردو غزل گوئی ۵۔ نوش و نیش ۶۔ سچی کہانیاں اور ۷۔ چھوٹا خدا۔ ۱۱

اردو زبان وادب کے مختلف میدان میں نمایاں کارنامے انجام دینے کے ساتھ ساتھ آپ نے اردو صحافت میں بھی بڑا رول ادا کیا۔ عوامی سطح پر کسی زبان وادب کی توسیع وترقی کیلئے صحافت ایک اہم وسیلہ ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بنگلہ دیش میں خصوصاً ڈھاکہ سے کئی اردو اخبار منظر عام پر آئے، جن میں سب سے پہلا سہ روزہ اخبار "مشرقی پاکستان" تھا، ۱۱ مارچ

۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کی ادارت میں یہ اخبار منظر عام پر آیا۔ مگر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر زیادہ دنوں تک وہ جاری نہ رہ سکا۔ اسکے بعد ۱۹۵۲ء میں انہوں نے ایک ادبی و معیاری ماہ نامہ "خاور" نکالا، اس میں بنگلہ زبان و ادب کیا ہم اہم علمی و ادبی ذخائر کو اردو میں ترجمہ کر کے اردو ادب کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ کیا جارہا تھا، علاوہ ازیں اس میں کتابوں پر تبصرے بھی کئے جاتے تھے۔[۱۲] شی صاحب کا ایک انگریزی مقالہ ہے، جو بلبل اکیڈمی، ڈھاکہ میں پڑھا گیا تھا۔ ۷۔ 'The Bengal Language Movement and Urdu Literature'۔ یہ ان کا ایک اور اہم انگریزی مقالہ ہے، جو 21 فروری ۱۹۷۰ء میں ڈھاکہ کے مقامی اخبار 'مورنگ نیوز' میں شائع ہوا تھا۔

آپ نے ستمبر ۱۹۶۹ء میں مغربی پاکستان میں اردو زبان اور ادب کی گیارہویں عالمی کانفرنس میں اِس خطہ (مشرقی پاکستان حالاً بنگلہ دیش) کی ایک اردو ادبی شخصیت کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس طرح ڈاکٹر قریشی نے اُفقِ عالم میں شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کے نام کو روشن کیا۔[۱۵]

ڈاکٹر شوکت سبزواری

شوکت سبزواری میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد ایران کے صوبہ خراسان کے سبزوار علاقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی نسبت سے انہیں 'سبزواری' کہا جاتا تھا۔ آپ عربی میں تعلیم یافتہ تھے۔ ابتدائی زندگی میں انہوں نے مدرسوں میں اسلامی تعلیم کی خدمت انجام دی۔ بعد میں انہوں نے عربی، فارسی اور اردو میں ایم اے پاس کیا اور مختلف کالجوں میں عربی، فارسی اور اردو پڑھاتے رہے۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو لیکچرار کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی اور یہیں اردو کی خدمات انجام دیتے رہے۔[۱۶] اسی دوران ۱۹۵۳ء میں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے اردو لسانیات کی تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ان کے مقالہ کا عنوان تھا "اردو زبان کی لسانی تحقیق"۔ وہ یہاں اردو لسانیات پڑھاتے تھے، انہیں اس مضمون پر کافی عبور حاصل تھا۔ آپ شعبہ کے سب سے چھوٹے اور غیر شادی شدہ استاد تھے۔ جنرل نالج میں بھی آپ کو سیر حاصل عبور تھا۔ شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کے لئے قابل فخر اس شخصیت نے بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے ہی ڈھاکہ چھوڑ دیا تھا۔

غرض ڈاکٹر شوکت سبزواری اردو ادب کی دنیا میں ایک جانی پہچانی شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ایک بہترین محقق، نقاد اور کامیاب نثر نگار تھے۔ ان کا وجود صرف اس شعبہ کے لئے نہیں، بلکہ پورے مشرقی پاکستان کے لئے باعث فخر تھا۔ ان کا تعلیمی ریکارڈ ہمیشہ اعلیٰ رہا۔ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبان کے علاوہ انہیں قانون، منطق، فلسفہ، الٰہیات، لسانیات اور تاریخ اسلام پر بھی کافی عبور اور دسترس حاصل تھا۔ ان کے مضامین ملک کے اعلیٰ اور معیاری جریدوں مثلاً نگار، جامعہ، معارف، اردو، علی گڑھ میگزین، خاور ڈھاکہ اور آج کل دہلی میں شائع ہو کر مقبول عام و خاص ہوتے رہے۔ ان کی علمی اور ادبی کاوشوں کی بنا پر مغربی پاکستان کے اہل ادب حلقے نے ۱۹۵۹ء میں انہیں کراچی بلایا اور 'کراچی اردو ترقی بورڈ' میں ان کا تقرر کیا۔ زندگی کے آخری ایام تک آپ وہیں رہے اور تاحیات اردو زبان و ادب کی خدمت رہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری کے چند اہم مقالات کے نام یہ ہیں:

۱۔ غزل کی آپ بیتی ۲۔ اردو ادب کی نئی پرانی قدریں اور ۳۔ اردو زبان کی دقتیں۔

اس کے علاوہ ماہنامہ 'خاور' ڈھاکہ میں ان کا ایک زبردست ادبی معرکہ دہلی اور لکھنو کی زبان کے متعلق نواب جعفر علی خان اثر معنوی کے ساتھ ہوا۔ جو سلسلہ وار کئی مہینوں تک چلتا رہا، اور یہ معرکہ ان کے کئی مقالوں کی حیثیت رکھتا ہے۔

آج سے تقریباً تیس سال پہلے جنوبی ہندوستان کی ایک یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے ان کی زندگی اور ادبی کارناموں پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ان کے نام کو

میدانِ ادب اردو میں دوبارہ روشن کیا۔ آپ کی شخصیت شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کے لئے قابل فخر تھی۔[۱۶]

پروفیسر طاہر فاروقی

پروفیسر طاہر فاروقی کی پیدائش ہندوستان کے مشہور شہر رامپور میں ہوئی، مگر ابتدائی زندگی میں کئی سال وہ پشاور میں رہے تھے۔ اس لئے اس شہر سے ان کو اپنے حقیقی وطن سے زیادہ پیار ہوگیا تھا۔ وہ ایک مولوی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد محمد حسن فاروقی اپنے زمانے کے نامور جید عالم تھے۔ اردو اور فارسی سے انھیں بڑا لگاؤ تھا۔ انہوں نے چند کتابیں بھی لکھی ہیں۔

اپنے والد ماجد جیسے پروفیسر طاہر فاروقی بھی بنیادی طور پر عالم، فاضل اور کامل پاس عربی تعلیم یافتہ شخصیت کے حامل تھے۔ آپ نے اردو اور فارسی میں ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔ پروفیسر طاہر فاروقی نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں بطور اردو ریڈر ۱۹۵۲ء شمولیت اختیار کی۔ آپ شعبۂ اردو و فارسی ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک بڑے اچھے استاد تھے۔ آپ نہایت اعلیٰ شخصیت اور سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے۔ مشرقی پاکستان میں اردو کی تشکیل اور ارتقاء میں ڈاکٹر طاہر فاروقی ہمیشہ پیش پیش رہے۔ طاہر فاروقی کی قابلیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی کے ہر امتحان میں انھیں امتیازی درجہ ملا۔ ان کی علمی اور ادبی زندگی کا گہوارہ آگرہ اور پنجاب تھا۔ ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا "اورنگ زیب کے دربار میں فارسی ادب"۔ انہوں نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ سیرت اقبال، ۲۔ اردو نثر کے نمونے اور ۳۔ مولانا محمد علی جوہر اور چمنستان ادب۔

'سیرت اقبال' میں انہوں نے علامہ محمد اقبال کی سیرت، کردار اور ان کی ادبی کاوشوں کو اس انداز سے اجاگر کیا ہے کہ یہ کتاب طلبہ اور اساتذہ میں عام مقبولیت حاصل کی اور تشنگان ادب

کے لئے آب حیات جیسی بن گئی۔ وہ ایک آزاد منش انسان تھے۔ انہیں شعبہ کے صدر ڈاکٹر شادانی کا اضافی اختیار ناپسند تھا۔ چنانچہ وہ ڈھاکہ یونیورسٹی چھوڑ کر پشاور چلے گئے اور مغربی پاکستان میں بس گئے۔ ان کے آخری حالات معلوم نہیں۔ ۱۷

ڈاکٹر عبدالحق صاحب

ڈاکٹر عبدالحق کی پیدائش سابق ترپورا، (ضلع کملا) کے محکومہ چاندپور صدر تھانہ، ابراہیم پور یونین کے ساکھوا نامی گاؤں کے ایک مسلم شریف گھرانے میں ہوئی۔ آپ کے والد مولانا عبد الرشید صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند عالم تھے۔ آپ کی والدہ ماجدہ فی زمانہ کے ضلع چاندپور میں علم قرات کے لئے مشہور و معروف گاؤں مومن باڑی کے مرحوم عبدالسلام خان عرف مومن صاحب کی بڑی صاحبزادی اور اس خطۂ زمین کے مشہور قاری و مقری استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد ابراہیمؒ کی بڑی بہن تھیں۔ ڈاکٹر صاحب چار بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے اور بڑے ذہین واقع ہوئے تھے۔ ان کے اور دو بھائی مرحوم عبدالودود اور مرحوم عبد الباری بھی بڑے ذہین تھے اور مشہور عالم دین تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی تحصیل علوم دینیہ چاندپور عثمانیہ مدرسہ اور ڈھاکہ عالیہ مدرسہ سے ہوئی اور جنرل تعلیم انہوں نے چاندپور کالج اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ مرحوم عبدالحق ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں قیام پاکستان کے بعد بی اے آنرز کا پہلا سیشن ۴۹-۱۹۴۸ء کے طالب علم تھے۔ ان کے ہم سبق ڈاکٹر ابوسعد نورالدین صاحب اور نواکھالی کے ڈاکٹر فیض احمد صاحب تھے۔ بعد میں اسی شعبۂ اردو و فارسی ہی سے مرحوم عبدالحق صاحب نے ۱۹۶۱ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ان کے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا "اردو شاعری پر فارسی شاعری کا اثر (۱۸۵۷ء تک)"۔ یہ مارچ ۱۹۶۰ء لکھا گیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری میں اس مقالہ کا کال نمبر ہے: آر بی/یو ۴۳۹۱-۸۹۱/اے بی ایف۔ ۱۸

ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے اپنی عملی زندگی کی شروعات ڈھاکہ عالیہ مدرسہ سے کی، جہاں آپ نے شعبۂ اردو ڈپلوما میں صدارت کی خدمات انجام دیں۔ بعد میں راجشاہی یونیورسٹی کے شعبۂ زبان میں بطور لیکچرار آپ کا تقرر ہوا۔ قیام راجشاہی کے دوران آپ راجشاہی فریڈیو میں روزانہ صبح کے وقت قرآن کریم کی تفسیر کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ مختلف تحقیقی کام بھی سرانجام دیتے رہے۔ راجشاہی یونیورسٹی میں ڈاکٹر صاحب تھوڑی ہی مدت اپنی تعلیمی خدمات انجام دہی میں گزار سکے تھے کہ ناگہانی داعیٔ اجل کو لبیک کہنا پڑا۔ ۱۲/فروری ۱۹۶۶ء بروز بدھ ۲ بج کر ۳۰ منٹ پر ڈھاکہ سے راجشاہی جاتے ہوئے فرید پور میں ہیلی کاپٹر کے حادثے میں ان کی موت ہوگئی۔ موت کے وقت ان کی عمر ۴۲ سال کی تھی۔ سانحہ ان کی موت کا یوں تھا کہ اس روز دوپہر گیارہ بجے پی آئی اے ہیلی کاپٹر پہ چاند پور سے ڈھاکہ آئے۔ پھر ٹرنجٹ ہیلی کاپٹر کے ذریعہ راجشاہی کیلئے روانہ ہوتے ہوئے فرید پور کے حدود فضا میں پہنچنے کے بعد ہیلی کاپٹر میں آگ لگ گئی اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت مرحوم ڈاکٹر عبدالحق صاحب اپنا چار مہینوں کا اکلوتا بیٹا محمد نعمت اللہ کو چھوڑ کر گئے۔ اس حادثہ میں بچ جانے والا واحد شخص ایک نوجوان تھا۔ نام محمد عبدالمنان۔ جنہیں آج دنیا ایم اے منان ایم پی کے نام سے جانتی ہے، جو ابھی بنگلہ دیش وزارت منصوبہ بندی کے معزز وزیر ہیں۔[۱۹]

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم اپنی مختصر حیات میں اپنے معیاری تحقیقی کام کے ذریعے شعبۂ اردو و فارسی، ڈھاکہ یونیورسٹی کے نام کو بالاتر کیا، شعبۂ اردو انہیں کبھی بھول نہیں سکتا۔

فیض احمد چودھری

فیض احمد چودھری صاحب ۱۹۱۷ء میں چاٹگام کے بنشکھالی تھانے کے پوکوریا گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام امیر الزماں چودھری تھا۔ آپ نے حصول علومِ دینیہ کے طور پر ۱۹۳۱ء میں "عالم" اور ۱۹۳۳ء میں "فاضل" کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد آپ جدید

تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں میٹریکولیشن امتحان اور ۱۹۴۰ء میں آئی اے امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۴ء میں آپ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی سے فارسی میں آنرز اور ۱۹۴۵ء میں اسی مضمون میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ چودھری صاحب نے ۱۹۵۵ء میں اسی شعبہ سے اردو میں ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ۱۹۵۳ء میں آپ نے ایران کی تہران یونیورسٹی سے ماڈرن فارسی سرٹیفکیٹ کا کورس مکمل کیا۔

۱۹۴۶ء میں تحصیل علوم کے دوران ہی فیض احمد چودھری کا تقرر ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں فارسی کے لیکچرار کے طور پر ہوا۔ آزادی کے بعد آپ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۳۰ جون ۱۹۷۶ء تک شعبۂ اردو و فارسی کے چیئرمین رہے۔ ۳۰ جون ۱۹۷۷ء اسی شعبہ سے آپ ریٹائرڈ ہوئے۔

فیض احمد چودھری بنگلہ، انگریزی، اردو، فارسی اور عربی پانچوں زبانوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ چودھری کی نمایاں تخلیقات درج ذیل ہیں:

۱۔ نگاہ آزاد، اردو ندیم، ڈھاکہ، جنوری ۱۹۷۰ء۔

۲۔ بنگالی اور اردو زبان کی ساخت، روزنامہ آزاد پتریکا، ڈھاکہ ۲۶، ۵، ۱۹۵۵ء۔

۳۔ اردو میں صنفی خلل، روزنامہ آزاد پتریکا، ڈھاکہ ۲۶ جولائی ۱۹۵۵ء۔

۴۔ اردو گرامر کے تناظر میں جتنا ممکن ہو، روزنامہ آزاد پتریکا، ڈھاکہ ۲۹ جون ۱۹۵۶ء۔

۵۔ اردو میں جملہ اسمیہ، ماہنامہ محمدی، ڈھاکہ، جنوری ۱۹۵۶ء۔

۶۔ ایران اور پاکستان کے درمیان لسانی وابستگی، ڈھاکہ یونیورسٹی اسٹڈیز ڈھاکہ، ۱۹۶۸ء۔

۷۔ سکندر نامہ ان کی ایک ترجمہ شدہ کتاب ہے جو بنگلہ اکیڈمی ڈھاکہ سے ۱۳۶۰ بنگلہ سال میں شائع ہوا تھا۔

۸۔ چار جلدوں پر مشتمل ان کی بنگلہ اردو ڈکشنری، بنگلہ اکیڈمی، ڈھاکہ نے شائع کی تھی۔

بنگلہ دیش کے اس خطہ میں اردو و فارسی کی ترقی میں فیض احمد چودھری کا سب سے اہم اور نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے زیادہ تر اردو بولنے والے اساتذہ ڈھاکہ چھوڑ کر چلے گئے، جس سے شعبہ میں اساتذہ کی کمی ہوگئی تھی۔ انہوں نے چند بنگالی بولنے والے اساتذہ کی خدمات حاصل کر کے شعبہ کی تعلیمی سرگرمیوں کو رواں دواں رکھنے میں منفرد کردار ادا کیا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ جناب فیض احمد چودھری پاکستان کے دور میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں بنگالی بولنے والے فارسی کے واحد استاد تھے۔

جناب فیض احمد چودھری صاحب قیامِ بنگلہ دیش کے شروع سے ۱۹۸۶ء تک شعبہ اردو و فارسی کے چیئرمین رہے۔ بنگلہ دیش کے قیام سے پہلے شعبہ کے سربراہ کو "شعبہ کا سربراہ" یا "صدر" کہا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نازک لمحے میں جناب چودھری نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے چند بنگالی بولنے والے اساتذہ کا تقرر کیا اور شعبہ کو تنزلی کے شکار ہونے سے بفضل خداوندی بچالیا۔ پاکستانی دور میں اردو بولنے والے اساتذہ میں وہ تنگ تھے۔ اگرچہ اس دور میں انہوں نے اردو میں ایم، اے بھی کیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اردو والوں میں اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ اس کی وجہ بتانا یہاں مقصد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو بولنے والے اساتذہ کو بنگالی بولنے والے طلبہ اور اساتذہ سے زیادہ ہمدردی نہیں تھی۔ بنگالی طلبہ اردو سیکھنے کے لیے جتنے شوقین تھے، اردو بولنے والے اساتذہ انہیں پڑھانے میں اتنے ہی بے رغبت تھے۔ عام طور پر انہوں نے ایک طویل عرصہ تک یہاں قیام پذیر ہوتے ہوئے بھی بنگلہ زبان سیکھنے کی کبھی کوشش تک نہیں کی۔ وہ اردو زبان اور خود کو "برتر" سمجھتے تھے۔ اردو والوں کا ایسا غرور اور تسلط پسند ذہنیت میں پاکستان کی تقسیم کے بیج پھوٹ پڑے۔ وہ کم ہونہار اردو طلبہ کو زیادہ سے زیادہ موقع اور فلیش دیتے تھے۔ لیکن زیادہ ہونہار بنگالی طلبہ کی اچھی طرح کلاسیں لینے میں از حد بخل کرتے تھے۔

یہاں ایک بات ذیلی طور پر قابل ذکر ہے کہ سقوط مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش کے قیام کے بعد بھی شعبۂ اردو کے دو اردو بولنے والے اساتذہ ڈھاکہ میں موجود تھے۔ یعنی پروفیسر ظفر الہدیٰ اور ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی۔ لیکن بنگلہ دیش میں رہنے کے باوجود وہ دونوں شعبہ سے بے تعلق زندگی گذار رہے تھے۔ ان کو شعبہ میں نہیں بلایا گیا۔ اس کی ایک ناگفتہ بہ وجہ تھی کہ اس وقت کے صدرِ شعبہ یہی مذکور الصدر جناب فیض احمد چودھری تھے جو اردو بولنے والے اساتذہ کے ماضی کے رویوں کو نہیں بھول سکے۔ اس لیے انہوں نے ان دونوں اساتذہ کو دوبارہ شعبہ اردو سے ملانے میں کوئی مثبت کردار ادا نہیں کیا۔

جناب فیض احمد چودھری نے اپنی زندگی کے آخری ایام چاٹگام میں اپنے گھر پر گزارے۔ وہ کافی عرصے سے شوگر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۸۸ء میں ڈھاکہ کے ایک کلینک میں ہوا۔ ان کی نماز جنازہ سدھیشوری میں ان کی ایک صاحبزادی کے مکان میں ادا کی گئی۔ نماز جنازہ میں اس وقت کے شعبہ کے تمام اساتذہ موجود تھے۔ انہیں چاٹگام میں سپرد خاک کیا گیا۔ [۲۰]

غرض ۱۹۷۱ء بنگلہ دیش کی آزادی اور سقوط پاکستان کے بعد اس خطہ کی اردو زبان و ادب اس نئے ملک میں ایک زبردست بحران سے دوچار ہونے لگی۔ صد آفریں ہوں ان بزرگوں کو جنہوں نے اردو کی گرتی ہوئی ساکھ سنبھالی اور اسے اس سرزمین میں بے نام و نمود ہونے سے بچالیا اور اب یہ زبان پھر آہستہ روی کے ساتھ ہی سہی مگر ترقی کی راہ پر گامزن ہے اس کی توسیع و ترویج میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا ایک اہم کردار رہا ہے خصوصاً بنگلہ دیش کی آزادی کے بعد اس سلسلہ میں ناسپاسی ہوگی اگر ان بزرگوں کا نام نہ لیا جائے جنہوں نے اس زبان کو اس خطہ میں بے نام و نشان ہونے سے بچالیا خصوصاً جناب فیض احمد چودھری کی خدمات اس سلسلہ میں کسی طرح فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

پروفیسر رستم علی دیوان

جناب رستم علی دیوان کا تقرر شعبۂ اردو و فارسی میں بحیثیت معاون پروفیسر ۱۹۷۲ء میں ہوا۔ جناب رستم علی دیوان اس عہدہ سے قبل نرشندی کالج میں پرنسپل تھے۔ موصوف نے اسلامیک اسٹڈیز، اردو اور فارسی میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سے انہیں اعلیٰ کامیابی پر گولڈ میڈل بھی ملا تھا جناب رستم علی دیوان کی مادری زبان اردو تھی۔ فیض احمد چودھری صاحب کے بعد ۱، ۷، ۱۹۷۶ء سے ۳۰، ۶، ۱۹۷۹ء تک جناب رستم علی دیوان شعبۂ اردو و فارسی کی کے چیئرمین رہے۔ ۲۱ آپ ۱۹۸۲ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۹۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے فارسی- بنگلہ ایک ڈکشنری لکھی تھی۔ مگر اب تک وہ اشاعت پذیر نہیں ہوسکی۔ ۲۲

بقول پروفیسر کنیز بتول، ان کی پُرخلوص شفقت اور مہربانی، ان کے لئے مشعل راہ تھی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ان کے لئے اجنبی اور بیگانہ تھا۔ رجسٹرار آفس سے لیکر حال کے دفتر تک نت نئی دشواریوں کا انہیں سامنا کرنا پڑتا تھا۔ شعبہ کے چیئرمین رستم علی صاحب اور کلرک جناب عبد الجلیل صاحب اور معین کلرک عبدالرشید صاحب کی اعانت سے داخلہ لینے کی تمام کاروائیاں ان کے لئے آسان ہوگئی ہیں۔ دیگر طلبہ کی طرح انہیں زیادہ عرصے تک دفتر کا چکر لگانا نہ پڑا۔ جناب رستم علی دیوان کے مشورے سے انہوں نے اردو آنرز کے ساتھ اختیاری مضامین 'تاریخ اسلام' اور 'فارسی' لیا۔ بقول مرحومہ یہ مضامین بعد میں ان کیلئے نہایت مفید ثابت ہوئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے پہلے انہوں نے کبھی فارسی نہیں پڑھی تھی۔ پروفیسر رستم علی دیوان کے پڑھانے کا طرز و طریقہ اتنا عمدہ تھا کہ میں نے ایک ہی مہینہ میں فارسی گرامر سیکھ لی۔ بقول محترمہ کنیز بتول جب بھی وہ فارسی پڑھتی تھیں، انہیں استاد محترم رستم علی دیوان یاد آتے تھے۔ ۲۳

غرض ایک ناسازگار زمانے میں شعبۂ اردو و فارسی کی ترقی کیلئے پروفیسر رستم علی دیوان کی

کاوشوں کی وجہ سے آج بھی ہم انہیں بہ صد احترام یاد کرتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ

ڈاکٹر محمد عبداللہ یکم اپریل ۱۹۳۲ء کو لکھی پور ضلع کے تحت بنگا خاں گاؤں کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرحوم مولانا مخلص الرحمٰن اپنے علاقے کے نامور عالم تھے۔ آپ کی مرحومہ والدہ آسیہ خاتون ایک دیندار مثالی گھریلو خاتون تھیں۔ وہ چھ بھائی اور ایک بہن میں سب سے بڑے تھے۔

بچپن میں پروفیسر محمد عبداللہ کی پرورش ان کے والد صاحب کے زیر سایہ ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے ہی گاؤں کے بنگا خاں اسکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے لکھی پور کے دارالعلوم مدرسہ میں جماعت پنجم (آٹھویں جماعت) تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انہیں چھٹی جماعت کے اسکالرشپ امتحان میں ڈسٹرکٹ بورڈ کی اسکالرشپ ملی۔ پھر ۱۹۴۳ء میں انہوں نے نواکھالی کرامتیہ مدرسہ سے عالم کا امتحان پاس کیا اور اس زمانہ کے متحدہ بنگال کی ڈویژنل سطح پر درجہء اول میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اسی مدرسہ سے ۱۹۴۵ء میں آپ نے فاضل کا امتحان درجہء اول میں دوسری پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔

اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں انہوں نے گورنمنٹ عالیہ مدرسہ کلکتہ سے 'ممتاز المحدثین' (اب جسے کامل حدیث کہا جاتا ہے) کی ڈگری کامیابی کے ساتھ حاصل کی۔ پھر انہوں نے ۱۹۵۲ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی شعبہء اردو و فارسی سے اردو بی اے (آنرز) امتحان میں درجہء اول میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور فیکلٹی آف آرٹس میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۵۳ء میں اسی مضمون پر ایم اے امتحان میں درجہء دوم میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔

۱۹۷۱ء میں محقق محمد عبداللہ نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے تحت 'سرسید احمد خان کے مذہبی اور سماجی افکار' پر ایک مقالہ لکھ کر ایم فل ڈگری حاصل کی اور پھر 1973ء میں 'بنگلہ دیش میں فارسی

ادب' کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔[۲۴]

ڈاکٹر محمد عبداللہ نے اسکولوں، مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنی رسمی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنی مختلف الحیثیات عملی زندگی کا آغاز کیا۔ 1953 میں ایم اے پاس کرنے کے بعد اپنے ہی علاقے کے ماندار ی ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا۔ یہی ان کا پہلا عملی میدان تھا۔ پھر ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء سے ۲۵ اگست ۱۹۵۸ تک انہوں نے سلہٹ گورنمنٹ عالیہ مدرسہ میں نان گزیٹڈ سروس کے تحت تقریباً چار سال اسسٹنٹ ٹیچر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ سلہٹ میں رہتے ہوئے آپ سلہٹ انجمن ترقی اردو کے سرگرم رکن تھے۔

سلہٹ گورنمنٹ مدرسہ میں "ماتحتی خدمت کا فریضہ "انجام دینے کے بعد ڈاکٹر عبداللہ کا تبادلہ راجشاہی گورنمنٹ کالج میں اردو کے لیکچرار کے طور پر ہوا۔ آپ وہاں ۷، ۴، ۱۹۶۰ء تک رہے اور تعلیمی خدمات انجام دیں۔

راجشاہی کی آب وہوا اور موسم ڈاکٹر محمد عبداللہ کی صحت کے لیے ناسازگار ثابت ہوا۔ چنانچہ انہوں نے حکومت سے اجازت لی اور ۸، ۴، ۱۹۶۰ء ڈھاکہ کالج میں ان کا تبادلہ ہوا۔ پھر ۱۹۶۱ء میں ان کا تبادلہ ڈھاکہ عالیہ مدرسہ میں ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں انہیں پھر ڈھاکہ کالج واپس لایا گیا۔ یہاں آپ ۱۹۶۶ء تک یکسوئی اور لگن کے ساتھ تدریسی کام انجام دیتے رہے، اور درحقیقت یہیں سے ان کے تحقیقی کام کا آغاز ہوا تھا۔ ان کی اردو کتاب 'نذر الاسلام'، خطۂ بنگلہ دیش کی اردو ادبی دنیا میں جس کا بہت چرچا ہے، آپ کے اسی دور کا ثمر ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ کی مستعدی اور ان کے فرائض کی لگن سے مطمئن ہو کر حکومتی انتظامیہ نے انہیں ۱۹۶۶ء میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر ترقی دیکر بی ایم کالج بریسال بھیج دیا۔ وہاں آپ شعبہ اردو کے سربراہ تھے۔ وہاں تدریس کے علاوہ ڈاکٹر محمد عبداللہ نے اپنی تحقیقی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ یہ وہ وقت تھا جب انہوں نے اپنی کتاب ''مسلم بیداری میں چند شعراء اور مصنفین'' لکھی اور مولانا شبلی کی دو کتاب "علم الکلام" اور "الکلام" کا بنگلہ ترجمہ "اسلامی درشن"

کے عنوان سے کیا۔

اس زمانے میں ان کے کچھ تحقیقی اردو مضامین بھی اس وقت کے مغربی پاکستان میں شائع ہوئے۔ ان میں "اسماعیل حسین سراجی پر ایک نظر" اور "حاجی شریعت اللہ اور فرائضی تحریک" کے مضامین شامل تھے۔

سلہٹ گورنمنٹ مدرسہ، راج شاہی گورنمنٹ کالج، ڈھاکہ گورنمنٹ کالج اور گورنمنٹ بی۔ ایم۔ کالج میں تدریسی خدمات انجام دہی کے زمانے میں (۱۹۵۵ء-۱۹۸۲ء) ڈاکٹر محمد عبداللہ نے بنگلہ زبان میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ اس کے بجائے میں انھوں نے مختلف موضوعات پر پچاس اردو مضامین لکھے جو ڈھاکہ کے روزنامہ 'پاسبان'، کراچی کے ماہانہ اردو رسالے 'فاران'، کراچی کے ماہانہ اردو رسالے 'ماہ نو'، کراچی کے ماہنامہ 'ساقی' اور لاہور کے ایک نامور ماہنامہ 'سیارہ' میں شائع ہوئے۔ مذکورہ رسالے اس وقت اور آج بھی فرسٹ کلاس معیاری رسائل تصور کیے جاتے ہیں۔ ان جرائد میں لکھ کر آپ اس وقت کے مشرقی پاکستان کے مغربی حصے میں ایک خاص بنگالی اردو ادیب کے طور پر مقبول ہوئے اور ایک تحقیقی مصنف کی حیثیت سے پہچان حاصل کی۔ وہ پہلے بنگلہ دیشی تھے جنھوں نے مشہور اردو شاعروں اور ادیبوں کو بنگالی بولنے والوں اور معروف بنگالی شاعروں اور ادیبوں کو اردو بولنے والوں سے متعارف کرایا۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ کی باریسال بی۔ ایم۔ کالج میں پڑھاتے ہوئے بنگلہ دیش کی آزادی کی جنگ شروع ہوئی تھی۔ آزاد بنگلہ دیش ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو نو ماہ کی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ اس وقت ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی کے تمام اردو بولنے والے اساتذہ بنگلہ دیش چھوڑ کر چلے گئے۔ نتیجہ میں اساتذہ کا ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوا۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے اس وقت اردو اور فارسی شعبہ کے واحد استاد اور سربراہ جناب فیض احمد چودھری اور اس وقت کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین مرحوم پروفیسر ڈاکٹر مفضل اللہ کبیر صاحب نے باریسال

میں جناب محمد عبداللہ سے رابطہ کیا اور انہیں ڈھاکہ یونیورسٹی آنے کی گزارش کی۔ اس کے پیش نظر ۱، ۹، ۱۹۷۲ء کو اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر کی دو مشتہر پوسٹوں میں سے ایک میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے منتظمین نے انہیں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر تعینات کر دیا۔ اس کے ۲۰ سال بعد ۱۹۹۲ء میں آپ پروفیسر کے عہدے پر اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے اسی شعبہ سے ریٹائرڈ ہوئے۔ اس کے بعد آپ پارٹ ٹائم ٹیچر کی حیثیت سے تاحیات شعبۂ اردو کے ساتھ منسلک رہے۔[۲۴]

پھر ریٹائر کے بعد پہلی دفعہ پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب کی مدت ملازمت میں ۵ سال کی توسیع کر دی گئی۔ اس مدت کے اختتام پر پھر آپ پانچ سال کے لیے پارٹ ٹائم ٹیچر کے طور پر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد آپ ایک ایک سال کر کے کئی بار پارٹ ٹائم ٹیچر کے طور پر مقرر ہوتے رہے اور تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس طرح آپ بطور استاذ ڈھاکہ یونیورسٹی میں تقرر کی ابتداء (۱، ۹، ۱۹۷۲ء) سے لے کر اپنی وفات (۲۱، ۱۰، ۲۰۰۸ء) تک کل ۳۶ سال اس شعبہ میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔[۲۵]

اوپر یہ بات گزر چکی کہ پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ مرحوم ڈھاکہ یونیورسٹی شعبہ اردو کے نہایت ہی مایۂ ناز استاذ تھے۔ چنانچہ شاگردوں کی حوصلہ افزائی میں پروفیسر مرحوم کا حصہ قابل تعریف رہا ہے۔ پروفیسر محمد عبداللہ صاحب طلبہ کے ساتھ ہمیشہ بڑی مہربانی سے پیش آتے تھے۔ پڑھنا، پڑھانا اور تحقیقی مقالہ لکھنا، پروفیسر مرحوم کا پیشہ نہیں بلکہ نشہ تھا۔ علمی تحقیق و تنقید کی صلاحیت ان میں خداداد تھی۔ ان سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ میں خود بخود تحقیق و تنقید کا ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ مرحوم خود دار طبعیت کے حامل ایک قابلِ قدر بنگالی نژاد اردو داں شخصیت تھے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی نے ۱۹۹۲ء میں انہیں سونے کا تمغہ انعام دیکر ان کی ادب نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کا شمار ڈھاکہ یونیورسٹی کی باعث فخر ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں اردو جاننے والے ملازمین کی

بہت کمی تھی، جس کی وجہ سے لائبریری سے اردو کتابیں صادر کروانا طلباء کے لئے دشوار گذار تھا۔ ایسے موقع پر پروفیسر محمد عبداللہ صاحب مرحوم خود طلبہ کے ساتھ جا کر کتب خانہ سے کتابیں نکال کر انہیں پڑھنے دیتے تھے۔ ان کی اس کرم فرمائی سے خاص کر پڑھائی میں انہماک والے طلباء کو بڑا فائدہ ہوتا تھا اور ان کے دلوں میں مطالعہ کا ذوق بڑھتا جاتا تھا اور اس سے طلبہ اپنے زیادہ تر اوقات کتب خانہ کی چہار دیواری میں گذارنے لگے تھے۔

تصانیف

ڈاکٹر عبداللہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو اور بنگلہ زبان میں تیس (۳۰) سے زائد کتابیں اور بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ ان کی کتابیں زیادتر بنگلہ زبان میں ہیں لیکن ان کا موضوع بہر حال ہر زاویۂ نگاہ سے اردو ہی ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ وہ حضرات جو اردو سے ناواقف ہیں موصوف کی تحریروں سے براہ راست استفادہ کر سکتے ہیں۔ مزید برآں وہ حضرات اردو ادب سے روشناس بھی ہو جاتے ہیں اور ذہنوں پر جو غبار آلود اور مکدر فضا چھائی ہوئی تھی وہ بڑی حد تک صاف ہو جاتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ ایک جگہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں اپنی طالب علمی کے زمانے کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میرے پاس فرسٹ ایئر بی اے آنرز سے ایم اے فائنل تک چار سال میں نے ایس ایم ہال میں قیام کیا۔ اس وقت سیشن جٹ نہیں تھا۔ امتحانات وقت پر منعقد ہوتے تھے اور ٹیسٹ کے نتائج بھی وقت پر شائع ہوتے۔۔۔۔

ہمارے زمانے میں آڈیٹوریم میں ہونے والے تمام اجلاسوں اور سیمیناروں میں گفتگو اور گفتگو کا ذریعہ انگریزی ہوتا تھا۔ میں نے کبھی کسی مقرر یا مذاکرات کار کو اسٹیج پر کھڑے ہو کر بنگلہ میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ یونین کے انتخابات یا یونیورسٹی یونین کے انتخابات کے دوران بھی بنگلہ زبان کا استعمال اس 'مہم' میں بھی نہیں کیا جاتا تھا جو ہر کمرے میں چلائی جاتی تھی۔ ۱۹۵۳ء

میں ایم اے کا تحریری امتحان پاس کرنے کے بعد، زبانی امتحان سے پہلے، میں ضلع بریسال کے ایک دور افتادہ علاقے میں ملازمت پر چلا گیا۔ اس کے بعد ٹیسٹ کے نتائج شائع ہونے سے چند دن پہلے وائیوا امتحان لے لیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے ڈھاکہ سے بہت دور ہونے کی وجہ سے میں بروقت امتحان میں شرکت نہ کر سکا۔ اس وقت وائیوا امتحان میں نمبر نہیں دیا جاتا تھا۔ لیکن حاضری لازمی تھی۔ وائیوا میں میری عدم موجودگی کی وجہ سے میرے امتحان کے نتائج کی اشاعت ملتوی کر دی گئی۔ میں پرووسٹ اور شعبہ کے صدر کی وساطت سے وی سی کے حضور وائیوا کے لیے درخواست پیش کی۔ انہوں نے مہربانی سے وائیوا کی اجازت دی۔ اس کے بعد میرے ٹیسٹ کے نتائج شائع ہوئے۔ میرے ساتھ اس افسوسناک واقعہ پیش آنے کے بعد وائیوا امتحان لینے کے قواعد میں تبدیلی کر دی گئی اور امتحان کے دوران یا امتحان ختم ہونے کے فوراً بعد وائیوا لینے کا نظام چالو کر دیا گیا۔۔۔۔۔

۱۹۵۳ء میں میں نے ہال کی پرجوش طالب علمی زندگی کو چھوڑ کر عملی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ۱۹/۱۸ سال مختلف سرکاری کالجوں میں اردو پڑھانے میں گزارے۔ ۱۹۷۲ء میں میں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر شمولیت اختیار کی اور ۱۹۹۲ء میں ریٹائرڈ ہوا۔ اب میں ایکسٹینشن پر ہوں۔ میں سالہا سالوں کے طویل عرصے کے بعد زندگی کے آخری مرحلے پر بھی یونیورسٹی کی طالب علمی کی زندگی کو نہیں بھول سکا۔ پھر بھی پرانے دنوں کی میٹھی یادیں میرے ذہن میں تیرتی رہتیں اور میں سوچتا ہوا خوابوں کی دنیا میں چلا جاتا ہوں"۔[۲۶]

شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کی اس مایۂ ناز پروفیسر کا انتقال ۲۱ اکتوبر ۲۰۰۸ء ڈھاکہ میں ہوا۔ آپ کو میرپور شہید بدھی جیوی گورستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

پروفیسر ڈاکٹر امِ سلمیٰ

محترمہ پروفیسر امِ سلمیٰ شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کی نہایت ہی مایۂ ناز استانی تھیں۔ آپ ۲ جون ۱۹۴۷ء برہمن باڑیہ میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے اپنی ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم پاکستان میں مکمل کی۔ اس کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی سے فارسی ادب میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۹۱ء میں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا موضوع "بنگلہ دیش کے اردو اور فارسی ادب میں تاریخی ماخذ (خاص طور پر انیسویں صدی میں)" تھا۔ محترمہ پروفیسر امِ سلمیٰ کی شمولیت جون ۱۹۷۴ء میں بحیثیت لکچرار شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہوئی۔ انہیں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور انگریزی زبان میں بھی دست رس حاصل تھا۔ چنانچہ ان تینوں زبانوں میں بھی انہوں نے بہت سے مضامین لکھے۔ ان کے چند اہم اہم اردو مقالے یہ ہیں:

۱۔ عبدالغفور ناسخ کی اردو اور فارسی کی خدمات

۲۔ انیسویں صدی میں خواجگان ڈھاکہ کی اردو و فارسی خدمات

۳۔ انیسویں صدی میں فرید پور کے قاضی خاندان کی اردو و فارسی خدمات

پروفیسر امِ سلمیٰ ایک ذی فہم، کم سخن، علم دوست اور مہذب فطرت کی خاتون تھیں۔ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد شعبہ اردو و فارسی کو آراستہ و برقرار رکھنے میں مرد اساتذہ کیساتھ ساتھ یہ خاتون بھی علم و ادب کے میدان میں تاحیات گرانقدر خدمات انجام دیتی رہیں۔ انکی علم دوستی ناقابل فراموش ہے۔

طلبہ کے ساتھ پروفیسر امِ سلمیٰ کا محبت آمیز سلوک قابل یاد ہے۔ ان کی اردو بڑی سلیس و رواں تھی۔ اردو محاورہ اور روزمرہ پر ان کو بڑی قدرت حاصل تھی۔ طلبہ ان کے اردو لکچر سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر امِ سلمیٰ اندرون و بیرون ملک کے ادبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں،

اردوادب کے مشہور محقق اورادیب دانشور آنجہانی شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنی کتاب 'بنگال میں اردوصحافت کی تاریخ' میں نہ صرف محترمہ ام سلمٰی کی تحریر کے اقتباسات کو زینت بخشی ہے بلکہ ان کے تحقیقی مقالات کا حوالہ دیتے ہوئے بطور سند بھی پیش کیا ہے، یہ اعزاز کم نہیں۔ام سلمٰی کی شخصیت کی تصویر ان کی تحریروں میں بھی جھلکتی ہے۔وہ جس طرح ذاتی زندگی میں کم سخن اور شائستہ مزاج تھیں بالکل اسی طرح وہ خاموشی سے اپنی سوچوں میں غرق ہوکر چپکے چپکے اردوادب کی خدمت زندگی بھر کرتی رہیں، نہ صلہ کی پرواہ نہ ستائش کی تمنا، بہر حال آپ نہایت شستہ اور بامحاورہ اردو لکھتی تھیں۔انکی تحریروں میں کشش اور روانی ہے۔گمان بھی نہیں ہوتا کہ آپ بنگالی نژاد تھیں۔محترمہ انگریزی اور فارسی ادب پر بھی بڑی گہری نظر رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکی تحریروں میں بڑا وزن ہوتا ہے۔پاکستان، ہندوستان اور ایران کی بہت سی ادبی کانفرنسوں میں بھی آپ نے شرکت کی۔انکے بیشتر مقالات پاکستان و ہندوستان کے معیاری رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کے مقالوں کا ایک مجموعہ زیر طبع ہے جن کی ترتیب وتزیین کاری ان کے شاگردِ رشید پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی صاحب نے کی ہے۔ ۲۸

شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی میں مرحومہ پروفیسر ڈاکٹر ام سلمٰی کی خدمات ناقابل فراموش رہیں گی۔محترمہ کا انتقال ۱۱/اکتوبر ۲۰۰۸ء کو ڈھاکہ میں ہوا۔ انہیں میرپور ساڑھے گیارہ نمبر کالسی گورستان میں سپرد خاک کیا گیا۔خدائے برتر انہیں اپنے خاص رحم وکرم سے نوازیں۔

ڈاکٹر کنیز بتول

مرحومہ پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول کی پیدائش ۱۴دسمبر ۱۹۵۱ء ڈھاکہ کے مشہور نوابی خاندان میں ہوئی۔آپ کے والد صاحب کا نام نواب سید محمد علی معروف بہ "نواب چھوٹن" تھا۔ آپ کے خاندان پرانے ڈھاکہ کے باشندے ہیں۔محترمہ کنیز بتول نے ۱۹۷۱ء میں قمر النساء گرلز اسکول، ڈھاکہ کے اردو سیکشن سے اور ۱۹۷۴ء میں بدر النساء گرلز کالج، ڈھاکہ سے اردو

ورنیکلر کے ساتھ انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت بنگلہ دیش میں اردو کا ناسازگار ماحول دیکھ کر اس سلسلہ میں کچھ مایوسی جیسی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ بہتوں نے جغرافیہ یا تاریخ اسلام میں آنرز کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اسی دوران شعبۂ اردو و فارسی کے اس زمانے کا پروفیسر مرحوم ظفر الہدیٰ اور بدرالنساء گرلز کالج کی پروفیسر مرحومہ محفوظہ اسلام نے انہیں ڈھاکہ یونیورسیٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا۔ پروفیسر ظفر الہدیٰ ڈاکٹر کنیز بتول مرحومہ کے والدِ بزرگوار کے گہرے دوست تھے اور محفوظہ اسلام بخشی بازار بدرالنساء گرلز کالج میں ان کی استانی تھیں۔ شعبۂ اردو و فارسی، ڈھاکہ یونیورسٹی سے پروفیسر محفوظہ نے بھی اردو میں ایم اے پاس کیا تھا۔

چنانچہ ۱۹۷۷ء میں جب ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو آنرز، سال اول میں محترمہ کنیز بتول کا داخلہ ہوا اور انہوں نے اسی شعبہ سے ۱۹۸۱ئمیں اردو آنرز فائنل میں درجہ اول اور ۱۹۸۲ء میں اردو ایم اے فائنل امتحان میں اول درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۸۲ء کے خصوصی کنووکشن میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر عبدالمنان صاحب نے انہیں سونے کا تمغہ عطا کیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۷ء کی ۲۹ جنوری ان کا تقرر ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں لکچرار کی حیثیت سے ہوا۔

محترمہ پروفیسر کنیز بتول ڈھاکہ یونیورسٹی میں اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرتی ہوئی ایک جگہ لکھتی ہیں:

> آنرز سال اول میں میں تنہا طالبہ تھیں۔ میں جب آنرز سال سوم میں داخل ہوئی تو شمیم بانو نے فارسی کے ایم اے سال اول میں داخلہ لیا، شمیم بانو نہایت منکسر المزاج اور کم سخن تھیں۔ ان کا ذوق مطالعہ اچھا تھا۔ وہ مجھ سے بہت جلد گھل مل گئیں۔ ہم دونوں ایک ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں مصروف مطالعہ رہنے

لگیں۔ایک کو دوسرے سے مدد حاصل ہونے لگی۔ بعد میں شمیم بانو نے ۱۹۸۲ء میں فارسی میں اول درجے سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے ماڈرن لینگویجز انسٹی ٹیوٹ میں فارسی کی پروفیسر بنیں"۔

شعبہ اردو وفارسی ڈھاکہ یونیورسٹی اور بعد میں "شعبۂ اردو "ڈھاکہ یونیورسٹی میں ڈاکٹر کنیز بتول کی ادبی خدمات سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔انہوں نے کئی تحقیقی مقالے لکھ کر اپنے لئے ایک الگ مقام بنالیا ہے، یہ مقالے بنگلہ دیش، ہندوستان اور پاکستان کے مختلف موقر اور معیاری رسالوں کی زینت بن چکے ہیں۔اردو زبان میں ان کو ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ بڑی احتیاط اور سوچ سمجھ کر اپنے خیالات کو قلم بند کرتی تھیں، انکے زیادہ تر مقالات سرزمین بنگلا دیش کی بھولی بسری اور گمنام ہستیوں سے متعلق ہیں، جن کے کارناموں پر وقت اور حالات نے فراموشی کی ایک دبیز تہ جمارکھی تھی۔محترمہ نے ان شخصیات کو ازسرنو اجاگر اور روشناس کرانے کی ایک کامیاب کوشش کی اور آنے والوں کے لئے ایک بہترین نمونہ چھوڑ کر گئیں۔ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی تعداد ۴۰ سے زائد ہے۔موصوفہ چند کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔انکی اہم تخلیقات یہ ہیں:

۱۔اردو زبان میں نذرل چرچا (بنگلہ زبان میں مطبوعہ)

۲۔آتش وگل (اردو مطبوعہ)

۳۔بنگلہ دیش میں اردو ادب (۱۹۴۷-۱۹۹۰ء)، یہ دراصل محترمہ کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جسے انہوں نے ۲۰۰۴ء میں مکمل کیا اور یہ اب ساہتیہ وگیشنا کندر سے عنقریب شایع ہوگی۔

محترمہ پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول ۱ جولائی ۱۹۹۱ سے ۱ جولائی ۱۹۹۴ تک، پھر ۹ جولائی ۲۰۰۸ء سے ۱۱، نومبر ۲۰۰۸ء تک شعبۂ اردو کی چیئرمین رہیں اور اپنی بیش بہا خدمات سے شعبۂ اردو کے روشن مستقبل ہموار کرنے میں دل وجان سے کوششیں کیں۔

غرض پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول اپنے آخری دم تک اس شعبے میں تحقیقی اور تدریسی خدمات انجام دیتی رہیں۔محترمہ کا انتقال ۶ جولائی ۲۰۱۵ء ڈھاکہ میں ہوا۔۲۹

پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر

اخیر میں اس مقالہ کو نا تمام سا لگتا ہے اس میں محترمہ پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کے نام نامی کو ذکر کئے بغیر۔ اگر چہ محترمہ حین حیات ہونے کی وجہ سے اس مقالہ میں ہمارے دائرۂ تذکرہ سے باہر تھیں، نیز محترمہ نے اپنے کو کسی مصلحت کے تحت تقسیم شعبۂ اردو و فارسی کے زمانہ ۲۰۰۷ء سے شعبۂ فارسی زبان وادب کے ساتھ منسلک ہو چکی ہیں، لیکن محترمہ چونکہ ہمارے استاذ الاساتذہ کے درجے میں ہیں، ہم بھی ان سے مستفید بھی ہیں اور محترمہ ابھی بہت دنوں سے بستر علالت پر زندگی کے آخری لمحے گن رہی ہیں، اس لئے یہاں ان کی مختصر حیات اور ادبی خدمات نذر قارئین ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی پیدائش ۱۱ دسمبر ۱۹۴۷ء ہندوستان کے ممبئی شہر میں ہوئی۔ ان کے آباواجداد بنگلہ دیش میں ضلع نواکھلی کے قصبہ چاٹ کھیل کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ابتدائی، سکنڈری، ہایر سکنڈری اور بی اے آنرز (تاریخ) تک تعلیم ممبئی میں حاصل کی۔ پھر ۱۹۷۱ء میں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے اردو میں اور ۱۹۷۳ء میں فارسی میں بی اے آنرز کی دو ڈگریاں حاصل کیں۔ پھر ۱۹۸۸ء میں انہوں نے پی ایچ ڈی (اردو) کی ڈگری بھی ممبئی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کی پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع "ڈاکٹر عندلیب شادانی: حیات اور ادبی کارنامے" تھا، جو ۱۹۹۲ء میں ڈھاکہ سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس وقت محترمہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی زبان وادب سے ریٹایرڈ ہونے کے بعد اپنی زندگی کے آخری لمحے بستر علالت پہ گزار رہی ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کے اشاعت پذیر تحقیقی مقالات کی تعداد ۶۰ ہیں۔ ان میں سے

چند مشہور تحقیقی مقالات یہ ہیں:

۱۔مشرقی بنگال (بنگلا دیش) میں اردو ادب کا ارتقاء اور بتدریج ترقی۔(۱۸۰۱ء تا ۱۹۴۷ء)

۲۔ڈھاکا میں اردو ادب۔(بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک)

۳۔بنگلا دیش میں اردو ادب کا مختصر جائزہ-(۱۹۷۱ء-۲۰۱۴ء)

۳۔مشرقی بنگال کے چند اہم اردو جرائد-(۱۹۰۶ء-۱۹۵۴ء)

۵۔بنگلہ دیش میں اردو کے مسائل اور امکانات

۶۔ڈاکٹر حنیف فوق قریشی (بنگلا دیش کے مایہ ناز اردو نقاد)

۷۔بنگال کی فارسی، اردو اور عربی تصانیف کی فہرست-(ثلاث غسالہ)

۸۔ڈھاکا یونیورسٹی کے کتب خانہ میں محفوظ فورٹ ولیم کالج کا نادر مخطوطہ (گل و ہرمز یعنی حسن و عشق)

۹۔ہندوستان کے مسلم مورخین۔(ڈاکٹر شادانی کا غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ)

۱۰۔شیخ سعدی کی حیات اور ان کی گلستان

۱۱۔تاریخ شعبہ فارسی اور اردو، ڈھاکا یونیورسٹی، (۱۹۲۱ء تا ۲۰۱۴ء) ۳۰

خدائے برتر محترمہ کی بقیہ حیات میں صحت و عافیت کے ساتھ نعمت دینی و دنیوی دونوں سے نوازیں۔

بالآخر قابلِ غور بات یہ ہے کہ فی الحال ڈھاکہ یونیورسٹی شعبۂ اردو سے منسلک سارے محترم اساتذہ اگر اپنے شعبہ کے کامیاب پیشرؤں کے نقش قدم پر گامزن ہونے کی کوشش جاری رکھیں تو ان شاء اللہ بتوفیق خداوندی شعبہ کی سو سالہ سنہری تاریخ کو پھر دہرایا جا سکتا ہے اور ماضی جیسا روشن مستقبل دوبارہ ان کے قدموں کو چومیگا، وہ بھی اپنے پیشرؤں جیسے کامیاب رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، "بنگلا دیش میں اردو ادب"، بنگلہ۔اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، ڈھاکہ، اشاعتِ اول: اپریل ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۷-۱۴۸۔

۲۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، تاریخ شعبۂ فارسی واردو (از ۱۹۲۱ء تا بہ حال)، ''۷۵ سالہ یادگار''، شعبۂ فارسی واردو"، ڈھاکہ یونیورسٹی، دسمبر ۱۹۹۶ء، ص ۷۵-۱۰۵

۳۔ رفیق الاسلام، ''ڈھاکر گوتھا'' (شہر ڈھاکہ کی تاریخ پر ایک بنگلہ کتاب)، احمد پبلیشنگ ہاؤس، ڈھاکہ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳۶-۱۴۰

۴۔ نصابِ شعبۂ اردو (۲۰۱۸ تا ۲۰۲۳ء)، ڈھاکہ یونیورسٹی، فروری ۲۰۲۰ء، ص ۳؛ سید رضاء الرحمٰن، گوربو جحل ڈھاکہ یونیورسٹی، مؤر، ڈھاکہ، جون ۲۰۰۱، ص ۲۶-۲۷

۵۔ فدا علی خان، "زہریلا درخت"، کتابستان، الٰہ آباد، ۱۹۳۱ء، مقدمہ

۶۔ M.A.Rahim,The Histry of The University of Dacca,University of Dacca,1922,P 28-30؛ ڈھاکہ یونیورسٹی اینویال رپورٹ، ۱۹۲۱-۱۹۳۵ء تک، ص ۲-۳۲

۷۔ بنگلہ پیڈیا، ایشیاٹک سوسائیٹی ڈھاکہ، ۲۰۰۳ء، جلد ۷، ص ۶۵

۸۔ نصابِ شعبۂ اردو، ص ۳

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، "بنگلا دیش میں اردو ادب"، ص ۷۸-۸۰؛ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ''ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے)''، راجا پبلیکشنز، ڈھاکا یونیورسٹی، ڈھاکا۔ ۱۹۹۲ء، ص ۱۰-۳۰

۱۱۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، "تاریخ شعبۂ فارسی واردو"، ڈھاکہ یونیورسٹی پچھتر سالہ یادگار، دسمبر ۱۹۹۶ء، ص ۷۸-۸۰

۱۲۔ بنگلا دیش میں اردو ادب، ص ۶۷-۸۰

۱۳۔ پچھتر سالہ یادگار

۱۴۔ بنگلا دیش میں اردو ادب، ص ۱۴۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۵۶

۱۶۔ پچھتر سالہ یادگار، ایضاً، ص ۸۴- ۸۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۸۵-۸۶؛ بنگلا دیش میں اردو ادب، ص ۱۵۰

۱۸۔ ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری پی ایچ ڈی شعبہ میں موجود ڈاکٹر صاحب کے قلمی نسخہ کے مطابق۔

۱۹۔ محمد اشرف الاسلام، ڈھاکہ یونیورسٹی اور علاقہ کی تاریخ (۱۵۹۹-۲۰۱۲) خوشروز کتاب محل، ڈھاکہ، ۲۰۱۴، ص ۶۰۶؛ ڈاکٹر صاحب کے اکلوتے بیٹے مولانا نعمت اللہ (ثانی امام ۱۷ پرانا پلٹن جامع مسجد ڈھاکہ) سے براہ راست لئے گئے حقائق، اور ان کی فیملی ڈائیری کے مطابق۔

۲۰۔ پچھتر سالہ یادگار، ص ۲۵، ۸۰-۸۶

۲۱۔ نصاب شعبۂ اردو، ص ۳

۲۲۔ قابل افتخار ڈھاکہ یونیورسٹی، ص ۲۶-۲۷؛ بنگلا دیش میں اردو ادب، ص ۱۶۳

۲۳۔ پچھتر سالہ یادگار، ص ۱۱۹- ۱۲۶

۲۴۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ: اسلام کی نشأت ثانیہ میں ان کی خدمات، اسلامک فاؤنڈیشن پتریکا، سال: ۴۹، شمارہ: ۱، جولائی- ستمبر ۲۰۰۹ء، اسلامک فاؤنڈیشن ڈھاکہ، ص ۱۲۴-۱۴۷؛ ۲۵۔ پچھتر سالہ یادگار، ص ۱۲۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۷-۲۶

۲۷۔ ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ: ۴، سال: ۲۰۱۱ء، سال اشاعت: مئی ۲۰۱۳، ص ۷۱-۸۶

۲۸۔ پچھتر سالہ یادگار، ص ۱۲۴

۲۹۔ ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ: ۷، ص ۱۰۸-۱۱۷؛ بنگلا دیش میں اردو ادب، ص ۱۶۰

۳۰۔ بنگلا دیش میں اردو ادب، سابق، ص ۶

شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کے چند طلباء کی اردو خدمات

ڈاکٹر محمد رضا الکریم

Abstract: Dhaka University is renowned to the world for its educational excellences since the inception. This educational institution was established on 1st July 1921. This university is also known to all as the 'Oxford of the East'. The motto of this organization is to educate the East Bengal's masses specially the Muslim community in this region. Sir PJ Hartog belonged the position as the first vice chancellor of this institution. This University started of its long cherished journey with three faculties (Faculty of Arts, Science and Law) along with twelve departments. The department of Urdu and Persian was one of the major significant department to contribute in literary world from the beginning to till date. Mr. Khan Bahadur Fida Ali while treated as the first head of the department from (1921 to 1935). After that a lot of eminent personalities was contributing in this department, such as Dr. Moidul Islam Burah, HMZH Azad, Dr. Andalib Shadani, Dr. Aftab Ahmad Siddiqi, Professor. Dr. Md. Abdullah is well known to all in this regards. It goes without saying that the department of Urdu is trying to contribute behind the human development since the last century. There are some renowned students of this department

پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

who took places a dynamic role in the arenas of Urdu language and literature (Dr. Abu Sayeed Nuruddin, Dr. Abdul Haque, prof. kalim Shasarami, Dr. Shamim, Dr. Husain Ahmad Kamali etc.) would like to be explained their major contributions in this article.

سابق مشرقی بنگال فی الحال بنگلا دیش کی راجدھانی ڈھاکہ میں قائم شدہ ڈھاکہ یونیورسٹی ساری دنیا میں بہت ہی مقبول اور مشہور ہے۔اس تعلیمی ادارہ کا قیام یکم جولائی ۱۹۲۱ء میں عمل میں آیا۔اس یونیورسٹی کو عام لوگ "مشرق کے وکسفورڈ" کے نام سے پہچانتے ہیں۔ڈھاکہ یونیورسیٹی کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس زمانے کے مشرقی بنگال یعنی ڈھاکہ کے قرب و جوار کے علاقے کے لوگوں کو خاص کر مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کرنا ہے۔اس یونیورسیٹی کے پہلے وائس جانسلر جناب پی جے ہارٹگ (Hartog Mr. P.J) تھے۔اس یونیورسیٹی کے قیام کیاس میں صرف تین فکلٹیواں تھیں۔فیکلٹی اَف ارٹس، فکیلٹی اَف سائنس اور فیکلٹی آف قانون ان تین فکلٹیوں میں صرف بارہ شعبوں دوران کولیکر ۱۹۲۱ء میں یہ یونیورسٹی تعلیمی سفر کا آغاز کیا۔ان شعبوں میں سے شعبۂ اردو و فارسی بہت ہی اہم اور قابل ذکر ہے۔شروع سے اس شعبہ کا نصاب تعلیم دیگر شعبوں کی طرح کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب تعلیم پر مبنی تھا۔ شعبۂ اردوو فارسی کے پہلے صدر اور ریڈر کی حیثیت سے جناب فدا علی خان (۱۹۲۱۔۷ سے ۱۹۳۵-۶-۳۱) کا نام قابل ذکر ہے۔فدا علی خان کے علاوہ شعبۂ اردو اور فارسی میں بہت سارے صدر و چیئر مین، محققین، ادباء و شعراء اردو ادب کی خدمات میں اہم کردار ادا کئے ہیں ان میں ڈاکٹر معید الاسلام بورہ، یس ام زیڈ ایچ آزاد، ڈاکٹر دجاہت حسین شادانی، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، فیض احمد چودھری، رستم علی دیوان، پروفیسر محمد عبداللہ، پروفیسر کلثوم ابوالبشر، پروفیسر کنیز بتول، ڈاکٹر زینت آراشیراجی، پروفیسر جعفر احمد بھویاں کے

نام سرفہرست ہیں۔ پھر ڈھاکہ یونیورسٹی کے اعلیٰ حکام نے شعبۂ اردو و فارسی کو شعبۂ اردو اور شعبۂ فارسی زبان و ادب کے نام سے علاحدگی اور انفرادی حیثیت دینے کا فیصلہ کیا۔ جس کی بنا پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں ۲۰۰۷ء میں شعبۂ اردو انفرادیت کے ساتھ اپنا سر بلند کیا۔ اور ایک نئی پہچان کے ساتھ اپنا نام اجاگر کیا۔ اس نئے شعبۂ کی پہلی چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر ام سلمٰی بنیں۔ اس کے بعد شعبۂ اردو کے جن محترم اساتذۂ کرام اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے جد و جہد و کوشش کر رہے ہیں ان میں سے پروفیسر محمود الاسلام، پروفیسر غلام ربانی، پروفیسر اسرافیل۔ ڈاکٹر رشید احمد، راقم الحروف ڈاکٹر محمد رضاء الکریم، جناب غلام مولا، جناب حسین البناء اور محترمہ حفصہ اختر کے نام سرفہرست ہیں۔ شعبۂ اردو سے تحصیل علم کے بعد بعض طلبہ ایسے ہیں جو بنگلا دیش اور بیرونی ممالک میں اردو زبان اور ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور بعض طلبہ ایسے ہیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی استاد کی حیثیت سے علم کی شمع روشن کر رہے ہیں۔ بڑی فخر کی بات یہ ہے کہ یہاں سے اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد چند طلباء ایسے ہیں جو محققین، نقادین، ادباء، شعراء، مصلحین سماج کی حیثیت سے بنگلا دیش اور بیرونی ممالک میں شہرت یافتہ ہیں۔ مندرجہ بالا تحقیقی مقالہ کے عنوان کا مقصد ان ہستیوں کے متعلق مختصر طور پر تحقیق کرنا ہے جو شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دیگر شعبوں کے طلبہ کی طرح شعبۂ اردو کا سر بلند کر کے شعبوں سے باہر رہ کر ادبی، تحقیقی، سماجی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابو سعید محمد نور الدین، ڈاکٹر عبد الحق، راشد الرحمٰن کاکوی، ڈاکٹر کلیم سہسرامی، محترمہ جہان آرا چودھری، ڈاکٹر زین الدین، شمس الحق شیدائی، ڈاکٹر محمد شمیم خان، پروفیسر حسین احمد کمالی، ڈاکٹر یوسف حسن وغیر ہستیوں کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق:

ڈاکٹر عبدالحق بیسویں صدی کے بنگلا دیشی اور بنگلہ بولنے والے مصنفین میں سے ایک ہیں۔ ان کے متعلق پروفیسر جعفر احمد بھویاں کہتے ہیں کہ مجھے اپنے محترم جناب ڈاکٹر محمد عبداللہ سے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق ۱۹۵۳ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مدرسہ عالیہ میں اردو پڑھاتے تھے۔ جب میں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے عالیہ مدرسہ گیا تو وہاں کے عمال نے مجھے بتایا کہ آزادی سے پہلے یہاں کام کرنے والوں کے تمام ریکارڈ تباہ ہو چکا ہے۔ جب یہ خبر ڈاکٹر عبداللہ تک پہنچی تو انہوں نے مجھے راجشاہی یونیورسٹی جا کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ہدایت کی۔ کیونکہ ڈاکٹر عبدالحق راج شاہی یونیورسٹی میں بھی کام کر چکے تھے۔ لیکن افسوس کہ مجھے وہاں جا کر وہی جواب ملا۔ راجشاہی یونیورسٹی کی ایڈمنسٹریشن بلڈنگ کے افسران اور عمال نے کہا کہ ہمارے یہاں آزادی سے پہلے کے اساتذہ کے بارے میں کوئی ریکارڈ لیٹر نہیں۔ اس طرح میں مایوس ہو کر واپس آیا۔ پھر میں ڈاکٹر نورالدین کے پاس ان کی سوانح حیات جاننے گیا کیونکہ آپ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے وہ ہم جماعت تھے۔ وہاں سے واپس آ کر میں ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی طرف سے ان کے بارے میں دی گئی معلومات کو میں بیان کر رہا ہوں۔ ۱

ڈاکٹر عبدالحق کی پیدائش انگریزی دور میں ضلع کملا میں ہوگی۔ ابتدائی تعلیم کملا ہی میں حاصل کی۔ بعدران انہوں نے ۱۹۴۸ء میں کلکتہ عالیہ مدرسہ سے حدیث میں میں کامل پاس کیا۔ بعد میں وہ ۱۹۵۲ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی سے اردو میں بی اے (آنرز) کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس کے علاوہ ۱۹۵۳ء سیکنڈ ڈیویشن میں پہلی پوزیشن میں ام۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۶۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر عبدالحق پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے تحقیقی مقالہ کا موضوع تھا "اردو شاعری پر فارسی شاعری کا اثر۔۲

انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لینے کے بعد مدرسہ عالیہ میں اوّلاً اردو ادب کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے راجشاہی یونیورسٹی میں بطور لیکچرار آپ کا تقرر ہوا۔ جنوری یا فبروری ۱۹۶۳ء میں ڈھاکہ سے راجشاہی جانے کے وقت فرید پور میں ایک ہیلی کاپٹر کے حادثے میں آپ کی موت ہوگئی۔ ان کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہے۔ ہمارے محترم استاد مرحوم جناب ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب نے کہا ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا انتقال ۱۹۶۲ء یا ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ راجشاہی یونیورسٹی کے عربی کے ریٹائرڈ پروفیسر جناب ممتاز الدین اور ان کی اہلیہ دونوں نے بتایا کہ ڈاکٹر عبدالحق کی موت کا حادثہ جنوری یا فروری ۱۹۶۴ء میں پیش آیا۔ وہ یہ بھی بتا یا ہے کہ اس کی والدہ کا انتقال بھی اسی سال اور اسی مہینے میں ہوا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۶۳ء کو راجشاہی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ مجھے وہاں جوئن کرنے کے ایک سے ڈیڑھ مہینے کے بعد میں نے سنا کہ راجشاہی یونیورسٹی میں شعبہ السنہ کے استاد ڈاکٹر عبدالحق ہیلی کاپٹر کے حادثے میں انتقال کر گئے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر ممتاز کے قول کے مطابق ہم صحیح طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ان کا انتقال جنوری یا فروری ۱۹۶۴ء میں ہوا۔[۳]

محمد نظیر الدین صدیقی:

محمد نظیر احمد صدیقی کا شمار ڈھاکہ یونیورسٹی کی شعبہ اردو اور فارسی کے ذہین طلبہ میں سے ہوتا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے اس شعبہ سے اردو میں بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اسی شعبہ سے اردو میں ۱۹۵۳ء میں ام اے کا امتحان کامیابی سے پاس کیا۔ تحصیل علم کے بعد پہلی بار ڈھاکہ کے ایک کالج میں اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے ۱۹۵۴ء میں ملازمت شروع کی۔ اس کے بعد انہوں نے قائداعظم کالج ڈھاکہ، شہید سہروردی کالج اور نوٹر ڈیم کالج میں پڑھایا۔ وہ ۱۹۶۹ء میں پاکستان چلے گئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ ظہیر الحق تھا۔ وہ بہار میں

پیدا ہوئے۔۴

نظیر صدیقی کے پسندیدہ استاد ڈاکٹر عندلیب شادانی تھے۔ وہ عندلیب شادانی کے ہر کلاس میں حاضر ہوتے تھے۔ خاص طور پر اردو ادب کی بحث میں ان کی عدم موجودگی کا تصور کرنا نہیں کیا جا سکتا۔ استاد اور طالب علم کے اس قریبی تعلق کے نتیجے میں نظیر صدیقی نے خود کو اردو ادب کے ایک ممتاز ادیب اور مضمون نگار بنانے میں کامیاب رہے۔

"اظہار حسرت" نظیر صدیقی کی اہم کتاب ہے۔ جن میں وہ خدا کے خوف، موت کی یاد، اچھے خیالات اور بہترین انسانی صفات کے متعلق بیان کیا ہے۔ نظیر صدیقی کو اردو ادب میں ایک نقاد کی حسیت سے جانا جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں نہ صرف ادبی تجزیہ ہوتا ہے بلکہ زندگی کے بارے میں بھی گفتگو ہوتی ہے۔ نتیجتاً وہ وقتاً فوقتاً نظمیں سنایا کرتے تھے۔ اس کتاب میں ۶۵۰ اشعار ہیں جو غزل اور دوسرے اصناف سخن سے مالا مال ہیں۔ ان کے اشعار دلکش اور شیریں ہیں۔ اظہار حسرت ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں اسلام آباد سے شائع ہوئی۔

اس کے علاوہ نظیر صدیقی نے اردو میں بے شمار مضامین لکھے اور پچیس سے مزید نظمیں شائع کیں۔ اردو اور فارسی کے اس مایہ ناز استاد کا انتقال ۲۰۰۱ء میں ہوا۔۵

سید راشد الرحمٰن ارشد کاکوئی:

ارشد کاکوئی ۱۹۳۰ء میں ضلع بہار کے کاکوئی نامی مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام شاہ عطا الرحمٰن عطا کاکوئی تھا۔ انکے والد بہار کے ایک سرکاری کالج میں کام کرتے تھے۔ ارشد کاکوئی نے ابتدائی تعلیم بہار سے حاصل کی۔ وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی کے طالب علم تھے۔ ۱۹۵۱ء میں اس شعبہ سے اردو میں ایم اے کیا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۵ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے وونرز پاس کیا اور یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۴ء میں کومیلا وکٹوریہ

کالج میں بطور لیکچرار اردو ان کا تقرر ہوا۔ ان کا انتقال ۱۹۸۳ء میں ڈھاکہ میں ہوا۔ اپنی موت کے وقت، انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کی لائبریری کو ۵۰۰ اردو رسالوں پر مشتمل اپنی کتابوں کا ایک ذخیرہ عطا کیا۔ فی الحال ان رسالوں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ ارشد کا کوئی زمانہ طالب علمی سے ہی اردو ادب کی طرف راغب ہوئے۔ خاص طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد ان کی ادبی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ان کے قابل ذکر بہترین اساتذہ میں سے ایک تھے۔ وہ شادانی کے پسندیدہ شاگردیں سے تھے۔ جون ۱۹۸۵ء میں شائع ہونے والے اردو میگزین جوبر میں ان کی یادداشتوں میں کہا گیا ہے، اردو زبان کی اصلاح اور ترقی کے لیے انہوں نے انتھا تک محنت کی ہے۔ اور وہ اردو کے قابل ذکر سرپرست میں سے تھے۔ ارشد کا کوئی نے ۱۹۶۰ء میں ایک اردو ماہنامہ ندیم شائع کیا۔ وہ خود اس کی تدوین کے انچارج تھے۔ انہوں نے بے شمار نظمیں، مضامین، کہانیاں لکھی ہیں جو مختلف ماہنامہ، سہ ماہی اردو رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ ۶

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین:

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا ایک طالب علم تھے۔ انہوں نے ضلع میمن سنگھ کے ایک گاؤں پنچرخی کے ایک مسلم گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مولوی عبدالحکیم تھا۔ وہ اپنے علاقے میں ایک زبردست عالم کی حیثیت سے مقبول تھے۔ نورالدین اپنی عربی فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی۔ انہوں نے ۱۹۴۴ء میں ضلع شیر پور کے ایک سینئر عالیہ مدرسہ سے فاضل کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا ۷۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ممتاز المحدثین کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں انہوں نے ۱۹۴۷ء میں سراج گنج کے ایک کالج سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی سے بی اے آنرز اردو اور ۱۹۵۲ء میں ایم اے کا امتحان پاس

کیا۔ ۱۹۵۸ء میں وہ کراچی یونیورسٹی سے "اسلامی تصوف اور علامہ اقبال" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران پاکستان کے علامہ اقبال اکیڈمی سے ریسرچ فیلو کی حیثیت سے ان کو اسکالرشپ ملا۔ ان کا تحقیقی مقالہ "اسلامی تصوف اور علامہ اقبال" ۱۹۵۹ء میں اقبال اکاڈمی لاہور سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ۷ ڈاکٹر ابو سعید نورالدین کا یہ تحقیقی مقالہ ایک مقدمہ اور سولہ ابواب پر مشتمل ہیں۔ وہ بنگلہ دیشیوں میں سے سب سے پہلے کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کی پی ایچ ڈی ڈگری کا نگراں ڈاکٹر مولوبی عبدالحق تھے۔ اس وقت کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اردو نہیں تھا۔ لیکن اس کے بعد ڈاکٹر ابوسعید نورالدین کی کوششوں سے اور مولوی عبدالحق کو چیئرمین بن کے کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کا افتتاح ہوا۔

'مہاکوی اقبال' (عظیم شاعر اقبال) نام سے ان کی ایک کتاب ۱۹۹۶ء میں علامہ اقبال شنکشد، بنگلہ دیش سے شائع ہوئی۔ "مہاکوی اقبال" ان کے ایک ممتاز ادبی کارنامہ ہے۔ بنگلہ زبان میں لکھی ہوئی یہ تصنیف میں علامہ اقبال کی حیات اور ان کی ادبی خدمات بیان کیا گیا ہے۔ بعد میں انہوں نے وقتاً فوقتاً بہت ادبی مضامین بھی لکھے جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ۸۔ نثر نگاری کے علاوہ ان کو تراجم کی صلاحیت بھی تھی۔ ان کی مادری زبان بنگلا ہونے کے باوجود تعلیمی زبان کی حیثیت سے وہ اردو اور انگریزی استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے کئی بنگلا کتاب کو اردو میں ترجمہ کیا۔ اردو ادب کی فروغ دینے کے سلسلے میں ان کی لکھی ہوئی اردو کتاب۔ بنگلہ سیلاب (۱۹۴۵ء) دیرینہ آرزو (۱۹۵۴ء) 'نذرالاسلام' قابل ذکر ہیں۔ انکی لکھی ہوئی ایک تاریخی کتاب "تاریخ ادب اردو" بہت ہی مقبول اور مشہور ہے۔ ڈاکٹر نورالدین کی اسلوب تحریر نہایت شگفتہ، دلکش ہے۔ ان کی زبان نہایت صاف ستھری، سہل و سادہ فصیح اور بامحاورہ ہے۔ نورالدین کو اردو ادب میں ایک اچھے نثر نگار اور معیاری نقاد کہلانے کے مستحق ہیں۔ ۹

مقالات:

اردو ادب کی ترقی میں انہوں نے مختلف النوع موضوعات پر بہت مقالے لکھے ہیں ان میں سے حسب ذیل میں قابل ذکر ہیں۔

1۔ وحدت الوجود اور فلسفۂ خودی: جولائی، ۱۹۶۲ء اقبال اکاڈمی، کراچی۔ 2۔حیات عبدالحق کے چند اہم پہلو۔ 3۔ شاہ جلال یمانی۔4۔اردو افسانہ بنگلادیش میں۔ 5۔ بنگلادیش کے اردو افسانہ نگار۔6۔ اقبال کا فلسفۂ حیات۔7۔ علامہ اقبال اور مولانا رومی۔8۔اقبال کا نظریہ انسان کامل: ۱۹۵۷ء۔9۔طوفان حوادث: ستمبر ۱۹۶۵ء،10۔ مشرقی پاکستان میں اردو: اکتوبر ۱۹۶۵ء،

انگریزی مقالہ

1. "Allamalqbal's"AttitudeTowards Sufism Hazrat Baba Maegbhandari:Chittagong-Aland of Tombs and Mazars in daily life Allama Iqbal's Massage of Action,3

زین العابدین:

زین العابدین بنگلہ دیش کے اردو داستان میں ایک منفرد ذہین شخصیت ہیں۔ وہ ۱۹۳۶ء میں الہ آباد، انڈیا میں پیدا ہوئے۔اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد، وہ ڈھاکہ چلے آئے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو فارسی سے اردو میں ایم اے پاس کیا۔انہوں نے کئی مختصر کہانیاں اور فلمی کہانیاں لکھیں۔ان کی زیادہ تر کہانیاں شہری متوسط طبقے کی زندگی کی خوشیوں اور غموں اور یہی معاشرے کے مسائل کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ان کی قابل ذکر کہانیاں ' کوئیلا'، ' کرشک'، 'رکھل' وغیرہ ہیں۔انہوں نے ۱۹۷۱ء کی جنگ آزادی کے بعد بنگلہ دیش کے دیہی مسائل خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔۱۰

احمد زین الدین:

ان کا اصل نام زین الدین احمد صدیقی ہے۔ ان کے والد کا نام مولوی عبدالستار ہے۔ وہ ۱۹۳۹ء میں شمالی ہندوستان کے غازی پور ضلع میں پیدا ہوئے۔ ایک نوجوان کے طور پر وہ ۱۹۵۱ء میں اپنے والد کے ساتھ ڈھاکہ چلے آیے ۔ڈھاکہ میں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۷۵ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ۱۹۸۱ء میں ڈھاکہ سے کراچی چلے گئے اور وہیں مقیم ہوئے۔ اردو ادب کے کہانی کار، مضمون نگار اور مترجم کی حیثیت سے وہ شہرت یافتہ تھے۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں وطن کی مٹی اور عوام کی خوشیاں اور غم شامل ہیں۔ انہوں نے شہری متوسط طبقے کی زندگی کی خوشیوں اور غموں، محرومیں، سماجی جرائم اور دیہی کسانوں کے مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی سولہ کہانیوں کا مجموعہ ۱۹۹۶ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ ان کی کہانی 'تیرا تیرگی کے داغ' بنگلہ دیش میں جوٹ کے کسانوں کے مسائل اور ان کے ساتھ جوٹ کے تاجروں کی ناانصافی کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ یہ کہانی جوٹ کے کسان کی حقیقی زندگی کو ظاہر کرتی ہے۔ ۱۱

پروفیسر کلیم سہسرامی:

پروفیسر ڈاکٹر محمد کلیم سہسرمی کا خاندانی نام محمد کلیم تھا۔ وہ سہسرامی کے نام سے معروف ہوئے۔ ہندوستان کے صوبہ بہار کے سہسرام ضلع میں ۱۲ جنوری ۱۹۳۰ء وہ پیدا ہوئے ۱۲۔ ان کے والد ماجد کا نام محمد کریم تھا۔ ڈاکٹر کلیم شہسرامی کی عربی، فارسی اور اردو کی بنیادی تعلیم سہسرام کے مدرسہ کبریا سے ہوئی۔ وہ سہسرام اسکول سے میٹرکلشن پاس کیا۔ بعد میں نیشنل کالج (بہار) میں آئی اے کے طالب علمی کے دوران سابق مشرقی پاکستان حال میں بنگلا دیش چلے آئے ۔بنگلا دیش میں آکر انہوں نے ڈھاکے میں بود باش اختار کی۔ ڈھاکہ ڈگری گالج سے آئی اے کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں داخلہ

لیا۔ اور وہاں سے ۱۹۵۲ء میں اردو میں بی اے آنرز اور ۱۹۵۹ء میں اردو میں ایم اے کے امتحانات میں درجہ اول میں پاس کیا۔ ۱۹۶۴ء میں وہ اس یونیورسٹی سے فارسی میں بھی ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیمی زندگی ختم کرنے کے بعد انہوں نے راجشاہی یونیورسٹی کے شعبہ السنہ میں بحیثیت لکچراران کی ملازمی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس شعبے میں ہی وہ ترقی کیا اور وہاں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعد میں ۱۹۶۵ء میں وہ فارسی زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے تہران گئے۔ وہاں میں انہوں نے تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹر حسن منوچہر کی نگرانی میں ۱۹۷۰ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا "بنگال میں اسلامی تصوف اور اس کے ادبی وثقافتی اثرات"۔ وہ شعبہ السنہ راجشاہی یونیورسٹی میں درس وتدریس میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی علمی وادبی کاوشوں سے خوشگوار ہوکر حکومت پاکستانکی طرف سے ان کو ۱۹۵۹ء میں ایک انعام خصوصی ملا۔ بعدازاں ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کی ولادت کے سوسالہ جشن ولادت کے موقع پر لاہور میں منعقد سمینار میں مقالہ پیش کرنے کی وجہ سے انکو "علامہ اقبال طلائی تمغہ" سے نوازا گیا۔ ۱۲

تصنیفات:

"بیمار بلبل": یہ کتاب وافر کا لکھا ہوا ایک ڈرامہ ہے۔ بعد میں کلیم سہسرامی نے ''بیمار بلبل'' کے نام سے دیکر ایک تحقیقی مقدمہ لکھ کر اسے مرتب کیا۔ یہ کتاب مغربی بنگال اردو اکیڈمی سے شائع ہوئی۔ "بنگال میں غالب شناسی: یہ کتاب کلچرل اکادیمی، اقبال روڈ، ڈھاکہ سے مطبوع ہوئی۔ دراصل یہ کتاب غالب کے متعلق پانچ تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ بنگال میں غالب کے تلامذہ ومقلد ومترجم اور مختلف شعروں وادب کے تذکروں کے علاوہ غالب کے بنیادی ادبی روایہ وادبی رجحان بیان کیا گیا ہے۔ تصنیف شدہ یہ کتاب اردو ادب کے تحقیقی ذخیرہ میں قابل یادگار ہے۔

روایت و درایت: یہ کتاب ایک عام تنقیدی و تحقیقی دستاویز ہے۔ جو ۱۹۹۱ء میں نقاد پبلشر سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ روایت و درایت کلیم سہسرامی نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کی ہے۔ پہلے حصے میں سات مقالے تنقیدی اور فکر انگیز ہیں۔ دوسرے حصے میں چھ مقالات تحقیقی ہیں۔ مجموعی طور پر دونوں حصوں کا تعلق تحقیقی و تنقید سے ہے۔۱۳

دوسرے حصے میں۔''نواب نصیر حسین خیال کی ایک نا در تحریر'ادیب الملک نواب نصیر حسین خیال کی آپ بیتی ''سہسرام کا اردو اسٹیج''، رسالہ جہادیہ''صغیر بلگرامی کی ایک بیاض،صغیر کی ایک نایاب نظم،''وغیرہ تحقیقی مضامین ہیں۔ اس حصے میں نصیر حسین خیال کی ایک نادر تحریر کا جائزہ پیش کر کے مصنف نے تحقیق کا قابل قدر خدمت انجام دیا ہے۔ یہ تحریر ڈھاکا یونیورسٹی کے مخطوطات میں محفوظ ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے لے کر پانچویں دھائی تک بہار کے چند ادبی ساتھیوں اور ان کی ادبی سرگرمیوں کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا ہے۔

مآثر بنگال: یہ بھی کلیم سہسرامی کا ایک لا زوال ادبی کارنامہ ہے۔ جو دار الادب، پٹنہ سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا۔ ۲۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مآثر بنگال پانچ تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں صرف بنگال نے فارسی و اردو کی کیا خدمات انجام دیں ہیں اس کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

''خدمت گزاران فارسی در بنگلا دیش: یہ کتاب جمہوری اسلامی ایران، ڈھاکہ سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔ دراصل یہ کتاب بنگلہ دیش میں فارسی ادباء و شعراء کی خدمات کا قابل قدر نمونہ ہے۔۱۴

علاوہ ازیں کلیم سہسرامی کی تصنیفات، تحقیقی و تنقیدی مضامین برصغیر کے اردو و فارسی کے جرائد دلربا ڈھاکہ، ماہ نو کراچی، خاور ڈھاکہ، ندیم ڈھاکہ، ساقی کراچی، 'روح ادب کلکتہ، نوائے

ادب پٹنہ، انتخاب سید پور، ادب، ڈھاکہ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں ۱۵۔ مختصر یہ کہ کلیم سہسرامی بنگلہ دیش کے ممتاز محقق اور مقبول نقاد کہلانے کے قابل ہیں۔ تحقیقی وتنقیدی مضامین کے علاوہ کلیم سہسرامی نے شعر وشاعری میں بھی شغف حاصل کیا۔ وہ اردو، فارسی اور انگریزی زبان کے ماہر تھے۔ وہ بنگلہ دیش کے علاوہ برصغیر ہندو پاک اور ایران میں اردو اور فارسی ادب کے ایک بہترین ادیب ونقاد کی حیثیت سے شہرت یافتہ تھے۔

شمس الحق شیدائی:

شمس الحق شیدائی کا اصل نام شمس الحق ہے اور تخلص شیدائی ہے۔ ان کے والد کا نام حکیم عبدالوحید تھا۔ آپ ۱۹۱۳ء میں موجودہ ضلع رہتاس کا صدر مقام سہسرام بہار میں پیدا ہوئے۔ ۱۶ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے میٹرک اور کلکتہ اسلامیہ کالج کلکتہ سے انٹر میڈیٹ، ۱۹۳۵ء میں اسی کالج سے فارسی میں بی۔ اے آنرز کا امتحان کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ بعد میں وہ جوبلی اسکالرشپ لے کر کلکتہ یونیورسٹی کے فارسی ایم۔ اے کلاس میں داخلہ لیا۔ اور وہاں سے ۱۹۳۷ء میں امتحان دے کر درجۂ دوم کی سند حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں وہ ڈھاکا یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کا امتحان دیا اور اول درجے میں اول آئے۔ تعلیمی زندگی ختم کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۳۵ء میں برہم پور کالج میں فارسی کے لکچرار مقرر ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں تعلیم اور نفسیاتی تعلیم کے لئے ایڈنبرا گئے۔ پھر اس کے بعد راجشاہی کالج میں ایک سال تک اردو کے مدرس رہے۔ بعد میں ان کا تبادلہ راجشاہی ٹریننگ کالج میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے ہوگیا۔ ان کا آخری تقرر دائرکٹر محکمہ تعلیمات راجشاہی ڈویژن کی حیثیت سے ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں اس عہدے پر برقرار رہ کر ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔ شیدائی ڈھاکا یونیورسٹی میں شعبہ اردو وفارسی کے بیرونی ممتحن بھی رہے۔ ۱۷

مطبوعہ تصانیف:

۱۔مولانا ابوالکلام آزاد۔حیات اور کارنامے۔(انگریزی)

۳۔چراغ لالہ (شعری مجموعہ) ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔

شمس الحق شیدائی نے 13 فروری ۱۹۹۴ء کو اپنی رہائش گاہ دھانمنڈی میں انتقال فرمایا اور ڈھاکہ کے بنانی قبرستان میں ان کا دفن ہوئے۔۱۸

ڈاکٹر محمد شمیم خان:

ڈاکٹر محمد شمیم خان کی پیدائش ۹ جون ۱۹۵۲ء میں ہندوستان کی فتوحا میں ہوئی۔یہ شہر بہار ہندوستان کے قصبہ پٹنہ سے ۴۲ کلومیٹر پر واقع ہے ۱۸-ان کے والد ماجد کا نام محمد نور خان اور والدہ کا نام ہاجرہ خاتون ہے۔ڈاکٹر شمیم خان کے ساتھ گفتگو کے دوران وہ خود اپنی زبانی کہتے ہیں،"میری پیدائش ۹ جون ۱۹۵۲ء میں فتوحا میں ہوئی۔یہ قصبہ پٹنہ سے 24 کیلومیٹر پر واقع ہے۔والد صاحب کا اسم گرامی محمد نور خان، والدہ مترمہ کا نام ہاجرہ خاتون اور میری شریک حیات کا نام سلمہ خاتون ہے۔میری بیگم کے والدین لکھنو سے تعلق رکھتے ہیں۔میرے والد صاحب کا خاندان مختصر، متوسط مگر خوش حال تھا۔ہم تین بھائی اور چار بہینی تھے۔ان میں، میں سب سے چھوٹا تھا۔میرے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد نبی عالم خان سابق مشرقی پاکستان چلے آئے۔وہ سید پور، ضلع رنگپور میں قیام کئے۔یہاں سے انہوں نے اسکول اور کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد راجشاہی میڈیکل کالج سے M.B.B.S کی ڈگری حاصل کی ۱۹۶۲ء میں بھی ان کے پاس چلا ایا۔میں نے سید پور قائداعظم ہائی سکول سے ۱۹۶۷ء میں S.S.C اور سید پور کالج سے H.S.C پاس کرنے کے بعد ۱۹۷۲ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کے شبعہ اردو و فارسی میں بی اے انرز (اردو) میں داخلہ لیا۔بنگلا دیش کے قیام کے بعد اس وقت میں اردو انرز میں داخلہ لینے والوں میں واحد طالب علم تھا۔ ۱۹۔ڈاکٹر محمد شمیم خان شعبہ اردو و فارسی

سے ۱۹۷۷ء میں بی اے ونرز اور ۱۹۷۸ء میں ام۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیمی زندگی ختم کرنے کے بعد ڈاکٹر محمد شمیم خان نے ۱۹۸۳ء میں اردو کے لیکچرر کی حیثیت سے چاٹگام گورنمنٹ کالج میں جوائن کیا۔ چند سنہ بعد انہوں نے راجشاہی یونیورسٹی کے شعبہ السنہ میں اردو کی لکچرار کی حیشیت سے تقرر ہوگیا۔ راجشاہی یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران انہوں نے ڈھاکا یونیورسٹی سے ۱۹۸۴ء میں فارسی میں ایم اے کی سنہ حاصل کی۔ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۱ء تک انہوں نے شیعہ السنہ کا چیر بھی رہے۔ اس وقت اس شعبہ میں چار اساتذہ درس و تدریس کی خدمات انجام دے رے تھے۔ جن میں پرفیسر ڈاکٹر محمد کلیم، جناب عبدالوہاب، ڈاکٹر کنایی لال رائے اور ڈاکٹر شمیم خان اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے- انہوں نے ۱۹۹۳ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کے "انسٹیٹیوٹ آف زبانہای جدید" میں ڈاکٹر کلثوم ابولبشر کے زیرنگرانی پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کرایا۔ ان کی مقالے کا عنوان تھا حکیم حبیب الرحمن: حیات اور کارنامے۔

وہ چند ماہ تک اسی موضوع پر مواد اکٹھا کرنے میں مشغول رہے۔ اسی دوران سے ۱۹۹۴ء میں تہران یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ میں داخلہ لیا۔ اسی یونیورسٹی سے ۱۹۹۷ء میں زبان اور ادبیات فارسی میں ایم اے اور ۱۹۹۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انکے مقالہ کا عنوان تھا" تصحیح انتقادی داستان عبرت بار" ان کو پاکستان، ہندوستان، ایران اور بنگلا دیش کے بہت سارے ادیبوں کے ساتھ ملنے کا موقع ملا۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال کے بڑے صاحبزادے جاسٹس جاوید اقبال، ڈاکٹر جاوید کرم شاہ، ڈاکٹر آفتاب احمد (پاکستان)، ڈاکٹر ذبیح اللہ، ڈاکٹر جعفر شہیدی، (ایران) پروفیسر نذر احمد، پروفیسر شریف حسن قاسمی، ڈاکٹر سید اختر حسین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر محمد شمیم خان کو اردو اور فارسی ادب کے بہت سارے قومی اور بین الاقوامی سیمینار میں اپنے تحقیقی مقالہ پڑھنے کا موقع ملا۔ ۲۰

ڈاکٹر محمد شمیم خان کو پاکستان، ہندوستان، ایران اور سعودی عرب کے مختلف مقامات کا سفر کرنے کا موقع ملا۔ ان میں فردوسی، عمر خیام، فرید الدین عطار اور حضرت امام غزالی کے مزاروں پر بھی حاضری دی، اسکے علاوہ ہند و پاکستان کے حضرت نظام الدین اولیا، حضرت امیر خسرو، حضرت معین الدین چشتی، حضرت راما گنج شکر رمی اور ڈاکٹر علامہ اقبال کے مزاروں پر دعا فاتحہ فوانی کا موقع ملا۔

مقالات

ا۔مولانا عبداللہ اور انکی اردو شاعری مجلی قومی، زبان, اردوا کادیمی, کراچی پاکستان، ۱۹۸۴ء

۲۔فہرست نسخ خطی حکیم حبیب الرحمٰن، مجلّہ دانش، اسلام آباد، پاکستان، ۱۹۹۸ء

۳۔কবি হাফিজ ও তার কাব্য প্রতিভা, রাজশাহী বিশ্ববিদ্যালয়, ২০০৩

4۔ڈاکٹر شیخ مقصور صلالی، شعر و ادب اور چام بین ؒاقوامی ٹیسیہ کانفرس، تہران ۲۰۰۳ء

5۔ بررسی نقد سفر نامہ زین العابدیں شیروائی، جنرل آف پرشیل انیڈ اردو ڈھاکا یونیورسٹی ۲۰۰۴ء

6۔ڈکٹر کلیم سسرامی واخدمات زبان وادبیات فارسی واردو گروہ زبان وادبیات فارسی، دانشکاہ راجشاھی، ۲۰۱۹ء

زبان وادبیات فارسی در بنگلہ دیش، اولیں بین الاقوامی کان فرنس، فیکلٹی آف ارٹس، یو بیورسٹی آف راجشاہی۔ ۲۰۱۹ء

پروفیسر حسین احمد کمالی:

پروفیسر حسین احمد کمالی ککسبازار ضلع کے ٹیکناف تھانہ کے ماتحت سبزنگ یونین کے کسومیہ

گاؤں میں ۱۹۶۷ء میں پیدا ہوئے ۲۱۔ان کا تعلق ایک شریف خاندان سے تھا۔ان کے والد ماجد مرحوم عبدالرشید خداترس اور غریب نواز آدمی تھے۔ان کی والدہ ماجدہ مرحوم خدیجہ بیگم تھی۔ پروفیسر حسین احمد کمالی ایکلوتے بیٹے تھے اور صرف ایک بہن تھی۔ پروفیسر حسین احمد کمالی کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

تعلیم، ملازمت اور ادبی خدمات:

پروفیسر حسین احمد کمالی اپنی زندگی کے شروع میں اپنے گاؤں میں قران مجید کی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد ٹیکناف تھانے کے مدرسہ لنگوربیل کے ایک بڑا مدرسہ میں داخل ہوئے۔ یہاں سے دیوبندی نصاب جماعت ہشتم تک پڑھا۔۱۹۸۱ء میں درجہ اوّل میں عالم پاس کیا۔انہوں نے ۱۹۸۳ء میں ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی میں داخلہ لیا۔وہاں سے اردو میں بی۔اَنرز (فرسٹ کلاس فرسٹ) اور ایم اے (فرسٹ کلاس فرسٹ) کی ڈگریاں حاصل کی۔۲۰۰۴ء میں راجشاہی یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کی پی ایچ ڈی مقالہ کا عنوان "سرسید احمد خان: حیات اصلاح تعلیم اور ان کی ادبی کارنامے تھا۔ پروفیسر کمالی ۱۹۹۴ء میں راجشاہی یونیورسٹی کے شعبہ السنہ میں لکچرار کی حیثیت سے ملازمت شروع کی۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کی موجودہ شعبہ اردو کی چیئر میں ڈاکٹر محمد رضا الکریم ان کا پہلا شاگرد ہے۔اور وہ ان کی پی ایچ ڈی ڈگری کا نگران بھی تھے۔کمالی صاحب راجشاہی اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں نو سے زائد پی ایچ ڈی اور بے شمار ام فیل کی تھیسیسوں کی ریویو کیا۔کتب سنی اور مطالعہ ان کا پسندیدہ مشّلہ ہے۔وہ درس و تدریس کے علاوہ یونیورسٹی کے مختلف فرائض بھی انجام دے رہے۔وہ راجشاہی یونیورسٹی کے قدیم ہال مطیہر ہال کی ہاؤس ٹیوٹر اور اکٹین پروسٹ بھی تھے ۲۲۔منسوخ شدہ شعبہ السنہ (حال میں شعبہ اردو) کے صدر تھے (۲۰۰۶ء-۲۰۰۹ء) تک وہ خود کو سماجی اور معاشرتی کاموں میں منسلک رکھا۔اپنے گاؤں میں ایک اسکول کے بانی تھے۔حسین احمد کمالی نے کمالی

فاؤنڈیشن کو ۲۰۲۱ء میں قائم کیا علاوہ ازیں وہ خدیجہ خاتون حافظیہ یتیم خانے کے ناظم اعلیٰ بھی ہے۔ پروفیسر کمالی اردو ادب و زبان کی ایک محقق بھی ہیں۔ ان کی بے شمار تحقیقی مقالے بین الاقوامی اور دیسی جرنل اور رسائل میں شایع ہوئے۔

ڈاکٹر سید یوسف حسن:

ڈاکٹر یوسف حسن ایک نامور سیاسی شخصیت، کامیاب معلم اور محقق کی حیثیت سے بنگلہ دیش کے اردو ادیبوں میں سے ایک شہرت یافتہ نام ہے۔ علاوہ ازیں وہ اردو نژاد ہونے کے باوجود ۱۹۵۲ء کی لسانی تحریک میں شرکت کی۔ ڈاکٹر سید یوسف حسن شعبہ اردو اور فارسی کے پی ایچ ڈی کے طالب علم تھے۔ انہوں نے ۱۹۷۱ء میں اس شعبہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ان کے نگراں تھے۔

ڈاکٹر یوسف حسن ۴-۱۱-۱۹۲۶ء میں ہندوستان کے مشہور شہر پٹنہ (بھارت) میں ایک بزرگ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید اشرف حسین تھا۔ پاک و ہند کی تقسیم تک ان کے خاندان کے تمام افراد ہندوستان تھے۔ چنانچہ حسن کا اہم وقت ہندوستان میں گزرا۔ والد انکو حصول تعلیم کے لئے مسلم یونیورسٹی علی میں ۱۹۴۳ء میں داخل کرایا۔ اور وہاں سے انہوں نے ۱۹۴۵ء میں ائی اے پاس کیا اور اسی یونیورسٹی سے بالترتیب ۱۹۴۸ اور ۱۹۴۹ء میں بی اے اور ایم اے کی ڈگر ماں حاصل کی۔ وہ اس وقت کھلنا میں ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے پرائمری اسکول میں پرنسپل کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ ۲۲ ڈاکٹر یوسف حسن اپنے دوست سجاد ظہیر کے مشورے کے مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں ڈھاکہ ائے۔ ڈھاکہ میں وہ اردو نژاد پہلے شخص تھے جنہوں نے بنگلہ زبان کو سرکاری زبان بنانے کی کے لئے اخبارات میں بیان دیا۔ وہ ۲۱ فبروری ۱۹۵۲ء کی لسانی تحریک میں اردو دان کی حیثیت سے شامل رہے۔ ان کو بھاشا شنگرم پریشد کا رکن منتخب کیا گیا تھا۔ اس وقت میں وہ نارائن گنج میں

مزدور رہنما کی حیثیت سے ٹریڈ یونیوں تحریک سے وابطہ تھے۔۲۱ فبروری کو ڈھاکہ میں طلبا کے پولیس پر لیس ء کے فائرنگ کے خلاف ہورے ملک میں شدید ردعمل کا اظہار ہوا۔۲۳ فبروری کو نارائن گنج میں مزدوروں کی احتجاجی جلوس پر پولیس نے تشدد کیا اور بہت سارے مظاہریں کو گرفتار کرلیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں ڈاکٹر یوسف حسن بھی شامل تھے۔ وہ واحد اردو دان ہیں جنہیں لسانی تحریک کو حمایت کے الزام میں پاکستانی حکمران نے گرفتار کیا۔۲۴

بیگم جہان آرا چودھری:

بیگم جہان آرا چودھری کی پیدائش ہندوستان کے مشہور شہر پٹنہ میں ۱۹۲۲ء میں ہوئی، ان کے چاروں طرف کا ماحول بنگالی معاشرت کا تھا۔ لیکن چھوٹی سی عمر سے ہی ان کا رجحان اردو کی طرف تھا۔ دہلی سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ ''چول'' سے انہوں نے اردو میں لکھنے کی شروعات کی۔ گھر کی بڑی بیٹی ہونے کی وجہ سے ان کی اس کوشش کو سب نے سراہا اور انعام کے طور پر ''بنات'' ایک اور بچوں ں کا رسالہ جو جناب راشد الخیری دہلی سے شائع کرتے تھے اسے ان کے لئے جاری کر دیا۔ بنات میں شائع شدہ بیگم جہان آرا کی کہانیاں اور نظمیں بچوں اور بڑوں میں کافی مقبول ہوئیں۔ ایک ہی جگہ سے شائع ہونے والے رسالے ''عصمت'' اور ''جواہر نسواں'' میں بھی انہوں نے بے شمار نظمیں بھی شائع کئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد 'عصمت'' ''بنات'' اور جواہر نسواں'' کراچی پاکستان سے شائع ہونے لگے لیکن بیگم جہان آرا اس وقت شادی شدہ تھیں انہوں نے اپنا شوق نہیں چھوڑا اور مشرقی پاکستان کے ڈھاکہ سے اپنے شوہر نور اللہ چودھری کی اجازت سے اپنے نئے نام جہان آرا چودھری کے نام سے رہنے مضامین شایع کرتی رہے۔۲۵

ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا مقام برصغیر پاک و ہند کے عوام اور مختلف زبان وادب کے ادباء و تعلیم یافتہ شخصیتوں کے پاس بہت بلند ہے۔ یکم جولائی 1921ء میں یہ یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد ابتک اس شعبہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد شعبہ کے طلبا بنگلا دیش اور بیرونی ممالک کے مختلف جگہوں میں اردو ادب کی خدمات جاری رکھے ہیں۔ خصوصا اس شعبہ سے اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہت سارے طلبا ایسے ہیں جو اردو ادب کے ہر اصناف مثلاً اردو نثر و نظم، شاعری، افسانہ، ڈرامہ نگاری، ناول نگاری میں اپنی خدمات انجام دیکر اردو دنیا کو روشناس کیئے۔ انکے نام اردو ادب کی دنیا میں سنہری حروف سے لکھے گئے۔ عام طور پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ چند طلبا اردو درس و تدریس کے علاوہ تنقیدی و تحقیقی مشاعروں میں حصے لیکر اردو ادب کو ایک روح پھونک دی۔ ان ہستیوں میں سے ڈاکٹر ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر کلیم سہسرامی، شمس الحق شیدائی، پروفیسر شمیم خان، پروفیسر حسین احمد کمالی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں اس شعبہ سے تحصیل علم کے بعد بعض طالب العلم بنگلا دیش اور بیرونی ممالک میں بہت اہم عہدے پر نوکری کر رہے ہیں اور اپنے فرائض انجام دینے میں کامیاب رہے ان میں سے جناب عنایت اللہ صدیقی، شفیق الحسن شہاب، حبیب الرحمن، معصوم شیخ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں۔ بنگلا دیشے اردو شابستہ۔ کامیاب پروکاشن ڈھاکہ۔ ۲۰۰۵ ص 7

2۔ ایضاً

3۔ ایضاً۔ ص۔ 17

4۔ وفا راشدی۔ بنگال میں اردو ادب۔ ص۔ 3,4

5۔ ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں۔ بنگلا دیشے اردو شاہستہ۔ ص۔ 74

6۔ایضاً

7۔پروفیسر کنیز بتول، بنگلا دیش میں اردو ادب (مرتبہ پروفیسر غلام ربانی) ص۔۲۲۱

8۔ایضاً

9۔ایضاً۔ص۔224

10۔ش۔م ساجد و ایوب حسین۔ بنگلا دیش میں اردو چھوٹو گلپو۔1992۔ص23-22

11۔ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں۔ بنگلا دیشے اردو شاہستہ۔ص86

12۔پروفیسر کنیز بتول۔ بنگلا دیش میں اردو ادب۔ص۔267

13۔ایضاً۔ص۔268

14۔ایضاً۔ص۔281-280

15۔ایضاً۔ص۔205

16۔ایضاً

17۔ایضاً۔ص۔208

18۔ڈاکٹر شمیم خان کے ساتھ گفتگو

19۔ایضاً۔

20۔پروفیسر حسین احمد کمالی کے ساتھ گفتگو۔ڈاکٹر محمد شمیم خان کے ساتھ گفتگو۔

21۔ایضاً

22۔احمد الیاس۔ بنگلہ لسانی تحریک اور ڈاکٹر سید یوسف حسن کی خدمات پر کلیدی مقالہ۔ بنگلہ اردو ساہیتہ فورام۔ص۔3-5

اردو ساہیتہ فورام۔ص۔3-5

23۔ایضاً۔3-8

24۔ایضاً

25۔نفیسہ جمال، بنگالی اردو شاعرہ بیگم جہاں آرا چودھری، حیات اور ادبی خدمات، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ ۵، ۲۰۱۲، ص۔ ۲۴۸۔۲۵۰،

جہاں آرا چودھری، ، تخلیقات جہاں آرا [مرتبین پرفیسر نفیسہ جمال اور پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی]، ڈھاکہ: ساہتیہ وگیشنا کندرا، ۲۰۲۱

شعبہ اردو کے زیر اہتمام
بین الاقوامی کانفرنس: تحقیق کے نئے افق

شمیم بانو

Abstract

Urdu Department of Dhaka University completed and celebrated its birth centenary (1921-2021). It is one of the most pioneering departments of Dhaka University. The department upholds cultural diversity. The department arranged several international conferences on Urdu language and literature during these years. Attempts were made to highlight the research works and their academic excellence in those seminars and conferences . The topics of these research works are relevant to development of Urdu language and literature including the field of modern novel, short story, modern poetry, literary criticism, autobiography literacy, and translation literature in Urdu, and life and work of eminent Urdu researchers, Urdu poets, Urdu writers etc. in the contemporary world, particularly in Bangladesh.

Key words: Dhaka university, Urdu Department , Urdu International Seminar, presented research works, research evolution.

پروفیسر، مارڈن لینگویجز انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

ڈھاکہ یونیورسٹی کا شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہمراہ ۱۹۲۱ء سے ۲۰۲۱ء تک اپنا صد سالہ سفر مکمل کر چکا ہے۔ اس سفر میں کئی نشیب و فراز طے کر کے آج یہ شعبہ ترقی کی راہ میں گامزن ہے۔ اس شعبے کی تاریخ ڈھاکہ یونیورسٹی کی تاریخ سے براہ راست منسلک ہے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے بنیادی شعبوں میں شعبہ فارسی و اردو اہم ترین شعبہ شمار کیا جاتا ہے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کی قیام کی تاریخ کچھ یوں ہے کہ، مشرقی بنگال کے دانشوروں اور سیاست دانوں کی کوششوں سے ۲۳/ مارچ ۱۹۲۰ء ڈھاکہ یونیورسٹی ایکٹ منظور ہوا۔ یکم جولائی ۱۹۲۱ء سے ڈھاکہ یونیورسٹی نے باقاعدہ درس و تدریس شروع کر دیا۔ تین فیکلٹی، آرٹس، قانون، سائنس مع ۱۲/ شعبہ ۸۷۷ طلبا اور ۶۰ اساتذہ کو لیکر ڈھاکہ یونیورسٹی نے مشرقی بنگال میں علمی سفر شروع کیا۔[۱] شعبہ فارسی اور اردو نے آرٹس فیکلٹی کے تحت اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ڈھاکا میں اردو اس وقت امراء و شرفا کی زبان شمار کی جاتی تھی۔ ڈھاکہ کے امرا و شرفا نے ڈھاکا یونورسٹی کے لئے ۶۰۰ ایکڑ زمیں وقف کی تھی۔ شعبۂ اردو کے پہلے صدر ڈاکٹر فدا علی خان تھے۔ اس کے بعد اب تک ۱۹۲۱ء سے ۲۰۲۲ء تک ۲۲ صدر شعبہ بخوبی اپنی ذمہ داری ادا کر چکے ہیں۔ صد سالہ سفر میں شعبۂ اردو نے بہت سے عالمی شہرت یافتہ اردو علما و فضلاء، عالم اردو ادب کو تحفے میں عطا فرمائے ہیں۔ جن میں پروفسر ڈاکٹر محمد عبد اللہ، پروفیسر ڈاکٹر کلیم سہسرامی، پروفسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، پروفیسر ڈاکٹر ام سلمی، پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول، ڈاکٹر ابوسید نورالدین، پروفیسر ڈاکٹر شمیم خان، ڈاکٹر اقبال عظیم، پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں، پروفیسر ڈاکٹر محمود الاسلام، پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی، پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل، پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد شامل ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی کے اردو شعبہ نے طوفانی ہواوں اور بل کھاتی ندیوں کی سرزمین بنگلہ دیش میں بڑی محنت اور خلوص سے اردو کی شمع روشن کر رکھی ہے اور اس اردو شمع نے نہ صرف اس بنگال

کو روشن کیا ہے بلکہ کئی عالمی اردو کانفرنس کا اہتمام کر کے اسے آفتاب عالم اردو کے شکل بھی بخشی ہے۔ دیس پردیس کے اردو زبان کے ادبی محققان نے یہاں قدم رنجہ فرما کر ان سیمناروں کو جلا اور رنگینی عطا فرمائی ہے۔ انشا اللہ اپنی اس علمی خدمت کے باعث عالمی اردو زبان وادب، ڈھاکہ یونیورسٹی کو ضرور یاد رکھے گا۔

شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی نے ۲۰۰۴ء میں اپنا پہلا عالمی اردو کانفرنس منعقد کروایا۔ اجلاس میں بنگلادیش، ایران، پاکستان اور بھارت کی محققان نے شرکت کے تھی۔ جلسے کی صدارت جعفر احمد بھونیاں نے کی تھی۔[۲]

۲۰۱۷ء میں شعبۂ اردو نے ۹ سے ۱۰ اکتوبر دو روزہ عالمی کانفرنس انعقاد کیا۔ اس کانفرنس کا مرکزی تصور 'عصر حاضر میں اردو' تھا۔ اس سیمینار میں بھارت کے مختلف یونیورسٹی کالج، بنگلادیش کے راجشاہی اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے استادان، محققان، علما وفضلا نے شرکت کی۔ افتتاحیہ جلسے کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھونیاں نے کی تھی۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر محمد اختر الزمان بطور مہمان اعلی اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین ڈاکٹر شاہ جہان نے بطور مہمان معزز اس جلسے کی زینت افزائی کی۔ سیمینار میں پیش کردہ مقالہ حسب ذیل ہے۔

نمبر	عنوان مقالہ	مقالہ نگار:	تعارف
۱	دور حاصر میں اردو ادب کے بنگلہ مترجم	ڈاکٹر محمد اسرافیل	پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش
۲	اردو کی کاروباری جہتیں، ہندستانی تناظر اور عالمی انسلاک	ڈاکٹر صفدر امام قادری	سابق صدر شعبہ اردو کامرس، آرٹس وسائنس کالج پٹنہ، بہار بھارت

۳	بنگلادیش کے چند مشہور علمائے کرام کی اردو خدمات	ڈاکٹر رشید احمد ایسوسیٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش
۴	عصر حاضر میں اقبال کے تصور خودی کی اہمیت	حافظ مظفر عضو NCPUL, وزرات اعلیٰ تعلیم، بھارت
۵	عالمی تناظر اور بنگلادیش میں اردو کے مسایل اور امکانات	ڈاکٹر لطیف احمد پروفیسر شعبہ زبان راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش
۶	بنگلادیش میں اردو کی صورتحال	ڈاکٹر محمد محمود السلام پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش
۷	بہار میں اردو کے مسائل	ڈاکٹر زاہد الحق ایسوسیئٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی، تلگانہ، بھارت
۸	موجودہ دور میں عالمی سطح پر اردو زبان وادب کی صورتحال	ڈاکٹر حسین احمد کمالی پروفیسر شعبۂ زبان راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش
۹	بنگلہ دیش میں اردو مختصر افسانہ	ڈاکٹر محمد غلام ربانی پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

۱۰	ترکی کے اردو دوست	خلیل حفصہ اختر	لکچرار، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش
	طوقار کی شاعری کا فنی تجزیہ		
۱۱	پاک بھارت میں اردو کی صورتحال	ڈاکٹر محمد شہید االاسلام	ایسوسیٹ پروفیسر، شعبہ السنہ، راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش
۱۲	بنگلا دیش کے تعلیمی اداروں میں اردو نصاب	ڈاکٹر جعفر احمد بھونیاں	پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش
۱۳	عہد حاضر میں مغربی بنگال میں اردو ڈراما	ڈاکٹر نعیم احمد	ایسوسیٹ پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو، کولکاتا ویمین کالج، بھارت
۱۴	بنگلہ دیش کی اردو ادب میں احمد الیاس کی خدمات	محمد غلام مولا	اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش
۱۵	عہد حاضر میں اردو کے فروغ میں بنگلہ دیش اور بیرونی ممالک کے مدارس کا رول	حسین البنا	اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش
۱۶	بنگلہ شاعری کا اردو ترجمہ	محمد شفیق الحسن شہاب	شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش۔۳

ڈاکٹر نعیم احمد (نعیم انیس) اس سیمینار کے بارے میں یوں فرماتے ہیں۔ "بنگلہ دیش میں وہاں کے اساتذہ، ادباء، شعراء، صحافی اور طلباء طالبات سے مل کر اور ان کی اردو زبان سے محبت کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہاں اردو زبان وادب کا ایک نیا منظر نامہ طلوع ہو رہا ہے۔ جس نے عالمی سطح پر لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانی شروع کر دی ہے، جس کا زندہ ثبوت ڈھاکہ یونیورسٹی کی جانب سے دو روزہ بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد تھا۔[۴]

ڈاکٹر صفدر امام اس سیمینار کے بارے میں یوں گویا ہوتے ہیں۔ "ڈھاکہ یونیورسٹی میں سیمینار کا عنوان مخصوص تھا۔ عنوان اس اعتبار سے بہت موزوں تھا کہ کسی بین الاقوامی سیمینار میں جہاں مختلف ملکوں سے لوگ آئیں، وہاں الگ الگ خطوں میں زبان وادب کی جو صورت حال ہے، اس کا جائزہ لیا جانا چاہیے جس سے یہ بات سمجھ میں آسکے کہ ہماری زبان کا دائرہ کار وسیع ہو رہا ہے۔[۵]

۲۰۲۰ء میں گیارہ ممالک کی شرکت سے ایک اور اردو عالمی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ اس عالمی اجلاس کا مرکزی Them یا تصور اکیسوی صدی میں اردو زبان وادب کی عالمی صورتحال کا جائزہ تھا۔ اجلاس کا تصور مناسب الوقت و مفید تھا۔ اجلاس کے لئے برلن ہمبولڈ (Humbuld) یونیورسٹی برلن جرمن سے سرور غزالی؛ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد؛ بھارت سے آسیہ یاسین؛ ڈاکٹر محمد رضاء الکریم، تبسم حسن، سارہ بتول؛ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ انڈیا سے اسلم جمشید پوری، پی ایل اے کالج میدنی نگر جھارکھنڈ ہندوستان سے ڈاکٹر سلیم عارف؛ کشمیر یونیورسٹی انڈیا سے توصیف احمد، پٹنہ یونیورسٹی بھارت سے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی؛ پٹنہ کالج ہندوستان سے صفدر امام قادری، سریندر ناتھ ایوننگ کالج کولکاتا انڈیا سے صوفیہ شیرین؛ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی انڈیا سے ڈاکٹر شیخ عقیل احمد؛ راجشاہی یونیورسٹی بنگلہ دیش سے ڈاکٹر سمیع الاسلام، محمد شہید الاسلام، پروفیسر

ڈاکٹر لطیف احمد، ڈاکٹر محمد نصیر الدین؛ میزبان ڈھاکہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر محمد اسرافیل، حسین البنا، ڈاکٹر جعفر احمد بھوینا ں، حفصہ اختر، پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد، پروفیسر ڈاکٹر غلام ربانی، محمد غلام مولا، پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، پروفیسر شمیم بانو، اور دیگر کئی ملکی اور غیر ملکی اردو محققان نے مقالات ارسال فرمائے۔ بنگلہ دیش کی سرسبز زمین میں ملکی اور غیر ملکی محققان اردو ادب کی شرکت نے اس عالمی اجلاس کی رنگینی اور رونق میں چار چاند لگا دیے۔ مقالہ نگاروں نے اردو زبان و ادب کی عالمی صورتحال کو مختلف منطقوں، گوشوں اور زاویوں سے اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ان کی مجموعی ساعی نے سیمینار کو غنی اور پر معنی بنا دیا۔ پیش کردہ ان مقالات کے ریویو شدہ چند مقالات کو ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو کے خصوصی شمارہ بہ نام ''اکیسویں صدی میں اردو ادب'' سال ۲۰۱۴ء شمارہ ۷ میں شایع کیا گیا۔[۶] اس سیمینار میں پیش کیے گئے۔ مضامین اکیسوی صدی میں عالمی سطح میں اردو زبان و ادب کا فروغ، برصغیر (بھارت اور پاکستان) میں اردو زبان کی ترقی، بنگلہ دیش میں اردو زبان کی فروغ کے متعلق گفتگو اور بحث پر مبنی ہیں۔ موضوعات و مضامین کے لحاظ سے یہ کانفرنس کافی متنوع ہے۔ جدید ناول، افسانہ، شعر، تنقید، ترجمہ نگاری، خودنوشت سوانح حیات، شخصیت پردازی ان کے موضوعات ہیں۔ ضمنا عالمی سطح پر اردو زبان اور ادب کے نام نامور معاصرین محققان و ادبا کا تعارف مل جاتا ہے۔

ا۔ جریدہ کا پہلا نمبر مقالہ ''اکیسویں صدی کی خواتین ناول نگاروں کے ناولوں کا تنقیدی تجزیہ'' ہے۔ ناول جدید صنف ادب کی ایک مقبول صنف ہے۔ جہاں ناول نگار سماجی گوشوں کی کھل کر عکاسی کرتے ہیں۔ مقالہ نگار مصنفہ آسیہ یاسمین نے مقالے میں خاتون ناول نگار شھناز فاطمی، صادقہ نواب سحر، شایستہ فاخری، ثروت خان، افسانہ خان کے ناولوں پر تبصرہ کیا ہے۔ ان ناولوں کا موضوع مرد اساس معاشرہ میں عورت کا استحصال (مورتی)، لڑکی کی پیدائش پر

بیزاری (کہانی کوئی سنا دو)، حلالہ (نادیدہ بہاروں کے نشان)، لڑکیوں کی تعلیم اور بیوہ کی شادی کی مخالفت ہیں۔ مقالہ نگار عورتوں کے مذہبی استحصال کے بارنے میں یوں گویا ہوتی ہیں۔ ''یہ مرد بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں مرد کیا، مرد اساس سماج و معاشرہ ہی اس طرح کی گھٹیا اور گھناونی حرکتوں میں ملوث ہے۔

جب اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں تو صرف اور صرف انہیں اپنی عزت اپنا خاندان ہی دکھائی دیتا ہے۔ وہ عورت کو صرف ایک کھلونا بنا دیتے ہیں۔ جس کی زندگی بے وجہ کے جرم میں تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اسے صرف کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیتے ہیں''۔ ۷ تبسم حسن کا مقالہ'' اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں موضوعاتی تنوع''۔ اسی ضمن کی ایک اور کڑی ہے۔ مقالہ نگار نے جدید اردو ناولوں کے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے ان میں نیلوفر کا ناول' آوٹرم لین'، صادقہ نواب سحر کا 'جس دن سے'، غضفر کا 'شوراب' اور مشرف عالم ذوقی کا 'پوکے مان کی دنیا' شامل ہیں۔ ان کے موضوعات متنوع اور جدید مسایل کے حامل ہیں۔ ان میں رشوت خوری، والدین کی مصروفیت، عورتوں کی خانہ داردی اور بچوں کی تربیت کی جانب غیر ذمہ داری اور حلالہ جیسی مذہبی افراطی، تعلیم یافتہ لوگوں کی بے روزگاری، جدید ٹکنولوجی کے مضر اثرات اور دیگر جدید مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تمام ناول قاری کو ان کے سد باب کے لئے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ۸

پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنے مقالے ''نیا عالمی اردو افسانہ'' میں جدید ٹکنالوجی کے بدولت اردو افسانوی ادب کی ترویج و فروغ کی معلوماتی تصویر کشی کی ہے۔ دنیا بھر کے ممالک کے اردو افسانے، ان کے متنوع موضوعات نت نئی تکنیک، مقامی مسائل، ماحول اور زبان کے اثرات کو یہاں اجاگر کیا ہے۔ ہندو پاکستان کے علاوہ جرمن، برطانیہ، امریکا، کنیڈا، خلیجی ممالک جیسے ریاض، جدہ، دبئی، دوحہ قطر، بحرین، کویت، ماریشیش اور بنگلہ دیش کے افسانہ

نگار اور افسانوں کا عمیق تجزیہ کیا ہے۔[9]

سرور غزالی کے مقالہ ''جرمن میں اردو'' اپنے عنوان کے مطابق ایک رپورٹی (گزارشی) مقالہ ہے۔ علامہ اقبال کی اس جائے اعلیٰ تعلیم، یورپ کے منطقے میں اردو زبان وادب کی جو خدمات انجام ہو رہی ہیں۔ اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ خدمات وکوششیں انتہائی حوصلہ افزا اور خوش کن ہیں۔[10] پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد کا تحریر کردہ مقالہ ''عالم اسلام میں اردو کی بازگشت''۔ عالم اسلام میں اردو کی ترویج سے متعلق ایک معلوماتی مقالہ ہے۔ مصنف نے سعودی عرب، متحدہ اعرب امارات، قطر، مصر، افغانستان، ایران، شام، ملایشیا، مالدیپ میں اردو زبان کی ترویج کو موضوع بحث قرار دیا ہے۔[11]

۳۔ ڈاکٹر تسلیم عارف نے ''اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی فصلیں''، عنوان سے اردو تنقید نگاری پر قلم اٹھایا۔ تنقید کے متعلق ڈاکٹر موصوف بجا طور پر فرماتے ہیں۔ ''تنقید بہ ظاہر ایک ظالمانہ فعل نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس سے علم وادب کی تفہیم کے سنوارنے کا کام لیا جاتا ہے''۔[12] مصنف نے اردو تنقید کے تین ادوار۔ ا۔ قدیم سنتی (مقدمہ شعر وشاعری۔ حالی) جدید دور (تا ۱۹۸۰ء) اور مابعد جدید۔ (بعد از ۱۹۸۰ء سے آج تک) اور ان کے امتیازات پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنف نے تنقید کے لئے تین بڑے ستون، علمی نکتہ رسی، منصفانہ مزاج اور خلوص قرار دیے ہیں۔ مضمون کا لب الباب بقول مصنف ''آج اردو کے قاری کے لئے سب سے بڑا مسئلہ منصف مزاج، دیانت دار اور علمی اعتبار سے لیس نقاد کی تلاش ہے،[13] مقالہ نگار عصر حاصر کی اردو تنقید نگاری کے بارے میں یوں فرماتے ہیں۔ ''مقدمہ شعر وشاعری سے ہماری تنقید کا جو سلسلہ قائم ہوا اس میں علمی نکتہ رسی، منصفانہ مزاج اور خلوص کا بڑا حصہ تھا۔ تنقید کے لئے یہ تین ستون تھے۔ آج کی تنقید میں بالعموم تنقیدی نکتہ رسی اور علم کا تو اضافہ ہوا ہے۔ لیکن منصفانہ مزاج اور خلوص نیت میں سخت کمی آئی ہے۔''[14] تنقید سے متعلق ایک اور

مقالہ صفدر امام قادری کا تحریر کردہ 'نئی اردو تنقید کے موضوعات اور مسایل' ہے۔ مصنف نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تنقید نگاری کی حد بندیوں پر تبصرہ کیا ہے۔ مصنف مابعد جدید کی ایک خصوصیت تنقید کے ساتھ تحقیق کا اشتراک بتاتے ہیں۔ مقالہ نگار تنقید نگاری میں علم، تحقیق اور تجزیہ کی کسوٹی کے خواہاں ہیں۔ ۱۵ زبان و بیان اور مواد کے لحاظ سے مقالہ اعلیٰ ہے۔

اکیسویں صدی میں عالمی اردو ادب کی ایک اور نادر صنف خودنوشت سوانح حیات ہے۔ اس موضوع پر سارہ بتول کا مقالہ 'اکیسویں صدی میں اردو ادب کے منتخب خودنوشت سوانح حیات ایک تجزیاتی مطالعہ' منفرد مقالہ ہے۔ خودنوشت سوانح حیات میں مصنف اپنی داستان حیات، حادثات، زندگی کی کہانی خود بیان کرتا ہے۔ اس ضمن مصنف اپنی وسیع نظری عمیق بینی کے تحت۔ متعدد سماجی، معاشی، ادبی، فرہنگی افکار کا بھی اظہار کرتا ہے۔ اس نکتہ نظر سے مقالہ میں مقالہ نگار نے ان چند خودنوشت سوانح حیات کا انتخاب کیا ہے جن کا ادب سے واسطہ ہے۔ حمایت علی شاعر کی منظوم۔ خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' ان میں سرفہرست و نادر سوانح حیات ہے۔ ''اپنا گریباں چاک'' فرزند علامہ اقبال۔ جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے خاندانی پس منظر، علامہ اقبال کی زندگی ان کے کلام افکار، اور فلسفہ اقبال کو بیان کیا ہے۔ یہاں سوانح نگار نے اپنے دور میں درپیش مسایل، تقسیم ملک، پاکستان اور اسلامی ممالک میں ہونے والی مذہبی سیاسی، سماجی انتشار عوامی غربت، بے روزگاری، قدامت پسندی، عورتوں کے استحصال پر قلم فرسائی کی ہے۔ ''بڑے گھر کی بیٹی''۔ ڈاکٹر حبیب خان کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ سوانح نگار نے اپنی سوانح عمری کے ضمن عورتوں کے خانگی مسائل، سماجی برائیاں، فرسودہ رسم و رواج کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ ان کے نقطہ نظر سے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لیے عورت گھر سے باہر اپنی صلاحیت کو بروے کار لا

سکتی ہے۔ ''گھنگھرو ٹوٹ گئے''۔ اردو کے مشہور شاعر قتیل شفائی کی سوانح حیات ہے۔ مصنف نے اس میں اپنی داستان حیات، داخلی اور رنجی زندگی، انفرادی مسایل، شاعری اور فنی نکات تقسیم ہند کے واقعات و اثرات، اپنی نفسانی کیفیات، اپنی طرز زندگی اور اخلاق کے بارے میں بے باکانہ قلم فرسائی کی ہے۔ اس مقالے کے ضمن مقالہ نگار فرماتی ہیں کہ اس سوانح میں ہندکو، ہندی اور پنجابی الفاظ کی آمیزش ہے۔ تلمیحات اور استعارات کے پیرایہ میں گردو پیش کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''جستجو کیا ہے'' برصغیر کے معروف فکشن نگار انتظار حسین کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ واقعات و کیفیات کو ہندی الفاظ کے ذریعے خالص ہندوستانی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔[16]

جریدہ کے مقالات کا ایک حصہ اکیسویں صدی میں برصغیر میں اردو کی صورتحال پر گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔ توصیف احمد ڈار کا تحریر کردہ مقالہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب کی موجودہ صورتحال۔ (اردو شاعری کے خصوصی حوالے سے)، کشمیر میں اردو شاعری کا ایک جایزہ ہے۔[17] پروفیسر شمیم بانو کا مقالہ اردو زبان و ادب کی فروغ میں بالی ووڈ کا کردار (فلمی نغمہ نگاروں کے خصوصی حوالے سے) اردو ادب کی ایک اور منفرد صنف فلمی نغمہ نگاری کو متعارف کیا گیا ہے۔ اردو زبان و ادب کے فروغ میں فلمی نغمہ نگاروں کے حوالے سے بالی ووڈ کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے مقالہ نگار کہتی ہیں۔ ''آج بھی بالی ووڈ کے شب و روز گلزار کی گل افشانی اور جاوید اختر کی اختر شماری کے بغیر بے معطر اور بے روشن ہیں''۔[18] صوفیہ شیرین کا تصنیف شدہ، مضمون ''اکیسویں صدی میں مغربی بنگال کا اردو افسانہ اور عصری مسایل'' معلوماتی اور علمی بحث پر مبنی مضمون ہے۔[19] ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا مقالہ ''اکیسویں صدی میں ہندوستان کے اردو ناول، ایک تنقیدی مطالعہ'' اردو ناول نگاری پہ ایک مفصل تحقیقی مقالہ ہے۔ مصنف نے یہاں ملک (ہندوستان) اور یہاں کی موقع پرست اور قابل مذمت

سیاست کے نتیجے میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ایک مخصوص طبقے کو دھشت گردی کا ملزم اور نشانہ بنا کر پوری مشترکہ قوم اور تہذیب کو نیم جاں بنانے کی زیر پردہ اور اعلانیہ کوششوں اور سازشوں کو عیان کیا ہے۔ ان ناولوں میں ''دروازہ ابھی بند ہے۔'' احمد صغیر، ''میرے ناولوں کی گمشدہ آواز''۔ محمد علیم: کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں نئی صدی اور نئی تہذیب میں عورتوں کا استحصال ''لیمیٹڈ گرل''۔ اختر آزاد کا ناکام ازدواجی زندگی موضوع پر ''مورتی'' ناولوں کا ذکر کیا ہے۔ ۲۰

سیمینار کا سب سے اہم حصہ بنگلہ دیش میں اردو کی ترویج سے متعلق مقالات ہیں۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا تحریر کردہ ''ماضی اور حال کے آئینے میں بنگلہ دیش میں اردو''۔ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مصنف نے بنگال میں اردو ترویج کے بارے میں ماضی کے دریچوں کو کھولا ہے۔ مرزا جان طپش، عبدالغفور نساخ، خواجہ احمد اللہ شاہین، محمود آزاد، منشی رحمٰن علی طپش، حکیم حبیب الرحمٰن وغیرہ کے کارہائے نمایاں کا ذکر کیا ہے۔ عصر حاضر میں شعبہ اردو ڈھاکا یونیورسٹی کے اساتیذہ پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، پروفیسر ڈاکٹر ام سلمٰی، پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول، پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی، پروفیسر ڈاکٹر محمد جعفر احمد کے نام اور ان کے کارہائے نمایاں کو سراہا ہے۔ ۲۱ حسین البنا کی تحریر ''اکیسویں صدی میں بنگلا دیش کے چند اردو شعرا'' بنگلہ دیش کی اردو شاعری پر مفصل تبصرہ ہے۔ مقالہ نگار بتاتے ہیں کہ بنگلہ دیش میں اردو شاعری کی داغ بیل اٹھارھویں صدی کے اواخر میں مرزا جان طپش کی ڈھاکہ میں آمد ۱۷۸۶ء میں ہوئی۔ اس وقت بنگلا دیش کے اردو شاعری میں حافظ اکرام احمد ضیغم، عبدالغفور نساخ اور محمد آزاد جیسے شعرا گلکشت کر رہے تھے۔ بیسویں صدی میں حافظ رحمت، عندلیب شادانی، سلیم اللہ فہمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد علامہ رضا علی وحشت، آصف بنارسی، احسن احمد اشک، جیسے شاعروں نے اردو گلستان شعر کی آبیاری کی۔ اکیسویں صدی میں ڈاکٹر کلیم سہسرامی، احمد الیاس

جلال عظیم آبادی، صابر حسین صابر، شمیم زمانوی، عنایت اللہ صدیق، پروفیسر ڈاکٹر محمود الاسلام اس اس گلشن کی پاسبانی کر رہے ہیں۔۲۲

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل کی قلمی کاوش ''اکیسویں صدی میں بنگلہ دیش کے چند اردو ادبا'' یہاں کے مصنفوں کا تعارف کراتا ہے۔ جن میں ایوب جوہر، پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ، قاضی محی الدین وکرم پوری، زین العابدین، شام بارکپوری، ارمان شمسی، پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، پروفیسر ڈاکٹر ام سلمیٰ، س، م ساجد، خلیل الرحمٰن زخمی، پروفیسر ڈاکٹر کلیم سہسرامی اور ان کے کارہائے نمایاں کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر کنیز بتول، ڈاکٹر پروفیسر زینت شیرازی، اور ڈاکٹر پروفیسر لطیف احمد کا ذکر بھی آیا۔۲۳ پروفیسر ڈاکٹر محمود الاسلام کا تصنیف شدہ مضمون ''ڈھاکا اردو کا ایک مرکز'' اردو کی ترویج میں ڈھاکا کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈھاکا کے اردو کے قدیم ادبا و شعرا، سید محمد آزاد، آقا احمد علی اصفہانی، خواجگان ڈھاکا؛ خواجہ عبدالرحیم صبا، خواجہ حیدر جاں شایق، خواجہ اسد اللہ کوکب، خواجہ احسن اللہ شاہین کا تذکرہ آتا ہے۔ ڈھاکا کے بنگالی نژاد اردو شاعر حکیم حیدر علی، شیخ بنگالی عاصی، منشی وارث علی؛ بیرون ڈھاکا سے واردگان ڈھاکا کا ادبا و شعرا ڈاکٹر وجاہت حسین شادانی، سلیم اللہ فہمی؛ تقسیم ہند کے بعد نو واردگان ڈھاکا کا احسن احمد اشک، نوشاد نوری، احمد الیاس، شمیم زمانوی، جلال عظیم آبادی، صابر علی صابر، عنایت اللہ صدیق، ہیکل ہاشمی شاعروں اور ادباء کا ذکرِ خیر کیا گیا ہے۔ بنگال کی زرخیز زمین میں اردو ادب کے نونہال کی پروان کی ابتدا ۱۸۵۶ میں جلاوطن نواب واجد علی شاہ کی کولکاتا میں پریاس آمد اور بنگال میں اردو ادب کے خوش کن باب کے آغاز کے بارے میں مقالہ نگاریوں لکھتے ہیں۔ ''اس خوشگوار ماحول اور سازگار حالت میں ڈھاکا کے لئے ناممکن تھا کہ اپنے سینے کی آگ کو بدستور دبائے بیٹھا رہتا جیسے جیسے کلکتہ مرشدآباد میں اردو کے نامور اہل قلم اور ادب جمع ہوتے گئے، ڈھاکا کے تعلقات ان دونوں مقامات سے استوار ہونے لگے۔ گھر

گھر شعروادب کا ذوق عام ہوگیا۔ڈھاکہ کواردو کا ایک مرکز سمجھا جانے لگا''۔[۲۴] ڈھاکہ کے علاوہ بنگلہ دیش کا ایک مضافاتی شہر سید پور جہاں بنگلا دیش میں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد بستی آئی ہے۔ بنگلہ دیش کی آزادی سے قبل یہ علاقہ اردو زبان وادب کا گہوارہ شمار کیا جاتا تھا اور آج بھی اردو ادبا وشعرا کی کثیر تعداد یہیں سے تعلق رکھتی ہے۔مضمون نگار سمیع الاسلام نے اپنے مقالے ''سید پور میں اردو ادب کی سرگرمیاں'' میں سید پور کے ادباء شعرا کی خدمات اور یہاں کی دیگر ادبی سرگرمیوں کو روشن کیا ہے۔محمد سعدی، زین العابدین، میکش فارسی، س۔م۔ساجد قلمکاروں اوران کے کارھائے نمایاں کو بیان کیا کیا ہے۔[۲۵]

اس سیمینار کا ایک اور اہم پہلو شخصیت نگاری ہے۔خاص طور پر بنگلہ دیش کے چند اہم نامور اردو ادبی ہستیوں پر مفصل مقالے پیش کئے گئے ہیں۔ان کے ادبی کارناموں کی واضح تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ان تصویروں کے خدوخال بنگلا دیش میں اردو ادب کی منظر نگاری کرتے ہیں۔ان مقالوں میں شہید الاسلام کا لکھا مقالہ ''ڈاکٹر محمد عبداللہ کے حالات زندگی اور ادبی (اردو) کارناموں کا ایک مختصر جائزہ''،[۲۶] محمد رضاء الکریم کا نوشتہ، ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی اردو خدمات۔[۲۷] پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھوئیاں کا مقالہ ''پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول۔حیات اور کارنامے''،[۲۸] پروفیسر ڈاکٹر نصیر الدین کی تحریر ''بنگلہ دیش میں اردو ادب کے ایک شیدائی، لطیف احمد،[۲۹] پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی کی قلمی کاوش ''ارمان شمسی اوران کی افسانہ نگاری''[۳۰] پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد کی تحریر شاہ حکیم محمد اختر اوران کی اصلاحی شاعری،[۳۱] محمد غلام مولا کا مقالہ ''اردو فارسی سے بنگلا ترجمہ نگاری میں جاوید حسین کی خدمات،[۳۲] اور حفصہ اختر کی تحریری کاوش ''بنگلہ دیش میں اردو ادب کے خدمت گزار۔جلال عظیم آبادی''[۳۳] اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔جعفر احمد بھویاں اپنے مقالے میں مرحومہ ڈاکٹر کنیز بتول سے متعلق یوں لکھتے ہیں۔''ان کے زیادہ تر مقالات سرزمیں بنگلا دیش کی بھولی بسری اور گمنام ہستوں

سے متعلق ہیں۔ جن کے کارناموں کو اہل وقت نے فراموش کیا تھا۔ ڈاکٹر بتول نے ان شخصیات کو ازسرنو اجاگر اور روشناس کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہے۔[۳۴]

شعبہ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی کا یہ عالمی سیمینار ۲۰۲۰ ''اکیسویں صدی میں اردو ادب'' اپنے عنوان کے مصداق سے کامیاب اور مکمل ہے۔ اور دیگر تکنیکی وجوہات کی بنا پر اس اجلاس کے چند مقالات شایع ہونے سے قاصر رہے۔ لیکن ان ادبا کی موجودگی نے اس اجلاس کو جو رونق بخشی ہے وہ سالوں یاد رہے گی۔ شعبۂ اردو ڈھاکا یونیورسٹی کے منعقد کئے ہوئے یہ عالمی سیمینار اردو ادب کی ادنی اور عاجزانہ خدمات ہیں۔ پہلے اور دوسرے سیمینار کے اکثر مقالے اس شعبے سے شایع ہونے ولے جریدہ کے مختلف شماروں میں اشاعت پزیر ہو چکے ہیں۔ امید ہے یہ شعبۂ اسی طرح کے مزید عالمی سیمینار منعقد کرتا رہے گا اور اردو کا یہ گلستان ہمیشہ مہکتا رہے گا۔

حوالہ جات

1. 51th Convocation Souvenir, Dhaka University 2018

۲۔ بحوالہ پروفیسر محمد غلام ربانی، شعبہ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی

۳۔ بروشیر، عالمی اردو کانفرنس بعنوان ''عصر حاضر میں اردو''، شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ دیش ۹ اور ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۷۔

۴۔ نعیم انیس، بنگلہ دیش میں اردو زبان وادب، فکر وتحریر، جنوری۔ مارچ ۲۰۱۸، ص ۸

۵۔ صفدر امام قادری، بنگلہ دیش میں اردو کی صورت حال، فکر وتحریر، جنوری۔ مارچ ۲۰۱۸، ص ۱۵

۶۔ ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو، مدیر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، شمارہ ۷، شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ دیش، سال ۲۰۱۴ء

۷۔ آسیہ یاسمین، اکیسویں صدی کی خواتین ناول نگاروں کے ناولوں کا تنقیدی تجزیہ۔ ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ ۷، شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ دیش۔ سال ۲۰۱۴ء ص ۱۶

۸۔ تبسم حسن، اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں موضوعاتی تنوع۔ ایک مطالعہ۔ ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ ۷، شعبۂ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ دیش، سال ۲۰۱۴ء۔ ص ۸۱۔۸۵

۹۔ اسلم جمشید پوری۔ نیا عالمی اردو افسانہ، ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ ۷، شعبہ اردو ڈھاکا یونیورسٹی بنگلا دیش، سال ۲۰۱۴ء، ص ۳۵

۱۰۔ سرور غزالی، جرمنی میں اردو، ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ ۷، ص ۱۷۰

۱۱۔ لطیف احمد، عالم اسلام میں اردو کی بازگشت، ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ ۷، ص ۳۲۵

۱۲۔ تسلیم عارف، اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی فصلیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ ۷، ص ۸۱

۱۳۔ ایضاً، ص ۸۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۸۷

۱۵۔ صفدر امام قادری، نئی اردو تنقید کے موضوعات اور مسائل، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ ۷، ص ۲۶۰

۱۶۔ سارہ بتول، اکیسویں صدی میں اردو ادب کے منتخب خودنوشت۔ ایک تجزیاتی مطالعہ، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، شمارہ ۷، ص ۱۵۵

۱۷۔ توصیف احمد ڈار، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب کی صورتحال (اردو شاعری کے

حوالے سے)۔ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷،ص۸۹

۱۸۔ شمیم بانو،اردو زبان وادب کی فروغ میں بالی ووڈ کا کردار(فلمی نغمہ نگاروں کے خصوصی حوالے سے)۔ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷،،ص۲۰۶

۱۹۔ صوفیہ شیرین،اکیسویں صدی میں مغربی بنگال کا اردو افسانہ اور عصری مسایل۔ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷، ص۲۷۱

۲۰۔ شہاب ظفر اعظمی،اکیسویں صدی میں ہندوستان کے اردو ناول۔ایک تنقیدی مطالعہ۔ ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ۷، ص۲۲۵

۲۱۔ شیخ عقیل احمد۔''بنگلا دیش میں اردو: ماضی اور حال کے آئینے میں۔ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷،ص۲۸۲

۲۲۔ حسین البنا۔اکیسویں صدی میں بنگلا دیش کے چند اردو شعرا۔ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷،ص ۵۹

۲۳۔ محمد اسرافیل،اکیسویں صدی میں بنگلا دیش کے اردو ادبا۔ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷،ص ۲۵

۲۴۔ محمد محمود الاسلام۔ڈھاکا اردو کا ایک مرکز۔ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷، ص۳۴۳

۲۵۔ سمیع الاسلام،سید پور میں اردو ادب کی سرگرمیاں،ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷، شعبہ اردو ڈھاکا یونیورسٹی بنگلا دیش،سال۲۰۱۴ء،ص۱۷۹

۲۶۔ شہید الاسلام،ڈاکٹر محمد عبداللہ کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں کا ایک مختصر جائزہ، ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷،ص ۲۴۸

۲۷۔ رضاء الکریم محمد،''ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی اردو خدمت۔ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،

شمارہ ۷، ص۱۴۶

۲۸۔ جعفر احمد بھوئیاں، پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول۔حیات اور کارنامے۔ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷، ص۱۵۸

۲۹۔ نصیر الدین محمد، بنگلا دیش میں اردو ادب کے ایک شیدائی لطیف احمد، ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷،ص۲۴۹

۳۰۔ محمد غلام ربانی، ارمان شمسی اور ان کی افسانہ نگاری، ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷، ،ص۲۹۰

۳۱۔ رشید احمد، شاہ حکیم اختر اور ان کی اصلاحی شاعری، ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷، ،ص۱۳۳

۳۲۔ غلام مولا محمد، اردو اور فارسی بنگال ترجمہ نگاری کی خدمات۔ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷،ص۳۱۴

۳۳۔ حفصہ اختر، بنگلا دیش میں اردو ادب کے خدمت کردار۔جلال عظیم آبادی۔ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو،شمارہ ۷، شعبہ اردو ڈھاکا یونیورسٹی بنگلا دیش،سال ۲۰۱۴ء،ص۱۳۲

۳۴۔جعفر احمد بھونیاں، پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول۔حیات اور کارنامے،ص۱۱۶

پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی: معلم، ادیب اور محقق

شمیمہ نسرین

Abstract

Dr.Wajahat Hussain Andalib Shadani is the prominent figure of Urdu literature.Though he retains his reputation as a romantic poet, he was a short story writer, critic, academician and researcher. He is mostly known as a researcher of Urdu poetry and gazal. He was born in 1 March 1904 in Sambhal, near Moradabad. He obtained his B.A. degree in 1924 from Punjab University and M.A. degree in Persian from Islamia College in Lahore in 1925. Shadani was appointed as a Lecturer of the Department of Urdu and Persian, University of Dhaka in 1928. In 1933 he received his PhD in Hindustan Ki Muslim Moarikhin from London University. Later he was made the head of the department and the Dean of the Faculty of Arts. He was the Dean of the Faculty for three times. His first poetry book is Nishat-e-Rafta which was published in 1952.

His other books are Sachchi Kahaniyaan, Nash-o-Nesh,Chhota Khuda etc.Dr.Shadani played a positive role by sympathetically criticizing ghazal and showing the way to new environs and new heights. He ruthlessly criticized ghazals written by Jigar Mradabadi,Asghar Gondavi,Hasrat Mohani,Fani Badayuni,a few of the

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبۂ اُردو ، راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

most representative ghazal poets of his time.Urdu Ghazal Goi aur Daur-e-Haazir,Tahqeeqaat,Tehqeeq Ki Roshni Main,Payam-e-Iqbal,Naqsh-e-Badi are his most famous works on criticism and research. He published a daily newspaper Mashriqi Pakistan in 1948 .In 1952 he started to publish his monthly magazine Jadu. He also published a journal called Khawar. He translated many books in Urdu from different languages .Andalib Shadani died in Dhaka on July 29,1969.

پروفیسر ڈاکٹر عندلیب شادانی اردو ادب میں ایک مایہ ناز شخصیت تھے۔ وہ بنگال کے قابل قدر شاعروں میں سے ہیں۔انہوں نے اردو ادب میں ایک بڑی خدمت انجام دی اور اپنی خداداد صلاحیت سے ادبی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا۔وہ بیک وقت ایک شاعر،افسانہ نگار،نقاد،محقق،مورخ مدیر اور معلم تھے۔وہ ایک صحافی بھی تھے۔ڈاکٹر نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

> شادانی صاحب نقاد بھی ہیں اور محقق بھی۔شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔شعرا ادب کی ان چاروں صنفوں میں ان کی کارگذاریاں نہ صرف اعلیٰ معیار کی حامل ہیں بلکہ اپنے اندر ایک واضح اور دلکش انفرادیت بھی رکھتی ہیں۔[۱]

ڈاکٹر شادانی کا نام وجاہت حسین صدیقی اور عندلیب ان کا تخلص تھا۔اپنے استاد محترم جناب پروفیسر سید اولاد حسین شاداں بلگرامی کی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ شادانی اختیار کی۔[۲] اور خاص وعام میں وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔اگرچہ شادانی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف پائے جاتے ہیں۔لیکن انکے میٹرک کی سند میں انکی تاریخ پیدائش یکم مارچ ۱۹۰۵ ہے۔ان کا آبائی وطن سنبھل،ضلع مرادآباد (یوپی) ہندوستان تھا۔[۳] ان کے

والد کا نام اشتیاق حسین صدیقی تھا۔ وہ صدیقی شیخوں کے ایک متوسط خاندان کے فرد تھے۔اور پیشے میں بڑے تجار تھے۔زندگی کے آخری ایام انہوں نے ڈھاکہ میں ڈاکٹر شادانی کے پاس ہی گزارے۔کیونکہ اپنی تمام اولاد میں انہیں ڈاکٹر شادانی سے خاص شغف تھا۔ ڈاکٹر شادانی کی ماں کا نام زینت بی بی تھا۔ڈاکٹر شادانی کا بچپن بڑے عیش وآرام سے گزرا۔بچپن ہی سے ان کے مزاج میں شوخی اور شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بے انتہا شرارت کرتے تھے۔

شادانی کی ابتدائی تعلیم سنبھل (مرادآباد) میں ہوئی۔ وہاں کے تحصیل اسکول سے انہوں نے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ان کی ابتدائی تعلیم بالکل مذہبی ماحول میں ہوئی۔کیونکہ ان کے والد مذہبی قسم کے تھے اور انگریزی تعلیم کو ان کے خاندان میں برا سمجھا جاتا تھا۔اردو مڈل کے امتحان میں انہیں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں امتیازی نمبر ملے۔شادانی جب مدرسہ عالیہ رامپور میں داخلہ لیا وہاں اولاد حسین شاداں بلگرامی فارسی کے استاد تھے۔ان کی صحبت نے عندلیب شادانی کو کندن بنا دیا۔۱۹۲۰ میں مدرسہ عالیہ سے انہوں نے منشی عالم کا امتحان دیا اور پورے پنجاب میں اول رہے۔دوسرے سال منشی فاضل کا امتحان بھی کامیابی کے ساتھ حاصل کی۔۱۹۲۱ میں انہوں نے انگریزی میں میٹریکولیشن اور ۱۹۲۳ میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔۱۹۲۴ میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔یہاں سے انہوں نے انگریزی میں ایم یے کی ڈگری بھی حاصل کی۔شادانی صاحب نے اسلامیہ کالج لاہور سے فارسی میں ایم یے کی ڈگری حاصل کی۔تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے تقریباً چار سال لاہور رہے۔

منشی عالم اور منشی فاضل کا امتحان دینے کے بعد وقتاً فوقتاً انہوں نے کئی اسکولوں میں ملازمت کی۔ ۱۹۲۱ میں خالصہ ہائی اسکول گردوالہ سے انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔وہاں یہ فارسی کے استاد تھے۔۱۹۲۶ میں وہ دہلی چلے آئے اور دہلی کے ہندو کالج میں اردو و فارسی کے

لیکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔تقریباً دو برس یہاں پہ کام کرنے کے بعد ۱۹۲۸ میں ڈاکٹر صاحب کا تقرر ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہوگیا۔[۴] یہاں وہ ایک نامور استاد تھے۔ہر خاص وعام پر ان کی شخصیت کا دیرپا تاثر ہوتا تھا۔ترقی کی تمام منازل کو طے کرنے کے بعد شعبہ فارسی واردو کے پروفیسر اور صدر رہیں۔ڈاکٹر شادانی اس یونیورسٹی میں ۱۹۵۰ تک ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس بھی رہ چکے ہیں۔۱۹۳۱ میں انہوں نے یہیں سے لندن یونیورسٹی تشریف لے گئے، جہاں تین برس تحقیقی کام کر کے ۱۹۳۳ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع ''ہندوستان کے مسلم مورخ'' تھا۔جو انگریزی زبان میں پیش کیا گیا۔[۵] اردو اور انگریزی کے علاوہ انہوں نے فرانسی اور لاطینی زبانیں بھی پڑھی تھیں۔

جس وقت شادانی کی عمر تیرہ چودہ سال کی تھی یعنی ساتویں کلاس میں ان کے ماموں زاد بہن شہزادی بیگم سے ان کی شادی ہوئی۔

۲۹ جولائی ۱۹۶۹ ڈھاکہ میں شادانی کی وفات ہوئی۔ان کی وفات نے اردو ادب میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا جس کا پر کرنا ممکن نہیں ہوا۔

شاعر

ادبی خدمات کے اعتبار سے عندلیب شادانی جن جن حیثیتوں میں ہمارے سامنے آئے ہیں، ان میں سے؛ ان کی تین حیثیتیں مخصوص ہیں۔شاعر، ناقد اور افسانہ نگار۔لیکن ان کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۲۴ سے ہوئی جب وہ لاہور میں زیر تعلیم تھے۔مگر ان کی باقاعدہ شاعری کی ابتدا ۱۹۲۵ سے ہوئی۔اپنی آغاز شاعری کے بارے میں شادانی خود لکھتے ہیں۔

میری شاعری کی ابتدا نظم سے ہوئی اور ''تصویر بہار'' میری پہلی نظم ہے جو دیال سنگھ کالج، لاہور کی بزم ادب کے ایک جلسے میں ۲۹ جون ۱۹۲۵ کو پڑھی گئی۔ سامعین کی بے اختیار داد و تحسین نے دل بڑھایا اور میری دوسری نظم کے گمنام نوارد کو لاہور کے ادبی حلقوں میں اچھی طرح روشناس کر دیا۔ ۲۵ مئی ۱۹۲۵ کو ''حقیقی زندگی'' اور اس کے ساتھ ہی حقیقی شاعری کا آغاز ہوا۔[۶]

ڈاکٹر شادانی کا پہلا مجموعہ کلام ''نشاط رفتہ'' ہے جو ۱۹۵۱ میں شائع ہوا۔ اس میں شادانی نے صحیح مذاق شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے۔ نشاط رفتہ میں چھوٹی بڑی ۲۲ غزلوں اور ۱۶ نظموں کے علاوہ تمام اشعار مفرود ہیں یا نامکمل غزلوں کی شکل میں ہیں۔ شادانی خود اپنی شاعری کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور جنوری ۱۹۲۴ سے لے کر اگست ۱۹۲۹ تک اور دوسرا دور جولائی ۱۹۳۵ سے لے کر ۱۹۵۲ یعنی ''نشاط رفتہ'' کی اشاعت تک۔[۷] ''نشاط رفتہ'' ان کے پہلے دور کی شعری مجموعہ ہے جو اردو ادب مین ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اور دیگر شعرا کے لئے ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ اسکی اشاعت کے بعد اس پر کئی معیاری تبصرے بھی ہوئے اور کئی نقادوں نے ان پر دل کھول کر تعریفیں کیں۔ پروفیسر نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

> شادانی نے اپنے مجموعہ کلام کا نام ''نشاط رفتہ'' رکھا ہے۔ اس نام کو صرف نام نہیں سمجھنا چاہیئے۔ یہی ان کی شاعری کا محور ہے اور یہی ان کے نغمے کا بنیادی سر۔۔۔۔ ان کے انک تہائی اشعار یاد سے متعلق ہے۔ غرض ان کی شاعری نشاط رفتہ کی یادوں کی شاعری ہے۔[۸]

پروفیسر عطا کاکوی نے ''نشاط رفتہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے شادانی کو انگریزی میں Poet of the Moon کے نام سے یاد کیا۔ کیونکہ وہ مہتابی شاعر تھے۹۔۱۱ چاندنی سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔ انہوں نیا پنے کلام میں چاند، چاندنی اور مہتابی راتوں کا ذکر بڑی ماثر انداز سے کیا۔ ان کے پورے کلام کی فضا میں چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ ان کی مہتابی شاعری کا نمونہ:

ہنستی آنکھیں، ہنستا چہرہ ایک مجبور بہانہ ہے
چاند میں سچ مچ نور کہاں ہے چاند تو ایک ویرانہ ہے۔
ترے سامنے یہی رات تھی یہی پھول تھے یہی چاندنی
مگر آج ان میں نہ کیف ہے نہ جمال ہینہ بہار ہے۔ [۱۰]

ڈاکٹر شادانی جو کچھ لکھتے ہیں سلیس، سادہ اور ملائم الفاظ میں لکھتے ہیں۔ یہی سادگی وسلاست ہی شاعری میں ان کی کامیابی کا راز ہے۔ ان کے یہاں تشبیہات بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے اشعار کی سادگی قاری پر ایک عجیب کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ ان کا کلام سادگی میں ہی جذبات کا ایک طوفان برپا ہوتا ہے۔ چند اشعار:

خلش ہو، درد ہو، کاہش ہو، کچھ ہو
فقط جینا بھی کوئی زندگی ہے
جز ترے کوئی مرے پاس کہا ہوتا ہے
اپنے سائے پہ بھی تیرا ہی گماں ہوتا ہے۔ [۱۱]

شادانی کی شاعری واردات عشق کی داستان ہے۔ وہ رومان پرور تھے۔ ساری زندگی انہوں نے عشق کی کوچہ گردی میں گزار دی۔ اعران کا سارا کلام میں صرف حسن وعشق کی کارفرمائی ہے۔ ان کے اشعار میں بہت سے لوگوں کو اپنے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ رومان ومحبت

کی راہوں میں جو کچھ شاعر کے دل پر گزری ہے اسے شعر کا جامہ پہنا دیا۔ان کی شاعری میں جدائی ہے، درد ہے۔مثلاً:

تری دلبری کے قرباں مجھے لذت وفا دی
مری زندگی میں آ کر مری زندگی بنا دی۔
زمانے کی طرح اے کاش وہ بھی وفا ہوتا
کہ اب اس کی وفائیں یاد آ کر خوں رلاتی ہیں۔[۱۲]

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر لکھے ہیں:

ان کے اشعار ان کی درد بھری کہانی ہے یہ ان کے حیت معاشقہ کی ایک بیاض ہے۔جس کا ہر صفحہ غم و یاس کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے۔ان کی غزل میں ایک دل گداختہ کیفیت ملتی ہے۔شاعری اور بالخصوص عاشقانہ شاعری میں دلخراشی اور جگر سوزی کا ہونا ضروری ہے۔[۱۳]

افسانہ نگار:

ڈاکٹر عندلیب شادانی بیسویں صدی کے ان چند نثر نگاروں میں سے ہیں جو صحیح زبان لکھنے پر قدرت رکھتے ہیں۔شادانی اپنی حقیقت نگاری اور نفسیاتی اور موشگافی کی وجہ سے وہ اردو افسانے کی دنیا میں وہ نیرنگیاں دکھائیں، جن کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ان کی ذہنی، فکری اور جذباتی انقلاب نے ان کے افسانوں کو کہں سے کہں پہنچا دیا ہے۔انہوں نے ۱۹۳۴ میں اردو ادب میں ''سچی کہانیوں کا سلسلہ شروع کیا۔وہ اس کے موجد اور بانی ہیں۔یہ افسانے

پہلے دہلی سے شاہد احمد دہلوئی کے مشہور رسالے ''ساقی'' میں چھپتے رہے۔ جس میں ان کے سارے افسانے ''پریم پجاری'' کے فرضی نام سے شائع ہوئے۔[۱۴]

ڈاکٹر ابوسعید نورالدین لکھتے ہیں:

> ''سچی کہانیوں'' سے ان کا مطلب وہ سچے اور واقعات ہیں، جو ہماری زندگی میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں، اور جن کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہو، اور ساتھ ساتھ سبق آموز اور عبرت خیز بھی ہو۔[۱۵]

سچی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''سچی کہانیاں'' کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۴۳ میں شائع ہوا۔ دوسرے اور تیسرے مجموعے علی الترتیب ''نوش ونیش'' اور ''چھوٹا خدا'' کے نام سے ۱۹۵۱ مین شائع ہوئے۔ ''نوش ونیش'' میں تیرہ افسانے ہیں۔ جو بے حد دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ان سچی کہانیوں کی وجہ سے شادانی اردو نثر کی اس میدان میں انفرادی حیثیت کے مالک ہوئے۔ دیباچہ ''نوش ونیش'' میں شادانی خود لکھتے ہیں:

> میری کوشش صرف اس قدر رہی ہے کہ جن واقعات کو سن کر جس طرح میرا دل متاثر ہوا تھا، ان واقعات کو پڑھ کر دوسرے بھی اس طرح متاثر ہوں اور ان آئیسوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کا صحیح عکس دیکھ سکیں۔ مطالعے کے دوران میں وہ اپنے گردوپیش سے بے خبر ہو کر افسانے کے واقعات میں کھو جائیں اور ختم کرنے کے بعد کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔[۱۶]

''نوش ونیش'' کے افسانے:

۱. ربیعہ
۲. مصری جادوگر
۳. ناہید کے خطوط
۴. مچھلی کا شکار
۵. نیا ادب زندہ باد
۶. شاہی انعام
۷. جھوٹ موٹ کی ایک کہانی
۸. فونٹن پن
۹. جرم وگناہ
۱۰. سہراب
۱۱. نوشین
۱۲. افسانہ کیونکر بنتا ہے؟
۱۳. حوری۔

''چھوٹا خدا'' میں ''چھوٹا خدا'' اور ''بے روزگار'' کے نام سے دوطویل مختصر افسانے ہیں۔ جو ڈراما کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ ''چھوٹا خدا'' کا دیباچہ میں شادانی لکھتے ہیں:

> اس ڈرامے میں تعلیم یافتہ، بے روزگار نوجوانوں کی جماعت کمیونسٹوں کا آلہ کار بنی ہوئی ہے اور ہر قسم کے خطرناک اقدام کرتی رہتی ہے۔ انجام کار شکست کھاتی ہے اور نیست و نابود ہو جاتی

ہے۔ظاہر ہے کہ بے روزگاری کا علاج امن عامہ کو برباد کرنے اور
دہشت پھیلانے سے نہیں ہوسکتا۔[۱۷]

تنقید نگار

شاعری اور افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق سے بھی ڈاکٹر شادانی کو خاصی دلچسپی تھی ۔ادبی دنیا میں ان کی شہرت کی اصل وجہ ان کی تنقید نگاری تھی۔ان کی کارگذاریاں نہ صرف اعلیٰ معیار کی حامل ہیں بلکہ اپنے اندر ایک واضح اور دلکش انفرادیت بھی رکھتی ہیں۔انہوں نے اپنے تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ ماہنامہ ساقی سے شروع کیا۔یہ مضامین اکتوبر ۱۹۳۷ سے لے کر نومبر ۱۹۴۰ تک قسط وار شائع ہوتے رہے۔جو بعد میں ''دور حاضر اور اردو غزل گوئی'' کے نام سے کتابی صورت میں فروری ۱۹۵۱ میں شائع ہوئی۔[۱۸] اردو تنقید کی دنیا میں وہ ایک باغی کی حیثیت سے مشہور ہیں۔''دور حاضر اور اردو غزل گوئی'' میں شادانی صاحب نے جس بیباکی اور بے رحمی کے ساتھ غزل کے غیر صحت مندانہ رجحانات، رسمی خیالات، بے جان روایات اور بے معنی مفروضات پر حملے کیے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ان مضامین میں انہوں نے نئے اور پرانے ادب کا تجزیہ کر کے اردو غزل گو شعرا کی خامیوں اور برائیوں کی نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ اصغر، حسرت، جگر اور فانی اس زمانے کے بے حد مقبول شعراء تھے۔اس دور کے ممتاز غزل گو شعراء کے کلام سے غلطیاں نکال کر اعراضات کی۔ انہوں نے اردو غزل اور بیسویں صدی کی اردو غزل کی جن کمزوریوں کو بے نقاب کیا تھا ان سے سیکھنے والوں نے بہت کچھ سکھا۔شادانی صاحب نے ان روایت کو دور کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ان شاعروں نے فرضی اور مصنوعی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان کے جذبات سچے نہیں ہیں۔اسی زمانے کے ذہن پر یہ بات نقش کر دیا کہ یہ تمام اہل کمال فی الحقیقت اہل کمال

نہیں ہیں۔شادانی کا مقصد تھا کہ بڑے ادیبوں یا شاعروں سے عقیدت رکھنے اوران کا احترام کرنے کے باوجود ان کی کمزوریوں کو جانیں۔زندگی کی طرح شعروادب میں بھی حقیقت پسندی ہونا اتنا ہی مفید ہے جتنا ضروری۔تنقید کا بنیادی مقصد تعمیر ادب ہے۔اور اس قسم کی تنقیدوں سے ڈاکٹر صاحب کا مقصد بھی یہی تھا۔اگر اسی بات کو انہوں نے نرم لہجے میں کہتے اور اس طرح کہتے کہ انہیں شعراء کی کلام کی روشنی میں ان کے نقائص کا حل بھی سامنے آجاتا تو ان کی یہ کوشش نہ صرف کامیاب ہوتی بلکہ ان کی دوسری ادبی کاوشوں کی سرمایہ ادب میں ایک مستقل اضافہ سمجھی جاتی۔

لیکن ان مضامین شائع ہونے کے بعد ڈاکٹر شادانی کی شہرت تو نہ ہوئی مگر وہ ادبی دنیا میں زیادہ نمایاں ہاگئے۔اور اردوادب کی تنقیدی دنیا میں ان کا نام ابھر آیا۔بعض لوگوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں ہیں کہ وہ دوسروں کے مخالف ہیں۔کسی نے غزل کا دشمن سمجھا۔کسی نے دوسروں کا خوشہ چین بتایا۔شادانی کی اعتراضات کے بارے میں شارب ردولوی کہتے ہیں:

> عندلیب شادانی نے غزل کے خلاف مضامین لکھے اور اس عہد کے مقبول غزل گوشعراء کو اپنا ہدف بنایا۔انہوں نے حسرت، فانی، جگر کے کلام پر شدید اعتراضات کئے اور اعتراضات کی لے اتنی بلند ہو گئی کہ توازن کا دامان ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔[19]

لیکن یہ درست نہیں تھا۔شادانی صاحب تو صرف اتنا چاہتے تھے کہ اردو غزل غلط اور غیر صحت مندانہ روایات کی گرفت سے نکل آئے اور ہمارے مایۂ ناز شعراء فضول گوئی پر اپنا وقت اور

اپنی صلاحیت ضائع نہ کریں۔ نڈرپن اور جرات مندی ایک بہترین نقاد کی سب سے بڑی خوبی ہے۔اس میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرنے کی ہمت ہونی چاہئے۔ یہ کام ڈاکٹر شادانی نے کر دکھایا۔اپنی تنقید نگاری کی کسوٹی پر انہوں نے غالبؔ، جوشؔ، شیفتہؔ، انیسؔ، دبیرؔ، نیاز فتحپوریؔ اور فرمان فتحپوریؔ کی علمی و ادبی غلطیوں کو آشکارا کیا۔ وہ بادشاہ متغزلین مولانا حسرت موہانی تک کو بھی نہیں بخشا۔لیکن اس تنقید سے ام کا مقصد کسی کی تحقیر وتذکیر اور تضحیک کرنا نہ تھا۔ان تمام شعراء کرام کی عظمت و بزرگی وہ حد درجہ قائل ہیں مگر ان کی غلطیوں کو قبول نہیں کر سکتے ہیں۔ دراصل ان کا اصل مقصد مصنف کو گہرے اور اندھیر غار سے نکالنا ھا۔ان کی سچی کہانیوں کی طرح ان کی تنقید نگاری بھی ایک لحاظ سے ان کی آپ بیتی ہے۔''دور حاضر اور اردو غزل گوئی'' کے بارے میں ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر شادانی ادبی دنیا میں مختلف حیثیتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔شاعر، افسانہ نگار، محقق اور نقاد کے ساتھ ساتھ وہ ایک عدیم النظیر نثار اور مورخ بی تھے۔مگر شاعری اور افسانہ نگار کی حیثیت سے انہیں وہ مقبلیت حاصل نہ ہوئی جو ایک محقق اور نقاد کی حیثیت سے ہوئی، اور یہ کہنا بجا طور پر درست ہے کہ عوام الناس اور ادبی دنیا میں ان کی شہرت کی اصل وجہ ان کی تنقید نگاری تھی۔[۲۰]

تحقیق کی میدان میں

ادبی محقق کا معیار یہ ہونا چاہئے کہ وہ صداقت کی بھرپور تلاش جاری رکھے اور شواہد اور روایت کی روشنی میں آگے بڑھتا رہے۔ڈاکٹر شادانی کی تنقیدی تخلیقات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ انہوں نے تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق کا حق بھی پوری

طرح ادا کیا ہے۔ انہوں نے تحقیق کے میدان میں کئی اہم انکشافات کئے اور آج بھی ادبی دنیا ان مضامین کو وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ''دور حاضر اور اردو غزل گئی'' کے علاوہ شادانی صاحب نے دو اور کتابیں لکھیں۔ ''تحقیقات'' اور ''تحقیق کی روشنی میں''۔ جن کتابوں نے اردو تنقید کو نئی منزلوں کا احساس دلانے میں خاصہ حصہ لیا ہے۔ ان کتابوں میں بھی تنقید کا ساتھ ساتھ تحقیق بھی اپنے پورے عروج پر نظر آتی ہے۔

''تحقیقات'' ڈاکٹر شادانی کے تحقیقی مقالات کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو غالباً آزادی کے فوراً بعد بریلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے بیشتر مقالات ادبی نقطہ نظر سے خالص تحقیقی ہیں۔ کچھ مقالات میں تحقیق اور تنقید کی بھرپور آمیزش ہے۔ یہ ۴۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۲۱ اس میں سولہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات ہیں:

۱. کسوٹی
۲. آزاد نظم
۳. مختصر افسانہ
۴. سند
۵. پرائیوٹ خطوط
۶. میر کا ایک خاص رنگ
۷. جوشؔ کی دولسانی غلطیاں
۸. ایران کی امر پرستی کا اثر اردو شاعری پر
۹. خواجہ حافظ اور شراب و شاہد
۱۰. ترانہ دوبیتی اور رباعی
۱۱. یزداں شکار کی تحقیق

۱۲. مدح یا ہجو
۱۳. پاک دامن رظیہ اور مورخین
۱۴. ایک تابنک ستارہ
۱۵. فارسی غزل اور جفائے محبوب
۱۶. لفظ التمس (التمس) کی لغوی تحقیق۔

''تحقیق کی روشنی میں'' ڈاکٹر شادانی کے تحقیقی و تنقیدی مقالوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔۱۹۶۳ میں یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۲۱ مضامین پر مشتمل ہے۔ان مقالات تحقیقی، تنقیدی اور ادبی نقطہ نظر سے کافی اہم ہیں۔ پروفیسر نظیر صدیقی لکھتے ہیں:

''تحقیق کی روشنی میں'' محض تحقیقی مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جن میں تحقیق اور تنقید دونوں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں۔''۲۲

اس کتاب میں چند مقالات ایسے بھی ہیں جس میں ادب کی چاشنی نا پیدا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تحقیقی مواد کا فقدان بھی نظر آتا ہے۔ کچھ مقالے ایک دوسرے کے صدائے بازگشت ہیں۔لیکن ان کے اسلوب میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو تنقید کے لئے ضروری قرار دی جاسکتی ہیں۔اس کتاب میں ۲۱ مضامین ہیں:

۱. شیفتہ ایک نقاد کی حیثیت سے
۲. ریختی کا موجد
۳. مرزا غالب اور دوسرے غالب
۴. خاں وران کا دیوان

۵. مواد ، ہیئت اور اسلوب
۶. محبوب کے لیے فعل مذکر کا استعمال
۷. حالی اور پیرائی اور مغربی
۸. ادب میں عریانی اور فحاشی
۹. لکھنوی شاعری کی چند خصوصیتیں
۱۰. ناسخ کی جذبات نگاری
۱۱. گلشن نوبہار
۱۲. مخزن فوائد
۱۳. دیوان جہاں
۱۴. خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے
۱۵. اوزان رباعی کے متعلق ایک نئی دریافت
۱۶. کچھ وافیے کی بابت
۱۷. چند تصریحات
۱۸. گنبد یا گنبذ
۱۹. قواعد اور قیاس
۲۰. سرقہ اور توارد
۲۱. ایک دل چسپ توارد۔

ان کی تحقیقی مقالہ ''ہندوستان کے مسلم مورخ'' بھی اردو ادب کا ایک گراں مایہ سرمایہ ہے۔ جا ۱۹۳۴ میں پی ایچ ڈی ڈگری کے لئے پیش کیا گیا تھا۔۲۳ اس میں تحقیق اور تنقید کا سنگم نظر آتا ہے۔ تحقیق وتنقید کرتے وقت وہ اپنے ذاتی نظریات کو ہی اہمیت دی۔ تنقید اور تحقیق کے سلسلے

میں ''پیام اقبال'' اور ''نقش بدیع'' شادانی کے دو اہم کارنامے ہیں۔

صحافت نگاری

۱۹۴۸ میں شادانی صاحب نے ''مشرقی پاکستان'' کے نام سے ایک روز نامہ اخبار جاری کیا تھا۔لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ بند ہو گیا۔۱۹۵۲ میں ''خاور'' کے نام سے ایک ماہنامہ شائع کیا۔ جو بنگل کی تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا اقدام تھا۔لیکن مالی مشکلات کے باعث بارہ رسالے شائع کرنے کے بعد یہ بھی بند کر دیا گیا۔[۴]

ڈاکٹر شادانی دیگر زبانوں کی کئی کتابیں ترجمہ بھی کئے تھے۔انشائے ابوالفضل، چہار مقالہ مصنفہ نظامی محروز، رباعیات باباطاہران مس خاص ہیں۔

ڈاکٹر شادانی علم وادب ،شعروسخن ،تہذیب وثقافت کی دنیا میں یقیناً ایک ماہر شخصیت کے مالک ہیں۔وہ ایک خوش اخلاق، خوش گفتار اور مجلس آرا انسان تھے۔وہ ایک بے مثال استاد تھے۔وہ اردو، فارسی اور انگریزی ہر زبان میں ماہر تھے۔جذبات ،خلوص،فکر وجدان، حقیقت ،سچائی اور واقعیت سے ان کی کہانی بھر پور ہے۔ان کا تمام کلام اردو زبان کا مرہون منت ہے۔

حوالہ جات

۱.ڈاکٹر عندلیب شادانی،مقدمہ ،تحقیق کی روشنی میں، لاہور،۱۹۶۳،ص ۶

۲. پروفیسر اقبال عظیم،مشرقی بنگال میں اردو، ڈھاکہ،۱۹۵۴،ص ۲۵۵

۳.ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر،ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کار نامے) ،ڈھاکہ،۱۹۹۲،ص ۲۳

۴. پروفیسر اقبال عظیم،مشرقی بنگال میں اردو،ص ۲۵۶

۵.ایضاً،ص ۲۵۶
۶.ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے)،ص ۱۱۹
۷.ڈاکٹر عندلیب شادانی،تعارف، نشاط رفتہ
۸.ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے)،ص ۱۲۸
۹.ایضاً،ص ۱۵۱
۱۰.ایضاً،ص ۱۵۳
۱۱.ایضاً،ص ۱۴۸
۱۲.ایضاً،ص ۱۴۲
۱۳.ایضاً،ص ۱۳۳
۱۴.ڈاکٹر ابوسعید نورالدین،تاریخ ادبیات اردو، لاہور، ۱۹۹۷،ص ۳۷۳
۱۵.ایضاً،ص ۳۷۴
۱۶.ڈاکٹر عندلیب شادانی، دیباچہ،نوش ونیش،ص ۶
۱۷.ڈاکٹر عندلیب شادانی، دیباچہ، چھوٹا خدا،ص ۶
۱۸.ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے)،ص ۱۷۷
۱۹.محبوب الرحمٰن فاروقی، آجکل اور ادب کے پچاس سال، ۲۰۰۰، دہلی،ص ۲۳
۲۰.ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے)،ص ۱۷۱
۲۱.ایضاً،ص ۲۲۶۔۲۲۷
۲۲.ڈاکٹر عندلیب شادانی،مقدمہ،تحقیق کی روشنی میں،ص ۱۰
۲۳.ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے)،ص ۳۹
۲۴. پروفیسر اقبال عظیم،مشرقی بنگال میں اردو،ص ۲۵۸۔

شعبۂ اردو ڈھاکا یونی ورسٹی کی تعلیمی قوت اور چیلنجز: ایک مستقبل پسند مطالعہ

صفدر امام قادری

Abstract

In the present research paper, the main focus is upon the evaluation of teaching and research of Urdu practiced in the University of Dhaka, Bangladesh. The great tradition of Urdu teaching in the last century reveals a golden past despite some interruptions but the time has changed.

Though Urdu is a global language and the teaching of Urdu has been practiced in more than 200 Universities of almost each and every continent, so there is evolving an international pattern and perspectives of teaching, writing and researches in the subject. In the Dhaka University, Bangladesh, the teaching and research of Urdu can't be left in isolation. The new syllabus and curriculum designing adopted in the Department of Urdu, Dhaka University promises an international outlook and broader aspirations which is very much commendable.

شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، آرٹس اینڈ سائنس، پٹنہ، ہندستان

But, these adaptations, changes and experiments require a marathon evaluation, especially in the light of teaching principles, global need and acceptability. At the one hand, you have to teach a complete history of Urdu language and literature from the very beginning to the recent days but it is needed to focus the professional aspects of Urdu which will help a local student to excel himself to get jobs in the Bangladesh. While focusing on the global attainments of Urdu, it is the demand of the time that the Department of Urdu should be the vibrant centre of Urdu-Bangla translations which will cater the needs of whole world.

Finally, in this paper, there has been an assumption that the Department of Urdu, Dhaka University, in coming days, shall be the centre of excellence in the subcontinent. There are some practical suggestions in the conclusion.

اردو زبان کی تعلیم و تدریس کے مسائل اس وجہ سے بھی بہت پیچیدہ اور مشکل ہیں کیوں کہ مختلف معاشرتوں نے اس زبان کو اس انداز سے اپنایا کہ متضاد اور مخالف ماحول اور تاریخ و جغرافیہ کی آویزشوں والی آبادیوں میں ایک ساتھ اس کے طلسمات قایم ہوتے چلے گئے۔ یہ زبان پیدا تو ہندستان میں ہوئی لیکن پاکستان اور بنگلہ دیش سے بڑھ کر اس انداز میں دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلی کہ اب مرکزیت اور آغاز کے سوالوں پر اتفاقِ رائے مشکل ہے۔ کبھی اردو درباروں کی زبان ہوتی ہوگی یا صوفیوں نے اپنے حلقے میں اس کی پرورش کی ہوگی لیکن اب اس کی کاروباری اور عوامی ضرورتوں نے اس طرح مزاج میں تبدیلی پیدا کردی

جس سے یہ اندازہ لگانا آسان نہیں کہ کس معاملے میں یہ زبان کون سی کروٹ لے گی۔ جب ایک ہی زبان کا ایک چاہنے والا بُت پرست ہو اور دوسرا بُت شکن، ایک صوفیِ باصفا ہو تو دوسرا شراب و کباب کا شیدائی، ایک روایت پرناز اں تو دوسرا جدّت پر فریفتہ؛ یہ بُتِ ہزار شیوگی اِس زبان کا ایسا مقدّر رہے جہاں نہ جانے کتنی اَبوجھ پہیلیاں موجود ہیں اور جنھیں اسی لیے بہتوں نے ناقابلِ تسخیر کہہ رکھا ہے۔

کثیر لسانی اور تہذیبی ماحول

اردو ہر چند دنیا کی نئی زبانوں میں سے ایک ہے لیکن اس کی تاریخ اور اس میں اتنے پوشیدہ ادبی اور علمی لعل و گہر موجود ہیں کہ کثیر ابعادی مطالعے کے بغیر اس زبان کے معاملات و مسائل کو بہ غور سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ تاریخ و تہذیب کے ساتھ ساتھ عہدِ جدید کے گوناگوں تقاضوں سے اس زبان نے جو اپنی تشکیلِ نَو کی؛ اسی نے اردو کو ہر معاملے میں قومی اور بین الاقوامی جہات سے غور و فکر کرنے اور اسی طرح اونچے معیاروں سے جینے کی ایک خو، پیدا کر دی۔ اس زبان میں دوسری زبانوں سے اخذ و استفادہ اور مختلف تہذیبوں سے لین دین کا جو شعور پیدا ہوا، اس سے اردو زبان یا تہذیب کے طَور پر الگ الگ رہنے والی شَے بن کر قانع نہ رہ سکی بلکہ زبانوں اور تہذیبوں کے امتزاج کے بنیادی اصول اس کی گھُٹّی میں اس طرح پیوست ہو گئے جیسے یہی صفت اس کی زندگی کی ضمانت ہو۔ آج بھی اکثر و بیش تر اردو داں آبادی کئی زبانوں میں ایک ساتھ درک رکھتی ہے۔ اعداد و شمار کی بات کریں تو یہ جان لینا قابلِ اطمینان ہے کہ اردو خواں آبادی میں ۷۵ رفی صد افراد ذولسانی ہیں جب کہ ہندی سے اس کا موازنہ کریں تو وہاں یہ صورت ۲۵ رفی صدی کے آس پاس ہے۔

اُردو کی تعلیم و تدریس کی تاریخ پر غور کریں تو یہ چار دِنوں کا قِصّہ نہیں ہے۔ ہندستان

میں اردو کے جو ابتدائی آثار ملتے ہیں، اُن میں ایک طرف راج دربار اور بادشاہت کا سلسلہ دِکھائی دیتا ہے(۱) تو اُسی کے پہلو بہ پہلو صُوفیا کی خانقاہیں، عُلما کے مدارس اور مسجدوں کے مکاتب مِل جُل کر تعلیم کا ایک مستحکم نظام قایم کر رہے تھے۔ مسلمانوں سے پہلے بودھوں نے ہندستان میں تعلیم و تدریس کا باضابطہ نظام قایم کر کے آریائی اقوام کو بہ طورِ تازیانہ تعلیم کا ایک عوامی منچ مہیا کرایا تھا۔ نالندہ اور وِکرم شِلا یا تک شِلا کُچھ لوگوں کے لیے بھلے سیر گاہیں ہوں گی لیکن اِن آثارِ قدیمہ کو بہ غور دیکھتے ہوئے مُشکل حالات میں بودھوں کی نئی تعلیم کا خاکہ پیش کرنے کی جسارت اور توجّہ کی وجہ سے ہمارا سَر ان کی تعظیم میں جھک جاتا ہے۔

اردو جب زبان کی حیثیت سے تشکیلی مراحل سے گُزر رہی تھی، اُس زمانے میں اردو پر جِن بولیوں کے سب سے زیادہ اثرات قایم ہوئے ہوں گے، ان کے بارے میں ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ کُچھ زیادہ تحقیقات ممکن نہ ہوئیں اور تحقیق کا جتنا بھی کام ہوا، اُس کے لیے پہلے سے ہی یہ اُصول قایم کر لیا گیا کہ اردو کو مغربی ہندی کی بولیوں سے برآمد شدہ مانا جائے جِس کی وجہ سے ماگدھی اور اَردھ ماگدھی بولیوں سے اردو کے ابتدائی رشتوں کے معاملات کو قابلِ غور سمجھا ہی نہیں گیا۔ اِسی لیے اردو کے ارتقا کے بہت سارے سوالات بعض ماہرینِ لسانیات کی کج ادائیوں اور چند علما کی عصبیت کی وجہ سے اب بھی غیر یقینی صورتِ حال میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ ہمیں یاد رہنا چاہیے کہ اس مسئلے کے حَل کے بعد ہی ہم اُردو کی مشرقی روایت کے بارے میں کُچھ نتائج اخذ کر سکتے ہیں اور اپنی زبان کی عربی، فارسی اور تُرکی روایت کے ساتھ ساتھ پُوربی زبانوں اور بولیوں کی روایات کے بارے میں غور و فکر کر کے کسی نئے لسانی نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ بعض افراد کی جبینوں پر شِکن آ جائے لیکن یہ سچائی معلوم ہوتی ہے کہ

ہندستان میں تعلیم کے سلسلے سے ادارہ سازی کا جو تصوّر بودھوں نے پیش کیا، اُسے مسلمانوں نے بہت غور سے دیکھا اور اپنے فروغ میں اسے سنجیدگی سے آزمایا۔ یہ دُرست کہ مسلمانوں نے تک شلا، وِکرم شلا اور نالندہ جیسے بڑے ادارے اپنی عظیم حکومتوں کے باوجود قایم نہیں کیے البتہ چھوٹے چھوٹے مدارس کے وجود اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اُنھیں قدیم عہد کی مذکورہ یونی ورسٹیوں کا بدل نہیں کہہ سکتے۔ عہدِ سلطنت کے بادشاہوں کی علم دوستی اور قدر شناسی کا شہرہ ہے لیکن وہ چاہتے تو تعلیمی ادارہ سازی کا کام اپنی بڑی بڑی تعمیرات کے ساتھ کر ہی سکتے تھے۔ پوری مغل تاریخ بھی عظیم تعلیمی ادارے قایم کرنے کے پہلو سے ہمیں خاطر خواہ جواب نہیں دیتی اور اس طرح بودھوں کے تعلیمی شعور کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ حد تو یہ ہے کہ نالندہ کے زوال کا الزام بھی محدود معنوں میں ہی سہی، بختیار خلجی کی افواج پر ہی جا پڑتا ہے۔ اس طرح تعلیمی ادارہ سازی میں معاونت کے بجائے ہمارے بادشاہوں کے نام اداروں کے مسمار کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔

صوفیا: ہندستان میں اردو تعلیم کے اوّلین بنیاد گزار

ہندستان میں اردو کی ابتدائی تعلیم کو صُوفیا کی خانقاہوں اور مساجد یا مدارس سے الگ کر کے ڈھونڈنا مُشکل ہے۔ یہ بھی دُرست ہے کہ یہ ادارے مذہبی تعلیم کے لیے قایم کیے گئے تھے اور اِن کا ایک مقصد تبلیغِ اسلام اور رضا مندی سے ہی سہی لیکن تبدیلِ مذہب بھی تھا۔ (۲) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اصل کام تو عربی زبان میں ہونا تھا۔ عربی کے ساتھ ساتھ کاروباری جہتوں سے فارسی یا تُرکی کے لیے بھی مواقع پیدا ہو گئے۔ انھی تینوں زبانوں کے ساتھ ساتھ عوامی دباو یا ذریعۂ تعلیم اور تبادلۂ خیالات کی مجبوریوں نے اردو کو عہدِ سلطنت کے مدارس میں جگہ دِلائی ہوگی لیکن لسانی حکمرانی تو بہر حال عربی، فارسی اور تُرکی کے ہاتھ میں رہی اور

بادشاہت کے لُٹتے وقت تک اِس میں کوئی خاص تبدیلی سامنے نہیں آئی۔

حقیقت میں اہلِ اُردو کے درمیان تعلیمی ادارے قایم کرنے کا سلسلہ انگریزوں کی آمد اوران کے اقتدار کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اِس سے پہلے بڑے ادارے قایم کرنے اور اُن کے دروازوں کو عوام کے لیے کھولنے کی خواہش یا ضرورت کو سماج نے شاید سمجھا نہیں تھا۔ اِسی لیے مسلمانوں کے درمیان واضح مذہبی ہدایات کے باوجود تعلیم سے بے رُخی اور عدم توجہی کی روشِ عام ایک طویل مدّت تک قایم رہی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ایک ہی زمانے میں انگریزوں کا اثر لینے اور اُن سے اختلاف کرنے کی تعلیمی مہم شروع ہوئی اور ہم نے انگریزوں کی یونی ورسٹیوں کے ساتھ ساتھ دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور ندوۃ العلما یا دارالمصنّفین جیسے کچھ ادارے قایم کر لیے جن سے ہمارا رُکا ہوا نیا تعلیمی سلسلہ پھر سے جاری ہو سکا اور اِس بہتر نقطۂ آغاز کے نتائج بہ ہر طور سامنے آنے لگے۔ آج کی تعلیمی پسماندگی کا سبب جاننے کی کوششوں کے دوران ہمیں یہ نہیں بھُولنا چاہیے کہ ہم نے بڑے تعلیمی ادارے قایم کرنے کی طرف توجہ بہت دیر سے کی جب کہ کہنے کو اپنی قوم میں بادشاہت کا ایک پورا سلسلہ موجود تھا۔

اس لیے اس حقیقت سے ہم اپنی گفتگو شروع کریں کہ ہندستان میں اردو آبادی نے بڑے تعلیمی اداروں کی بنیاد انگریزوں کی حکومت کے قیام یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد ہی رکھی۔ یہ ادارے واضح طور سے مغربی اثرات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان اداروں سے الگ، اسکول، کالج اور یونی ورسٹیوں کا جو سلسلہ شروع ہو رہا تھا، وہاں بھی اردو کے لیے گنجایشیں پیدا ہوئیں۔ روایتی مذہبی تعلیم سے اردو آبادی نے اپنی نئی تعلیم کے ڈھانچے کو جوڑنے کی بہت کم کوشش کی اور زیادہ توجہ اس بات پر رہی کہ عصری تعلیم کے لیے مغربی پیمانوں کو تختۂ مشق بنایا

جائے اور مذہبی تعلیم غیر رسمی حصّے میں حسبِ ضرورت شامل رہے۔ بہت مشکل سے جنگِ آزادی کے دوران جامعہ ملیّہ اسلامیہ جیسے ادارے کا قیام اس نقطۂ نظر کے ساتھ ہوا کہ عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی اور قومی تعلیم کے ایک مِلے جُلے خاکے میں رنگ بھرا جا سکے۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مغربی تعلیم کی رہنمائی میں علی گڑھ نمایندہ ادارہ تھا اور مشرقی اور مذہبی انداز کی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلما وغیرہ قایم ہوئے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اداروں میں آپسی تعلّق، نقطۂ مفاہمت، صلاح ومشورہ اور اصول ونظریات یا عمل میں ایک دوسرے سے سیکھنے اور پانے کے ثبوت ایک اچھے خاصے زمانے تک ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔

انیسویں صدی میں قومی تعلیم کا ادھورا خاکہ

ادارہ سازی میں جب کوتاہیاں ہوں گی تو یہ بھی حقیقت سامنے آئے گی کہ ایک ڈسپلن کے طور پر اصل تعلیم کو فروغ دینے میں بہت ساری کمیاں در آئیں گی۔ مضمون کے طور پر تعلیم اور تدریس کو سمجھنے کی کوشش اور عالمی یا قومی سطح پر اُس کے تجربات اور نفاذ کی باری تو اور بھی دیر سے آئی۔ آج تک ایسی کوئی مکمّل تحقیق یا کتاب ہمیں دیکھنے کو نہیں ملی جس سے ۱۹ویں صدی کے ایسے تعلیمی ادارے جو اُردو آبادی کو استحکام دینے کے لیے قایم ہوئے تھے، اُن کی تعلیم کا پُورا پُورا خاکہ سامنے آ جائے۔ حالاں کہ ہر جگہ مستند، ذہین اور قومی خلوص سے لبالب شخصیتوں نے یہ تعلیمی بیڑا اُٹھایا تھا۔ اِس کی وجہ سے اِن اداروں کا فیضان کم ہوا اور ہماری قومی تعلیم کا خاکہ انیسویں صدی کے اداروں سے مکمّل طور پر اُبھر کر سامنے نہیں آ سکا۔ وہ سب خاکے ادھورے یا یک رُخے تھے۔ چاہے وہ دارالعلوم کی تعلیمی فِکر ہو یا علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا تعلیمی خواب۔ سب میں ہمیں اپنی ضرورتوں کے مطابق کُچھ نہ کُچھ نئے رنگ بھی بھرنے تھے۔

شعبۂ اردو، ڈھاکا یونی ورسٹی، بنگلا دیش

شعبۂ اردو، ڈھاکا یونی ورسٹی (بنگلا دیش) نے تعلیم و تدریس کی ایک صدی مکمل کرلی۔(۳) کسی بھی شعبے کے لیے سو برس ایک اچھی خاصی میعاد ہے مگر جیسے ہی اسے تعلیم و تدریس کے حوالے سے ہم سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اس وقت یہ بات اور روشن ہو جاتی ہے کہ پچھلے سو برس ہمہ جہت ترقی اور انقلاب سے لیس دورانیے کی غمازی کرتے ہیں۔ ان سو برسوں کو اگر بنگلا دیش یا ڈھاکا یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے حوالے سے مختلف وقفوں میں تقسیم کیا جائے تو کھلے طور پر اس کے تین حصے ہوں گے۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک، اسے ہندستان کا ایک خطّہ کہا جائے گا جو ۲۶ر برسوں کو محیط ہے۔ ۱۹۴۷ء سے اگلے ۲۴ر برس وہ مشرقی پاکستان کا حصہ ہے اور پھر اس کے بعد پچاس برس آزاد قومیت کی حصولیابی کے ساتھ بنگلا دیش کی نمایندگی کر رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے اور ۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۷۱ء تک ان پچاس برسوں میں اولاً جنگِ آزادی اور پھر آزاد قومیت کے خواب کی تعبیر میں گزرے ہیں۔

یہ آسان نہیں کہ کوئی تعلیمی ادارہ اتنی جدوجہد کے مرکز میں رہ کر اپنے وجود کو اس سے علاحدہ رکھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈھاکا یونی ورسٹی نے دونوں ادوار میں تحریکاتِ آزادی کے لیے اپنے نونہالوں کو پیش کیا اور ان کی بیش بہا قربانیوں سے تاریخ کے اوراق سجے دھجے اور روشن ہیں۔ اس ادارے کے طلبہ اور اساتذہ ایک طرف ایثار اور سرفروشانہ جذبے سے نئے اہداف قایم کر رہے تھے، دوسری طرف ملک و قوم کی تعمیر و تشکیلِ نو کی ذمہ داریوں کو بہتر طریقے سے ادا کرتے ہوئے اپنے اور اپنے بزرگوں کے خوابوں کو اس کے انجام تک پہنچانے میں سرگرم رہے۔ یہ بات ڈھاکا یونی ورسٹی کے تینوں ادوار کے لیے کہی جاسکتی ہے۔ شاید یہی سبب ہوگا کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی ہندستان کے معتبر اور بااثر تعلیمی اداروں میں ایک ایسے ادارے

کے طور پر ڈھاکا یونی ورسٹی کو پہچانا جانے لگا تھا جہاں یونی ورسٹیاں اپنے ملک اور قوم کی دانش کی قیادت کرتی ہیں۔

شعبۂ اردو ڈھاکا یونی ورسٹی کا قیام یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو یونی ورسٹی کے قیام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ ایک طویل مدت تک شعبۂ اردو اور شعبۂ فارسی کا مشترکہ وجود تھا اور برصغیر میں ایسے مشترکہ شعبوں کی ایک طویل روایت رہی ہے۔ ڈھاکا یونی ورسٹی میں تو ۲۰۰۷ء میں اردو اور فارسی شعبوں کی علاحدگی ممکن ہوئی۔ (۴) جناب فدا علی خاں اولین استاد اور صدر ہوئے مگر ۱۹۲۸ء میں عندلیب شادانی کے اس شعبے سے جڑنے کے بعد برِصغیر کے اہم شعبہ ہائے اردو و فارسی میں اس کا شمار ہونے لگا۔ تقریباً دس برسوں تک ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی اس شعبے سے متعلق رہے اور اسے علمی مرکز بنانے میں ان کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعد کے اساتذہ میں ڈاکٹر محمد عبداللہ، ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر ام سلمیٰ، پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول جیسے افراد نے بنگلا دیش کے قیام کے بعد اس شعبے کو اپنی علمی قوت سے مالا مال کیا۔ انھی کی کوششوں سے آج یہ صورتِ حال ہے کہ شعبۂ اردو میں ۹/اساتذہ سرگرمِ کار ہیں۔ اکثر صاحبِ تصنیف ہیں۔ بعض کی اردو اور بنگلا دونوں زبانوں میں کتابیں موجود ہیں۔ کئی ایسے اساتذہ ہیں جو متعدد بین الاقوامی سیمیناروں میں شریک ہو کر شعبۂ اردو کی عالمی شناخت قایم کرنے میں معاون رہے۔ ان اساتذہ میں خاص طور سے ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں، ڈاکٹر محمود الاسلام، ڈاکٹر محمد غلام ربانی، ڈاکٹر محمد اسرافیل، ڈاکٹر رشید احمد، موجودہ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر رضاء الکریم، جناب حسین البناء، جناب غلام مولا اور محترمہ حفصہ اختر کی کارکردگی عصرِ حاضر میں اس شعبے کی قومی اور بین الاقوامی شناخت کی ضامن ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ ایک طویل مدت تک یہ شعبہ قابلِ ذکر تحقیقی مرکز کے طور پر بھی کام کرتا رہا ہے۔ موجودہ عہد کے اساتذہ سے قبل کے بھی متعدد اساتذہ نے اسی شعبے میں تحقیق کی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری یونی ورسٹیوں میں بھی یہاں کے فارغین تحقیق کر کے برسرِ کار ہیں۔ اس شعبے میں اردو بنگلا اور بنگلا اردو تراجم کی ایک مستحکم روایت رہی ہے۔ بالکل آغاز میں فدا حسین خاں کے دور سے ہی یہ سلسلہ قایم ہو جاتا ہے۔ انھوں نے بنکم چندر کے ناول کا ترجمہ 'روگ' کے نام سے کیا تھا۔ جناب فیض احمد چودھری نے فارسی کی کتابوں کے بنگلا تراجم کے ساتھ 'بنگلا اردو لغت' کی متعدد جلدیں شایع کیں۔ قاضی نذر الاسلام کی منظومات اور دیگر تحریروں کے اردو تراجم اور تنقید و تحقیق کے سلسلے سے پروفیسر محمد عبداللہ اور محترمہ کنیز بتول کی خدمات اہم ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر رشید احمد اور پروفیسر محمد غلام ربانی نے اردو نگارشات کے بنگلا تراجم پیش کر کے شعبے کے اس سلسلے کو استحکام بخشا۔

شعبۂ اردو کی جس مستحکم علمی روایت کی بنیاد عندلیب شادانی، شوکت سبزواری اور پروفیسر محمد عبداللہ نے ڈالی تھی، اسے بعد کے زمانے میں پروفیسر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر ام سلمیٰ، ڈاکٹر غلام ربانی اور پروفیسر محمد محمود الاسلام نے نہ صرف یہ کہ جاری رکھا بلکہ اپنی تصنیفات کی اشاعت سے برصغیر کے ادبی اور علمی آفاق کی کچھ اس طرح سے توسیع دی کہ ان کی تصانیف پوری توجہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ شعبۂ اردو کے دیگر اساتذہ کے تنقیدی و تحقیقی مضامین نہ صرف یہ کہ ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے جرنل میں شایع ہوتے ہیں بلکہ ہندو پاک کے بہت سارے تحقیقی جریدوں میں بھی ان کے مضامین کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا علمی و ادبی معیار کسی سے کم نہیں اور وہ شعبۂ، اردو، ڈھاکا یونی ورسٹی کے علمی کاموں کی توسیع برِ صغیر اور اس سے باہر کے رسائل و جرائد میں بہ حسن و خوبی کر رہے ہیں۔

نئے لسانی ماحول میں اردو

بنگلا دیش کا وجود جس لسانی تنازعے کے بنیاد پر قایم ہوا اور جس ثقافتی شناخت کو بنیاد کا پتھر تسلیم کیا جاتا ہے؛ اس میں اردو کی مشکل حیثیت سے سب واقف ہیں۔ مشرقی پاکستان کی جس لسانی تحریک کو کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے نتیجے میں بنگلا دیش کا قیام عمل میں آیا، وہ اردو زبان کے تفوق اور غیر ضروری طور پر تہذیبی زور آوری کے خلاف تھی۔ دنیا کے بہت سارے حصوں میں زبان اور تہذیب کی بنیاد پر آویزشیں ہوتی رہی ہیں اور قوموں کے سامنے ایسے چیلنجز بھی آتے رہے ہیں۔ اب اگر اردو زبان اور تہذیب کے خلاف لاکھوں جانوں کے نقصان کے بعد بنگلا دیش نے اپنا آزادانہ وجود حاصل کیا تو یہ فطری امر ہے کہ بعد کے دور میں اردو زبان کے لیے مشکلات کا آنا لازم تھا۔ بنگلا دیش کے قیام کے بعد وہاں نئے سرے سے جو لسانی اور تعلیمی حکمتِ عملی اپنائی گئی، اس میں اردو کے لیے کسی طرف داری کی گنجایش نہیں ہوسکتی تھی۔ جہاں جہاں تقسیم اور بٹوارے کی کیفیت ہوتی ہے، وہاں ایسی مشکلات اور فطری لسانی ارتقا کی راہیں اکثر وبیش تر مسدود ہونے لگتی ہیں۔ جب پورے بنگلا دیش میں اردو کے سلسلے سے ماحول میں ناخوش گواری اور اب تری پیدا ہو چکی تھی، ایسے میں اس سے متاثر ہوئے بغیر ڈھاکا یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو بھی اپنے قدم آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔

تاریخ کے ایسے ہی موڑ پر شعبۂ اردو، ڈھاکا یونی ورسٹی میں بعض ایسے اساتذہ سرگرم ہوئے جنھوں نے اس مشکل گھڑی میں اپنی مادری زبان اور اپنی علمی زبان کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی کوششیں کیں۔ انھی کی کوششوں کا یہ بھی نتیجہ ہے کہ انھیں مادری زبان بنگلا کے درجنوں اساتذہ اور ہزاروں کی تعداد میں ایسے طلبہ ملے جنھوں نے اردو زبان کی تعلیم وتدریس کو کسی نفرت یا جذبۂ عناد سے نہیں دیکھا بلکہ دنیا کی جدید زبانوں میں ایک قابلِ ذکر زبان سمجھا؛ اور

اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی تھی کہ ان میں سے بعض کے آبا واجداد کی زبان اردو ہی تھی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہوا ہوگا کہ آج شعبۂ اردو، ڈھاکا یونی ورسٹی کے تقریباً تمام و کمال اساتذہ بنگلا نژاد ہیں اور انھوں نے اپنی روادارانہ کوششوں سے اردو زبان نہ صرف یہ کہ سیکھی بلکہ اسے اپنی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا حصہ بنانے میں بھی کامیاب ہوئے۔ پچاس برس کی مدت کم نہیں ہوتی ہے، اس عرصے میں اردو کے سلسلے کی مخالفت اور نفرت میں بھی واضح طور پر کمی آئی اور ایک جدید زبان کے طور پر اردو کی تعلیم و تدریس اور اس کے فروغ کے لیے خوش گوار ماحول بھی پیدا ہوا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ شعبۂ اردو، ڈھاکا یونی ورسٹی اردو مضمون کے قومی اور بین الاقوامی سے می نار کامیابی سے کرالیتا۔

مادری زبان میں تعلیم اور دوسری زبانوں میں تعلیم کے درمیان دنیا بھر میں رسا کشی چلتی رہی ہے۔ ایسا بھی ہوا کہ کہیں ذریعۂ تعلیم میں تبدیلی کی گئی اور لوگوں نے نئی زبانوں کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ اس تبدیلی یا رسا کشی یا مقابلہ آرائی کو نفرت کے مقابلے علمی دنیا میں چیلینج کے طور پر قبول کیا جانا زیادہ معقول ہے۔ یہ بات درست ہے کہ جس زبان اور تہذیب کے لیے لاکھوں جانیں تلف ہوئیں، ان کے لیے سپردگی لازمی ہے۔ آخر بنگلا دیش اور ہندستان کے مغربی بنگال میں بنگلا زبان کے لیے اضافی توجہ نہ ہو تو کس جگہ اس کے لیے گنجایش پیدا ہوگی؟ اس لیے اگر بنگلا دیش نے ذریعۂ تعلیم کے لیے بنگلا زبان کو آزمایا اور مادری زبان کو فروغ دینے کے لیے نئے راستے ہم وار کیے تو اس میں کون سی نامناسب بات تھی۔ اب اردو کے لیے بنیادی سوال یہ تھا کہ بنگلا کی موجودگی میں اپنے آزادانہ وجود کے لیے گنجایشیں تلاش کرے۔ انگریزی زبان کو اگرچہ یہ سہولت حاصل تھی کہ برطانوی استمراریت کے زور سے وہ نہ جانے کہاں کہاں پہنچ گئی مگر انگریزوں کا بوریا بستر سمٹ جانے کے باوجود ان علاقوں میں

انگریزی نے اپنی موثر موجودگی کو زائل نہ ہونے دیا۔ تعلیم اور کاروبار کے ساتھ انتظامیہ میں انگریزی زبان نے اپنے لیے ایسی گھنی چھاؤں تلاش کر لی تھی جس سے دنیا کے ہر گوشے میں اس کے لیے بعد کے زمانے میں بھی آسانیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔

بنگلا دیش میں اردو

بنگلا دیش میں اردو زبان کو انگریزی کی طرح اپنے لیے گنجایشیں تلاش کرنی ہوں گی۔ ایک بڑا طبقہ جو براہ راست اس جدوجہد میں شریک تھا، وہ اب اپنی عمرِ طبعی کو پار کر رہا ہے۔ اس کے دل میں اردو کے سلسلے سے جو نفرت اور عناد یا تکلیف تھی، وہ نسل دھیرے دھیرے رخصت ہو رہی ہے۔ شاید اسی لیے وہاں اردو کے خلاف فی زمانہ کوئی تحریک چلتی ہوئی نظر نہیں آتی ہے۔ پچاس ساٹھ سال پہلے کے ماحول سے اس کا موازنہ کریں تو صاف صاف فرق سمجھ میں آسکتا ہے۔ نفرت سے مقابلہ کرنا مشکل کام تھا اور جذباتی رشتوں کو گزند پہنچانے کی طرح سے تھا لیکن بنگلا دیش کے نئے لوگوں اور خاص طور سے ایسے افراد جو گذشتہ نصف صدی میں پل بڑھ کر بڑے ہوئے، انھیں اردو سے بھلا نفرت کیوں کر ہوگی؟ سنی سنائی باتیں اور کتابوں میں پڑھے گئے اسباق کے مقابلے اپنی آنکھوں سے دیکھے گئے احوال زیادہ کارگر اور موزوں ہیں۔ بنگلا دیش میں اردو کو غیر ملکی زبانوں کے ساتھ ساتھ میدان میں آنا ہوگا۔ انگریزی کو جس طرح استمراری روایت کا حصہ ہونے کا ساری کالونی میں فائدہ ملتا رہا ہے، کیا اردو کو بنگلا دیش میں اس انداز سے اپنی روایتیں تلاش کرنے اور ان کی بنیاد پر نئے ماحول میں خود کو کھڑا کرنے کے لیے کیوں کر مشقت نہیں کرنی چاہیے۔ اب تو وہاں اردو مادری زبان بولنے والی نسل کم سے کم ہے اور اب بنگلا مادری زبان والے افراد بھی اردو کی طرف ملتفت ہیں۔

یہ یاد رہے کہ برصغیر کی زبان ہونے کے باوجود ہندستان اور پاکستان کی طرح بنگلا

دیش میں اردو کے لیے وہ آسانیاں نہیں ہیں جو ۱۹۷۱ء سے پہلے وہاں سیاسی جبر اور ایک معاون و موافق ماحول کی وجہ سے حاصل تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ چین، جاپان یا جرمنی، فرانس کی طرح بنگلا دیش میں اردو ایک اجنبی دیار کی باشندہ بھی نہیں تھی۔ مسلم قوم کی اکثریت کی وجہ سے مدارس اور اسلامی ادب کا وہ ذخیرہ جو عربی کے علاوہ اردو اور فارسی میں موجود ہے، اس سے استفادہ کے لیے بھی اردو زبان ایک معقول روایتی ذریعہ رہی ہے۔ اگرچہ اردو کے لیے کوئی تحریکی سرگرمیوں کے امکانات وہاں نہیں، اردو ذریعۂ تعلیم کے ادارے بھی کھلنا ناممکنات میں درج ہوگا۔ اس کے باوجود گھریلو زندگی یا خال خال مدارس و مکاتب سے اردو سیکھ کر آنے والی نسل ضرور بنیادی آبادی کے طور پر پہچانی جائے گی جسے اس زبان کو لے کر آیندہ تعلیم حاصل کرنی ہے۔ بنگلا دیش میں ایسی قوتوں کو غیر رسمی طریقے سے جوڑنے کی کوششیں کی جاسکتی ہیں۔ وہ آبادی جس نے اردو کی تھوڑی بہت بھی رسمی تعلیم اسکول یا کالج آنے سے پہلے حاصل کر لی ہے، انھیں اگر تربیت دے کر اعلا تعلیم کے لیے آگے بڑھایا جائے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ یہ آبادی ہر اعتبار سے کسی بھی غیر ملکی زبان کے سیکھنے والوں سے بڑی ہوگی اور اسے سنبھال کر دوسری زبان کے طور پر اردو کو آزمانے کے لیے راغب کیا جاسکتا ہے۔

شعبۂ اردو، ڈھاکا یونی ورسٹی، بنگلا دیش کی حقیقی قوت

دنیا کے بہت سارے ملکوں کی طرح بنگلا دیش میں چار سال میں بی۔اے۔ اور ایک سال میں ایم۔اے۔ کے کورس پڑھائے جاتے ہیں۔ ڈھاکا یونی ورسٹی پورے بنگلا دیش میں صرف تاریخی طور پر فوقیت نہیں رکھتی بلکہ یہ ایک سچائی ہے کہ پورے بنگلا دیش کی سب سے نمایندہ یونی ورسٹی کے طور پر پہچانی جاتی ہے۔ روایت اور قدیم تاریخ کے ساتھ نئی ترقیات سے ہاتھ ملانا اور خود کو وقت کے بدلتے طوفان میں آگے بڑھاتے رہنے کی ایک خاص خوبی

یہاں کی مٹی میں موجود ہیں۔ شاید اسی لیے ڈھاکا یونی ورسٹی میں پورے بنگلا دیش سے دور دراز کے طالب علم داخلہ لیتے ہیں اور کامرانی حاصل کر کے اپنے اپنے شعبۂ حیات ک پہنچتے ہیں۔ وافر تعداد میں لڑکے اور لڑکیوں کے ہاسٹل ہونے کے باوجود طلبہ کی ایک بڑی جماعت باہر پرائیویٹ ہاسٹلس میں رہتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈھاکا یونی ورسٹی میں دور دراز سے پہنچنے والے طالب علموں کی بڑی تعداد قایم رہتی ہے۔ ہمارا ذاتی تجربہ بھی اس حقیقت پر مہر لگاتا ہے۔ یوں بھی داخلے کی بنیاد مقابلہ جاتی امتحان ہے، ایسے میں جو جہاں سے مقابلہ جیت کر آجائے، یونی ورسٹی اس کا استقبال کرے گی۔ اسی لیے شعبۂ اردو میں بھی دور دراز کے اضلاع سے لے کر مقامی بچوں کی بڑی تعداد ہمیشہ رہتی ہے۔ بنگلا دیش کے کم وبیش ہر ضلع سے لڑکے اور لڑکیاں شعبۂ اردو میں تعلیم کے لیے پہنچ جاتے ہیں، یہ اکثر باصلاحیت اور اپنے مستقبل کے لیے بیدار بچے ہیں۔ مقابلہ جاتی امتحان میں کامیاب ہو کر آئے ہیں، اس لیے ان کی صلاحیت اور ذہانت سے یوں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کسی بھی تعلیمی شعبے کے لیے یہ خاص بات ہوگی کہ اس کے پاس جو لوگ تعلیم کے لیے آئے ہیں، وہ ذہین اور باصلاحیت ہیں۔ ایسے پانچ سو بچے شعبۂ اردو، ڈھاکا یونی ورسٹی کے پاس ہمیشہ رہتے ہیں۔ ان کا مقدر بنانا اور انھیں شاہ راہِ حیات پر دوڑتے ہوئے دیکھنا وہاں کے اساتذہ کا فرضِ اولین ہے۔ کوئی یہ سمجھ لے کہ بی۔اے۔ میں اگر سو بچے آرہے ہیں تو وہ سب کے سب ایم۔اے۔ تک جائیں گے، یہ لازم نہیں ہے۔ اسی طرح جو ایم۔اے۔ میں پہنچ چکے ہیں، وہ لازماً پوری فوج کی طرح ریسرچ میں داخلہ نہیں لے سکتے۔ زندگی میں ہزار شعبے ہیں اور ہمارے طلبہ اپنی صلاحیت سے طرح طرح کے شعبوں میں جانا پسند کرتے ہیں۔ سب کے سب درس وتدریس میں ہی کیوں آئیں اور اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو اگلے مرحلے میں

انھیں ملازمت کیوں کر مل پائے گی؟ یہاں شعبۂ اردو کی بڑی ذمہ داری ہے کہ اس کے پاس جو لوگ تعلیم کے لیے آرہے ہیں، انھیں وہ اپنے مضمون سے ملازمت تک پہنچانے کے حالات میں نہیں ہیں۔ کسی بھی مضمون کو تعلیم کے لیے چنتے ہوئے طالب علم سب سے پہلے روزگار کے معاملات میں ہی توجہ دیتا ہے۔ مگر بنگلا دیش میں اردو مضمون کی کتنی آسانیاں نکلیں گی؟ ہر سال چند اسکول کے اساتذہ اور بہت سارے برسوں پر یونی ورسٹی میں تقرری۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو پڑھنے کے لیے ہمارے پاس جو طالب علم آتا ہے، وہ یہ سوچ کر آئے کہ پڑھنا تو اسے اردو ہے مگر روزگار کے لیے اسے دوسرے سبجیکٹ اور اس کے لیے مناسب تربیت سے اضافی طور پر لیس ہونا ہوگا۔ یہ صرف بنگلا دیش ہی کے لیے مسئلہ نہیں ہے، ہندستان اور پاکستان میں بھی ایک بڑی تعداد ایسے طلبہ کی ہے جو بھلے اردو زبان و ادب کی اعلا تعلیم حاصل کرتے ہیں مگر ملازمت کے لیے انھیں دوسرے مضمون اور اکثر دوسرے ذریعۂ تعلیم کی طرف قدم بڑھانے ہوتے ہیں۔ یہ ہر مضمون کے لیے درست ہے کیوں کہ جس نے بنگلا پڑھ لیا، وہ Physics کے امتحان میں خود کو نئے سرے سے کھڑا پاتا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ Physics کی بنیاد پر اسے جو ملازمت مل رہی ہے، اس میں بنگلہ زبان کی وجہ سے اسے کسی بھی طرح کی سہولت میسر نہیں آئی۔ کیا اسی طرح اردو کے طالب علم کو نہیں تیار کیا جا سکتا کہ وہ دوسری تیسری زبان کے طور پر تو اردو پڑھے ہی، وہ مقابلہ جاتی امتحانات میں اور کسی بھی دوسرے مضمون سے مقدر آزمائی کر سکتا ہے۔ یہ زبان کی ہم واری، تہذیبی سطح پر استحکام اور نجی ضرورتوں یا فیض یابی کے لیے زیادہ موزوں ہوگی۔

بنگلا دیش کے لیے اردو غیر ملکی نہ سہی مگر غیر ملکی اطوار کی ہی زبان ہے، اس لیے دنیا

میں غیر ملکی زبان کی تدریس کے انداز اور معیار کو ملحوظ رکھنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔ زبان، چہ جائے کہ مادری زبان ہی کیوں نہ ہو، وہ ملازمت کا ذریعہ بنے، یہ کہیں بھی لازم نہیں ہے۔ بنگلا دیش میں صرف بنگلا زبان پڑھ کر ہی کوئی یہ توقع کیسے کرے کہ وہ ملازمت تک پہنچ جائے گا۔ شاید یہ خام خیالی ہوگی۔ زبان صرف ذریعۂ اظہار ہے۔ باتوں کو دوسروں تک پہنچانے کا ایک سلیقہ۔ ایسے مرحلے میں زبان وادب کے شعبے کی حقیقی ذمہ داری طالب علم کے ترسیلی نظام کو صیقل کرنا ہے۔ وہ کوئی بات کس انداز سے اور کتنے نپے تلے اور موثر طریقے سے پیش کرسکتا ہے، اس کی تربیت ہر زبان کا استاد اپنے طلبہ کو دیتا ہے۔ دنیا کے ماہرینِ زبان اس بات سے متفق ہیں کہ ایک زبان میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ہی غیر شعوری طور پر دوسری زبان میں بھی ایک خاص حد تک ترسیلی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس وجہ سے اردو جیسی زبان کی تدریس طالب علم کے Communication skill کو بڑھانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگی۔ اردو شاعری کا سرمایہ سماجی زندگی میں ہر دور میں کارآمد اور موثر مانا گیا ہے۔ بنگلا مادری زبان کے باوجود جو طالب علم اردو شعبے میں پانچ برس یا چار برس کے لیے اردو زبان وادب پڑھنے کے لیے آیا، وہ یقینی طور پر بہتر Communication skill اور تجزیے کی صلاحیت کے ساتھ کارزارِ حیات میں دوسروں کے مقابلے زیادہ کامیاب ہوگا۔ آپ اس بات کو بھول جائیے کہ وہ داروغہ اور انسپکٹر اردو کی وجہ سے اگر نہیں بن رہا ہے تو اس کے پاس بی۔ اے۔ اور اس سے پہلے کی جماعتوں میں کئی دوسرے مضامین تھے جن میں ایک حد تک اس نے صلاحیت پیدا کرلی تھی۔ انھی مضامین کو پڑھ کر اسے مقابلہ جاتی امتحان میں بیٹھنا ہوگا۔ انٹرویو ہی نہیں ملازمت کے دوران سماجی رابطے میں بھی اسے ہر مرحلے میں اردو جیسی زبان کی ضرورت پڑے گی اور اس سے وہ نتیجہ خیز فائدے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔

شعبۂ اردو کی حدود

ڈھاکا یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے طلبہ اور اساتذہ جہاں بڑی تعداد میں درس و تدریس کا ایک خوش گوار ماحول بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں، وہیں ان کی کچھ حدیں بھی ہیں جو اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔ اساتذہ اور طالب علم سب کے سب کی مادری زبان بنگلا ہے، اس لیے اردو کے معیاری لب و لہجے تک پہنچنے میں انھیں واضح دشواری پیش آتی ہے۔ درس و تدریس میں استاد اور طالب علم دونوں کو یہ آسان راستہ معلوم ہوتا ہے کہ ذریعۂ تعلیم بالخصوص وضاحت اور تشریح کی زبان بنگلا ہو جائے۔ مطلب یہ کہ آپ کی ذرا سی حد آپ کے لیے ایک دیوار کھڑی کر دیتی ہے کہ آپ اپنے کلاس روم میں مکمل طور پر اس زبان کو ذریعہ نہیں بنا پاتے ہیں جس زبان کی تدریس کے لیے استاد اور طالب علم یکجا ہوئے ہیں۔ یہیں سے ایک چور دروازہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ جب بچّے کو Dissertation یا مختصر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے مواقع فراہم کرتے ہیں یا پی ایچ۔ ڈی۔ کے طلبہ کو ان کے تحقیقی مقالے کے لیے بھی یہ سہولت دے دیتے ہیں کہ وہ اردو یا بنگلا میڈیم میں اپنے مقالے جمع کر سکتے ہیں۔ یاد رکھیے، کسی مضمون کی سب سے بڑی ڈگریوں کو جب آپ تفویض کرتے ہیں تو یہ سوال لازمی طور پر پوچھا جائے گا کہ کیا امیدوار کے پاس وہ صلاحیت کیوں نہیں تھی کہ اپنا مقالہ اسی زبان میں لکھے جس زبان کی وہ ڈگری لینا چاہتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ڈھاکا یونی ورسٹی انگریزی کے مقالے کو بنگلا میں لکھنے کی اجازت دے؟ کیا غیر ملکی زبانوں کے شعبے میں اس بات کے لیے گنجایش ہوگی کہ جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے پرچے یا ان کے تحقیقی مقالے بنگلا میں لکھے جا سکتے ہیں؟ یہ کسی نہ کسی طریقے سے ایک ایسا Escape point ہے جہاں سے ہم ڈھلان کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

دنیا کا سب سے ترقی یافتہ اور طاقت ور ملک امریکا سیکڑوں ملکوں میں اپنے چنندہ شہریوں کو بھیج کر وہاں کی زبان سیکھنے کے لیے اربوں روپے خرچ کرتا ہے۔ مقصدِ خاص یہ ہوتا ہے کہ اس زبان کے علاقے میں رہتے ہوئے سڑک چوراہوں پر اور اس کے ماحول سے فیض پاتے ہوئے آدمی بہ عجلت زبان سیکھ جائے گا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سکھانے والے بھی امریکن اور سیکھنے والے بھی امریکن۔ مگر کیا مجال کہ کلاس روم اور اس کیمپس میں کوئی ایک لفظ انگریزی کا وہ آپس میں بول پائیں۔ یہ مشکل راستہ انھوں نے اپنے سیکھنے کی صلاحیت کو رفتار دینے کے لیے اپنا رکھا ہے۔ یورپ کی متعدد یونی ورسٹیوں میں اردو پڑھانے کے لیے جو انگریز اساتذہ مامور ہیں، تجربہ یہ بتاتا ہے کہ وہ اردو زبان میں ہی اپنی تدریس کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ اگر یہ نہ کریں تو استاد کی حیثیت سے ان کا فرض ادھورا رہ جائے گا۔ وہاں کے مختصر یا مکمل تحقیقی مقالے بھی اردو زبان میں ہی پیش کیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ضرورت کے مطابق ان کے خلاصے انگریزی میں ہزار دو ہزار لفظوں میں شامل کر دیے جاتے ہیں جو حقیقتاً تدریسی نہیں انتظامی ضرورت کے لیے ہوتے ہیں۔ بنگلا دیش کے شعبۂ اردو کو اس چور دروازے کے بند کیے بغیر اپنے طلبہ اور اساتذہ میں اردو زبان کی مہارت کا تصور نہیں کرنا چاہیے۔ خاص طور سے اردو زبان کے تئیں ان میں خود اعتمادی آخر کیسے پیدا ہوگی۔

اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے اور آج کی تاریخ میں دنیا کی دو سو سے زیادہ ممتاز یونی ورسٹیوں میں اردو زبان کی تدریس اور تحقیق کا انتظام ہے۔ ہندستان اور پاکستان تو روایتی خطّے ہیں اور وہاں کی مقامی آبادی ملازمت کے لیے موجود ہے مگر اس سے باہر خلیج کے ملکوں، یورپ، امریکا، افریقہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ میں اردو کے حوالے سے جو آسامیاں ہیں، ان میں کیا بنگلا دیش کے اردو کے طالب علم اپنا حصہ نہیں لے سکتے ہیں؟ مگر لازم یہ ہے کہ

وہ اپنی تقریری اور تحریری استعداد اس سطح تک لے جائیں۔ ہندستان اور پاکستان کی فلم انڈسٹری اور میڈیا کا اتنا بڑا میدان ہے جہاں اردو زبان کے جاننے والوں کے لیے اچھے خاصے مواقع موجود ہیں۔ یہ بات ذہن نشیں رہے کہ بنگلا دیش کے بچے اردو بولنے اور لکھنے کی مہارت کے بعد یہاں مقابلہ آرائی کے لیے میدان میں اتر سکتے ہیں۔ دنیا اتنی چھوٹی ہو چکی ہے کہ ہندستانی انگلینڈ جا کر انگریزی پڑھا دیتا ہے اور عرب میں جا کر عربی کی تدریس دے دیتا ہے۔ شرط مہارت ہے ورنہ اردو پڑھ کر کوئی بنگالی بچہ آخر ہندستان یا پاکستان میں اپنے لیے بہتر روزگار کے ذرائع کی تلاش کیوں کر نہیں کر سکتا ہے؟

شعبۂ اردو، ڈھاکا یونی ورسٹی نے بی۔ اے۔ اور ایم۔اے۔ کے لیے اپنا جو نصابِ تعلیم متعین کیا ہے، وہ اچھا خاصا معیاری ہے۔ کہیں کہیں دقیانوسیت یا روایت سے چمٹے رہنے کا طور بھی ہے مگر بالعموم ایک روشن خیال اور معیاری نصاب بنانے کی کوشش ہوئی ہے۔ دشواری دو سطحوں سے ہے۔ تدریس میں وہ گہرائی کہاں سے تلاش کی جائے گی جس سے وہ بچہ جو ڈھاکا میں پڑھ رہا ہے اور دیوانِ غالب کے صفحات پلٹ رہا ہے، وہ دلی، علی گڑھ، کراچی اور اسلام آباد یا لاہور کے تعلیمی اداروں سے کیوں کر مقابلہ کر پائے گا۔ ڈھاکا یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں اساتذہ کی معیاری تربیت کے بغیر یہ بھاری بھرکم نصاب اپنی تمام تر گہرائی کے ساتھ طلبہ کے دماغ اور دل کا حصہ نہیں بن سکے گا۔ نصابِ تعلیم تو ڈھانچہ ہے، اساتذہ اپنے گہرے علم اور طریقۂ تدریس سے اس میں روح ڈالتے ہیں۔ دشواری یہ ہے کہ غالب کو غالب کی زبان میں نہ پڑھائیں تو غالب کے اشعار کی روح تک کیسے پہنچیں گے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے رابندر ناتھ ٹیگور اور قاضی نذر الاسلام کے ادب کو انگریزی یا اردو یا جرمن زبان میں ہم لاکھ پڑھا لیں، واجبی معلومات تو فراہم کر سکتے ہیں مگر متن کی نزاکتوں کی بحث اور زبان کی

برکات اوراس کی مہارتوں کے امور کس طرح واضح کر پائیں گے؟ اس لیے زبان کی تدریس کے لیے یہ سنہرا اصول ہے کہ اس زبان کے رسمِ خط اوراس زبان کے میڈیم کو لازمی طور پر اپنایا جائے۔ ڈھاکا یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے یہ بڑا چیلنج ہے۔ اگر انھوں نے اپنے طور پر اس کا انتظام کرلیا تو بہت سارے مسائل حل ہوجائیں گے۔ پچھلے زمانے میں شدید رکاوٹیں اس وجہ سے بھی نہیں تھیں کہ ڈھاکا اور راج شاہی دونوں یونی ورسٹیوں میں بیس پچیس برس قبل تک ایسے اساتذہ موجود تھے جن کی مادری زبان اردو تھی۔ بعض ہندستان یا پاکستان میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے اور تحقیق سے فیض یاب ہونے کے مواقع پا چکے تھے۔ وہ اہلِ زبان کی سی مکمل مہارتوں کے بعد میدانِ تدریس میں آئے تھے۔ ایسا ایک یا دو استاد شعبے میں ہو تو تمام اساتذہ دھیرے دھیرے ان مہارتوں کی طرف بڑھتے جاسکتے ہیں اور طالب علم فیض یاب ہوکر زبان کی ان حدود سے ہمیشہ کے لیے دور ہوجاتے ہیں۔ مختلف مضامین میں کسی مخصوص موضوع کے لیے ماہرِ خاص (Specialist) ہوتے ہیں۔ سائنسی علوم کی تو تدریس ہی رک جائے اگر الگ الگ شعبۂ علوم کے ماہرین نہ جمع ہوں۔ بنگلا دیش کے شعبۂ اردو کو اپنے اساتذہ اور طلبہ کی زبان دانی کی سطح بلند کرنی ہے اور انھیں بین الاقوامی معیار تک پہنچنا ہے تو اس کے لیے ایسے ماہرِ زبان کی تلاش کرنی ہوگی جو معیاری اردو کے لب و لہجے کے ساتھ زبان اور ادب کا اتنا گہرا علم رکھتا ہو جس کے سہارے چند مہینوں یا برسوں میں اساتذہ اور طلبہ کی رسمی تربیت ہوجائے اور وہ مادری زبان سے مختلف انداز و اسلوب کے ساتھ اردو پڑھنے، بولتے اور لکھتے پائے جائیں۔

ڈھاکا یونی ورسٹی، شعبۂ اردو نے اپنی ایک صدی کا سفر طے کرلیا۔ فدا علی خان اور عندلیب شادانی سے حسین البناء اور حفصہ اختر تک اساتذہ اور ہنروروں کی ایک پوری قطار

ہے۔ اساتذۂ اردو کی مجموعی تعداد کو پیش نظر رکھیں تو سو سے کم کتابیں ان افراد کی شایع نہیں ہوئی ہوں گی۔ عندلیب شادانی اور شوکت سبزواری تو اردو زبان کی تاریخ میں معتبر حوالہ ہیں۔ بعض اساتذہ اپنے تراجم کی وجہ سے بھی پہچان رکھتے ہیں۔ شعبۂ اردو کے جرنل میں اساتذہ کے جو مضامین شایع ہوئے ہیں یا بین الاقوامی سے می ناروں میں ان کی جو تحریریں پیش ہوئیں، ان سے ہرگز یہ مایوسی نہیں ہوتی کہ وہ برصغیر کے ایک اچھے تعلیمی مرکز کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ بالخصوص ہندستان اور پاکستان کا اردو حلقہ زبان کی پاکی اور لہجے کی سالمیت پر سب سے بڑھ کر یقین رکھتا ہے۔ بنگلا دیش کے اساتذہ اور ان کے ساتھ ساتھ طلبہ کو اس دائرے سے نکلنا ہوگا۔ یہ ایسا بھنور ہے جس میں بنگالی لب و لہجے کی اردو کو ٹھیک اسی طرح قبولِ عام کی عزت نہیں ملے گی جس طرح انگریزی داں اردو سیکھ کر کام چلاؤ انداز میں اردو کے الفاظ اور جملے ادا کرتا ہے۔ شین قاف الگ مسئلہ ہے۔ بنگلا میں تو شین ہی شین ہے۔ اگر اس لہجے سے آزادی حاصل نہ کریں گے تو سراج اورنگ آبادی، ساحر لدھیانوی بھی شاد عظیم آبادی اور آتش لکھنوی کے انداز سے ہی بولے جائیں گے۔ اختتامی آوازوں کا پیش تو الگ سے اہلِ اردو کے صبر کا امتحان لیتا ہوا ملے گا۔ اس لیے شعبۂ اردو، ڈھاکا یونی ورسٹی کو اپنے اساتذہ اور طلبہ کے تلفظ، لب و لہجے اور لسانی مہارتوں کے لیے مشقت کرنی چاہیے۔ اس کے لیے لایق اساتذہ کی تلاش اور زبان اور لب و لہجے کے ماہرین سے تربیت دلانے کا فریضہ اختیار کرنا ہوگا۔

بڑی یونی ورسٹیوں کے شعبے تدریس اور تحقیق کے ساتھ اپنی ضرورتوں کے مطابق درسی مواد کی اشاعت کا کام بھی کرتے ہیں۔ شعبۂ اردو سے دیر سے ہی سہی مگر باضابطہ طور پر ایک تحقیقی جرنل شایع ہوتا ہے۔ حال کے برسوں میں اس کی اشاعت میں باقاعدگی بھی آئی ہے۔ مگر وہ جرنل اساتذہ یا ماہرین کے کام کی چیز تو ہے مگر طلبہ اور اساتذہ یا طلبہ، اساتذہ اور عوام

کے بیچ کوئی پل قایم نہیں ہورہا ہے۔ یہ واضح حد نظر آرہی ہے۔ شعبۂ اردو کو اپنے نصاب کی منتخب چیزوں کے متن کو اور اس متن کے لیے دیگر تدریسی مواد کو شایع کر کے طلبہ کے لیے آسان کرنا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ طالب علم کے لیے وہ ادبی مواد اس کے گھر پر بھی کام آئے گا۔ ایسی چیزوں کو طرح طرح سے ترتیب دینے سے کراساتذہ اور ریسرچ اسکالرس میں ایک علمی تحرک پیدا ہوگا۔ اس سے طالب علم بھی نئے نئے تدریسی مواد کو دیکھ کر نہ صرف یہ کہ اپنے امتحان میں کامیابی حاصل کریں گے بلکہ اردو زبان کے لیے کوئی تنقیدی، تحقیقی یا تدوینی گوشہ تلاش کرنے کی طرف بھی مڑیں گے۔ مستقبل کا مصنف تو انھی کے بیچ سے نکلنا ہے۔ اس لیے اگر پانچ برسوں میں وہ اس انداز کے کتابچے اور طرح طرح کی تدریس سے متعلق کتابیں دیکھیں گے تو شاید اس سے ایک طرف ان کی تعلیم میں پختگی آئے گی اور دوسری طرف انھیں ترغیب ملے گی کہ کس طرح چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کی جاسکتی ہیں۔ شعبۂ اردو کے طلبہ میں موسیقی، رقص، سماجی اشتراک وغیرہ کا شوقِ بے پایاں ہم نے اپنے ہر سفر میں ملاحظہ کیا ہے۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ وہ طالب علم اردو تدریس کا فیض اٹھاتے ہوئے لکھنے پڑھنے سے زیادہ بااعتبار کاموں میں لگ جائے۔ شعبۂ اردو کو تخلیقی ادب کی طرف مائل کرنے کے لیے مواقع پیدا کرنا چاہیے۔ شعری نشستیں اور افسانوی نشستیں بار بار ہونی چاہییں جن میں بنگلا دیش کے مستند لکھنے والے تو شامل ہوں ہی مگر نوجوان مصنفین اور طلبہ میں سے جو اپنی تخلیقات پیش کر سکتے ہوں، انھیں بھی لازمی طور پر شامل کیا جائے۔ سے می ناروں میں بھی ہمارا تجربہ یہ کہتا ہے کہ ہر اجلاس میں کم از کم ایک ریسرچ اسکالر اور ایم۔ اے۔ کے طالب علم کو اپنے مقالے کے ساتھ موقع دیا جانا چاہیے۔ اس سے ان کی عملی تربیت ہوتی ہے اور خود اعتمادی بڑھتی ہے۔ اس کے بعد ہی اس بات کی گنجایش پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ طالب علم بنگلا دیش سے باہر نکل کر اپنی ادبی اور علمی سرگرمیاں پیش کر سکتا ہے۔ اس سے شعبۂ اردو کی ہمہ جہت ترقی ہوگی۔

ڈھاکا یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں ۹/اساتذہ برسرِ کار ہیں۔ یہ تعداد اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ عالمی سطح پر جو سیاسی صورت حال ہے، اس میں بنگلا دیش ہندستان ہی نہیں، خلیج اور یورپ کے ممالک کے لیے ایک حلیف ملک ہے۔ اردو کے حوالے سے آپ کے طالب علم اور اساتذہ صرف وہ معیار حاصل کر لیں تو ہندستان کی تمام یونی ورسٹیوں میں بلائے جاسکتے ہیں۔ اس سے دونوں کے لیے مواقع بڑھیں گے۔ آپ کی مہارتوں میں بھی اضافہ ہوگا۔ ڈھاکا ایک ایسا شہر ہے جو اپنی قدامت اور دنیا بھر سے جڑاؤ کے معاملے میں پسندیدہ شہروں میں سے ایک ہے۔ یہاں ہندستان ہی نہیں یورپ اور خلیج کے ممالک کے افراد بھی خوشی سے تقریبات میں آنا جانا پسند کریں گے۔ اگر شعبۂ اردو، جس کے پاس انفرااسٹرکچر کی کوئی کمی نہیں، اگر وہ اردو کی اپنی مہارتوں کو سنبھال لیتا ہے تو وہ دن دور نہیں کہ ڈھاکا یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو ہندو پاک اور ساری دنیا کے شعبہ ہائے اردو اور اردو عوام کے بیچ ایک پل کا کام کرے گا اور اپنے علمی، ادبی اور انتظامی امتیازات سے ایک عالم کو متاثر کرے گا۔ امن، خیر سگالی اور محبت کے پیغام کے لیے ساری دنیا متلاشی رہتی ہے، کون جانے اردو جیسی زبان کے توسط سے ڈھاکا یونی ورسٹی محبت اور آشتی کا ایک مرکز بن کر آنے والے کل میں اُبھر آئے۔ آمین۔

حواشی:

(۱) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، ۱۹۸۵، صفحہ ۱۷۶

(۲) مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفائے کرام کا کام، ۱۹۸۶ء، صفحہ ۱۰۸

(۳) https://www.du.ac.bd/body/History/UPS

اردو کے فروغ میں بنگلا دیش کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کا کردار

ڈاکٹر محمد محمود الاسلام

Abstract

The discussion of Urdu in Bangladesh dates back to the Mughal period. Various government and non-government organizations are working in Bangladesh to promote Urdu language and literature. There are educational institutions, broadcasters and cultural institutions that are carrying out their activities with great fanfare. Educational institutions include universities, colleges and madrassas which are engaged in teaching, writing, translation, critique and research services in Urdu. The University also publishes an annual Urdu Research Journal. Broadcasting Institution (Urdu service), Dipto TV) Urdu to Bengali Dramatic Translation (are active in propagating and disseminating Urdu language and culture. Biharis living in Bangladesh)refugees from India(whose mother tongue is Urdu take up the Urdu program to spread their culture. Settled in

پروفیسر، شعبہ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلا دیش

different parts of Bangladesh, these people set up institutions under different names to pass on their language and culture to future generations. These institutions include publishing newspapers in Urdu, arranging poetry, narrating the biography of the Prophet in Urdu and giving speeches in Urdu on special occasions.

In addition to this, Khanqah Sharif was established in some places in this land for the propagation of Islamic culture. In his statement, the murshids of Khanqah Sharif draw the hearts of the disciples towards Allah through the verse of Urdu poets. It promotes Urdu language and literature. I will describe in details the aspects mentioned in this article which will benefit the country and the nation.

1800 میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے مغربی بنگال کے شہر کلکتہ کی ادبی اہمیت مسلم ہو چکی تھی اور اردو ادب میں رنگ برنگے پھول کھل اٹھے تھے۔ اس وقت بنگلا دیش کے مختلف اضلاع میں بھی کئی اردو شعرا و ادبا منظر عام پر آئے۔ شاعری کی متعدد اصناف پر ان کے کارنامے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ بنگلا دیش کی جنوبی سرحد چاٹگام سے لیکر شمال میں رنگ پور تک اردو زبان و ادب کا چرچا تھا۔ پایہ تخت ڈھاکا کو سب اضلاع پر برتری حاصل تھی۔ اس زمانے میں اردو اور فارسی زبان شرفا کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ بنگلا دیش کے کئی ضلعوں نے اردو ادب کے خزانے میں انمول کتابوں کا اضافہ کیا۔ اردو کی یہ نثری کتابیں زیادہ تر مذہبی، اخلاقی اور حدیث و فقہ سے متعلق تھیں۔ شاعری میں غزل کے علاوہ مثنوی کی طرف بھی توجہ دی گئی تھی مگر برائے نام۔ بنگلا دیش کے کئی قادر الکلام شعرا آج بھی اردو ادب کی تاریخ میں ممتاز حیثیت

کے حامل ہیں۔

بنگلا زبان کے خطوں میں اردو زبان کا پروان اتنا زوردار تھا کہ اس نے سماج کے اصلی حوائج کو مٹا کر ترقی کرتے ہوئے تعلیمی اداروں میں اپنا قدم جمایا۔ تعلیمی، نشریاتی واشاعتی اور تحقیقی اداروں میں اردو کا چرچا عام ہوگیا۔ سرکاری سطح پر بنگلا دیش کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں، کالجوں، مدارس، اکاڈمی، مرکز اور انسٹی ٹیوٹ میں اردو کا بول بالا ہے۔ سرکاری تعلیمی اداروں میں ڈھاکا یونیورسٹی، راجشاہی یونیورسٹی اور نیشنل یونیورسٹی کے ماتحت مختلف بڑے بڑے کالجوں میں اردو کی تدریس وتحقیق رواں دواں ہیں۔ مختلف سرکاری ادارے جیسے بنگلا اکاڈیمی، ایشیاٹک سوسائٹی، نذرل انسٹی ٹیوٹ، بیشو شاہتیہ کیندر (عالمی ادبی مرکز) میں اردو کے تحقیقی اور سوانح عمری موضوعات پر اوراردو سے بنگلا اور بنگلا سے اردو تراجم کا کام قابل ذکر ہے۔ نشریاتی اداروں میں بنگلا دیش بیتار (ریڈیو بنگلا دیش) اور دیپتو ٹی وی چینل اردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں سرکاری عالیہ مدارس ڈھاکا، سلہٹ اور بگوڑا کی اردو خدمات قابل ستائش ہے۔ غیر سرکاری سطح پر بنگلا دیش کے ہر خطے میں قومی مدارس کی مذہبی تعلیمات میں اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا نصاب میں شامل ہیں۔ بنگلا دیش میں اردو کے فروغ میں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے کردار پر تبصرہ پیش خدمت ہے:

ڈھاکا یونیورسٹی

یہ ایک سرکاری تعلیمی ادارہ ہے جس کی بنیاد جب ہی 1921 میں پڑی تھی اسی وقت سے شعبہ اردو بھی اپنی تدریس وتحقیق کا کام انجام دے رہا ہے۔ ابتدائی مرحلہ میں خان بہادر فدا علی خان شعبے کے صدر تھے۔ عالمی شہرت یافتہ پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور

ڈاکٹر عبد لیب شادانی اسی شعبے سے منسلک تھے۔اس شعبے میں چار سطح پر اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔

کورس کا معینہ وقت:

1۔بی اے آنرز: 4 سال

2۔ایم اے: 1 سال

3۔ایم فیل: 2 سال

4۔پی ایچ ڈی: 3 سال

ہر سال شعبہ اردو کے بی اے آنرز میں 120 طلبہ وطلبات داخلہ لیتے ہیں۔فی الحال شعبے میں کل طلبہ وطلبات 400 سے زائد ہیں۔

شعبہ اردو کے نصاب میں اردو غزل، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، ناول، ڈراما، افسانہ، تنقید، تحقیق، تاریخ، تمثیل، طنز ومزاح، سوانح عمری، صحافت وغیرہ شامل ہیں۔بعض خاص خاص پرچوں نے جیسے لسانیات، علم عروض، اردو پر فارسی وانگریزی کے اثرات، زبانوں کا تقابلی مطالعہ بھی شعبے کے نصاب کو زینت بخشی۔اردو کے مشہور شعرا واد با میں امیر خسرو، ولی دکنی، اردو شاعری کے عہد زرین، غالب، مومن، اردو کے عناصر خمسہ، مولوی عبدالحق، اقبال جوش، پریم چند، کرشن چندر، منٹو، عصمت، فیض، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کو بڑی اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔1

تین مایہ ناز اساتذہ پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ، پروفیسر ڈاکٹر ام سلمی، پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول اسی شعبے سے وابستہ تھے۔ان کی علمی وادبی شہرت عالمی سطح پر مقبول ہے۔اب وہ تینوں مرحوم ہو گئے ہیں۔شعبے میں فی الحال نو اساتذہ پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھوئیاں، پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی، پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل، ڈاکٹر رشید احمد، ڈاکٹر محمد رضا الکریم، جناب غلام مولا، جناب حسین البنا اور محترمہ حفصہ اختر ہیں جو تنقیدی وتحقیقی کاموں

میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ راقم الحروف کی دو اردو تحقیقی کتابیں منظر عام پر آئیں (1) اردو پر مغرب کے اثرات (2) مختلف زبانوں کا باہم تعلق۔

عبدالرحمٰن بیخود نے بنگلا زبان و ادب کی تاریخ کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب ڈھاکا یونیورسٹی نے شائع کی تھی۔

راجشاہی یونیورسٹی

یہ بھی ایک سرکاری تعلیمی ادارہ ہے جو بنگلا دیش کے مغربی علاقہ راجشاہی ڈیویژن میں واقع ہوئی ہے۔ 1953 میں اس یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی گئی اور 1962 میں شعبہ اردو کا قیام عمل میں آیا۔ چار سال کا بی اے آنرز، ایک سال کا ایم اے اور ایم فیل و پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی یہاں سے ملتی ہیں۔ اردو شاعری و نثری کے تمام اصناف سخن کی تعلیم اسی شعبے سے دی جاتی ہے۔ ہر سال شعبے میں بی اے آنرز سال اول میں 40 طلبہ وطلبات داخلہ لیتے ہیں۔ فی الحال شعبے میں کل 240 طلبہ وطلبات تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہیں۔ شعبے میں نو اساتذہ ہیں جو اردو زبان و ادب کی خدمات میں مشغول ہیں۔2

نیشنل یونیورسٹی

یہ ایک سرکاری ادارہ ہے جس کے ماتحت بنگلا دیش کے تمام سرکاری بیچلر اور ماسٹرز کالج انسلاک ہیں۔ نیشنل یونیورسٹی کے کئی بڑے بڑے کالج جیسے راجشاہی گورنمنٹ کالج، کارمیکل کالج رنگپور وغیرہ میں اردو کے اساتذہ موجود ہیں۔ ان کالجوں میں بیچلر ڈگری کے لئے اختیاری موضوع کی حیثیت سے اردو کا امتحان ہوتا ہے۔3

سرکاری مدارس:

بنگلا دیش میں مذہبی تعلیم کے لئے سرکاری مدارس اپنی نوعیت کی حیثیت سے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔قرآن وحدیث کی تفسیر، فقہ، اسلامی تاریخ وغیرہ کی کتابیں اردو میں موجود ہیں ۔ مدرسین چونکہ عربی، فارسی اور اردو زبان سے واقف ہیں اس لئے مذہبی تعلیم کا رجحان بھی اردو کی طرف ہے۔اردو میں تقریر کرنا، قرآن وحدیث کی تفسیر وتشریح اردو کے ذریعہ حل کرنا ان کے لئے آسان ہے۔درس وتدریس میں اردو کا استعمال علمائے کرام باعث فخر سمجھتے ہیں۔ 2015 کی شماری کے مطابق بنگلا دیش میں 9769 سرکاری مدارس ہیں اور جن میں 2900700 طلبہ وطلبات موجود ہیں۔4

بنگلا اکاڈیمی

بنگلا اکاڈیمی سرکاری ادارہ ہے جس کا قیام 1955 میں عمل میں آیا۔ بنگلا زبان وادب کا تحفظ کرنا ہی اس اکاڈیمی کا اصل کام ہے۔اس اکاڈیمی کے اشاعتی کاموں میں لغات، حیات، مقالے، تنقیدی وتحقیقی کام، ناول، افسانہ، شاعری، بچوں کا ادب، تحریک زبان، جنگ آزادی، تاریخ مذہب، ثقافت، فلسفہ، معاشی، تجارت، قانون صحافت، سیاحت اور سائنس وغیرہ کے موضوعات پر کتابوں کی اشاعت شامل ہیں۔ بنگلا نژاد اردو شاعر احسن احمد اشک کی حیات اور کارنامے پر ڈھاکا یونیورسٹی شعبہ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھوئیاں نے "احسن احمد اشک: جیون، کارما وچیتنا (احسن احمد اشک: حیات افعال وافکار) کے موضوع پر اپنے پی ایچ ڈی کا مقالہ بنگلا زبان میں لکھا جسے بنگلا اکاڈیمی نے 2008 میں شائع کیا۔اسی طرح اردو کے مشہور افسانہ نگار پریم چند کا افسانہ "شطرنج کے کھلاڑی" کو معروف ترجمہ نگار ظفر عالم نے بنگلا زبان میں ترجمہ کیا اس کو بنگلا اکاڈیمی نے 1999 میں شائع کیا۔ علاوہ ازیں "اوپو موھادیشیر دنگار گلپو (برصغیر کے فسادات کی کہانی) کے نام سے دوسرا ترجمہ بھی 1912 میں

شائع کیا۔5

1947 کے بعد ڈھاکا یونیورسٹی کے اردو پروفیسر سعد منیر نے تین بنگلا ناولوں اور بنگلا افسانوں کے دو مجموعوں کا اردو ترجمہ کیا۔ ان تینوں ناولوں کے اردو نام "مجھے اعتراف ہے" (1962)، "آسیبی گھر (1963) اور "ماں" ہے۔ اور دونوں افسانوی مجموعوں کے اردو ترجموں کا نام "زینی آپا" اور "مٹی کا سنسار" ہے۔ یہ پانچوں کتابیں بنگلا اکاڈیمی نے شائع کی تھیں۔6

اسلامک فاؤنڈیشن بنگلا دیش

اس سرکاری ادارے کا قیام 1975 میں عمل میں آیا۔ اسلامی تعلیم و تحقیق کی اشاعت ہی اس کا اہم کام ہے۔ اس ادارہ نے برصغیر کے بڑے بڑے علما کی حیات اور اہم اہم اسلامی تحقیقی کتابوں کے ترجمے اردو سے بنگلا زبان میں شائع کئے ہیں۔ ان شخصیتوں میں خواجہ معین الدین چشتی (1982)، حیات شیخ الحدیث مولانا زکریا (2000)، شیخ الاسلام سید حسین احمد مدنی (2008)، سید احمد شہید (1981)، حیات صحابہ (1986)، شاہ ولی اللہ و افکار (2004) اور تفسیر معارف القرآن وغیرہ کی اشارت قابل ذکر ہے۔7

نذرل انسٹی ٹیوٹ

نذرل کی یادیں، حیات، ادب، سنگیت، ان پر تحقیقی کام کا تحفظ، اشاعت وغیرہ کے لئے 1985 میں جمہوریہ حکومت بنگلا دیش نے اس ادارے کو قائم کیا۔ "نذرالاسلام: حیات اور کارنامے" کے نام سے ڈھاکا یونیورسٹی شعبہ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ نے ایک کتاب لکھی جو 2006 میں منظر عام پر آئی۔

2006 میں نذرل انسٹی ٹیوٹ ڈھاکا نے "آتش وگل" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے۔ جسے ڈھاکا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول نے 2005 میں مرتب کی تھی۔ اس کتاب میں نذرالاسلام کی نظموں، افسانوں، ناول اور ڈراما کے اردو ترجمے شامل ہیں۔ ترجمہ نگاروں کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ نذرل کی تخلیقات نے اردو کے بڑے بڑے شاعروں، ادیبوں اور ناقدوں کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ ان ترجمہ نگاروں میں اختر حسین رائے پوری، سلیم اللہ فہمی، احسن احمد اشک، یونس احمر اور عبدالرحمٰن بیخود کے علاوہ دوسرے نام ملتے ہیں ان میں افسر ماہ پوری، ڈاکٹر عبداللہ، ثناالحق حقی، ذوالفقار علی بخاری، احمد سعدی، غلام سرور فگار، الیاس عشقی، خلیل احمد، لطیف الرحمٰن اور رفیع احمد فدائی شامل ہیں۔8

احمد سعدی نے قاضی نذرالاسلام کی بہت ساری نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے جنہیں سعدی کی وفات کے بعد 2006 میں نذرل انسٹی ٹیوٹ نے "نذرالاسلام کی نظمیں اور گیت" کے نام سے شائع کی ہے۔9

بنگلا دیش بیتار

بنگلا دیش بیتار بنگلا دیش کا واحد سرکاری ریڈیو اور نشریاتی ادارہ ہے جہاں سے اردو پروگرام نشر ہوتا ہے۔ غیر منقسم بنگال کے اس خطے میں ریڈیو کا قیام برطانوی دور حکومت میں سن 1939 میں عمل میں آیا۔ اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے ڈھاکا اسٹیشن سے بنگلا کے علاوہ اردو میں بھی نشر کیا جاتا تھا۔

سن 1947 میں تقسیم ہند کے بعد اس خطے کا نام مشرقی پاکستان پڑا۔ سرکاری زبان چونکہ اردو تھی لہذا ہر سطح پر اردو کو فوقیت حاصل رہی۔ بنگلا دیش بیتار اس دور میں ریڈیو پاکستان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس دور میں صوبائی اکثریتی زبان بنگلا کے ساتھ ساتھ زیادہ تر پروگرام اردو

ہی میں نشر کئے جاتے تھے۔

پھر سن 1971 میں بنگلا دیش کی آزادی اور خود مختاری کے لئے مسلح جدو جہد کا آغاز ہوا۔ 25 مارچ 1971 سے شادھین بنگلا بیتار کیندر (آزاد بنگلا ریڈیو سنٹر) نے اپنی نشریاتی سرگرمیاں شروع کیں۔ اس ریڈیو اسٹیشن کو بنگلا دیش کے جنگ آزادی کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسے جنگ آزادی کے ایک سیکٹر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ پہلے اگرتلہ پھر کلکتہ سے شادھین بنگلا بیتار کیندر کے پروگرام نشر کئے جاتے تھے۔ اس وقت بنگلا اور انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی پروگرام نشر کیا جاتا تھا۔ اردو پروگرام کے انچارج اس وقت زاہد صدیقی تھے۔

اس کے بعد 16 دسمبر 1971 میں بنگلا آزاد ہوا۔ شادھین بنگلا بیتار کیندر بنگلا دیش بیتار کے نام سے وزارت اطلاعات کے تحت اپنے نشریاتی فرائض انجام دینے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ ایک مخصوص اور ایک علیحدہ یونٹ کے طور پر بنگلا دیش بیتار کے بیرونی سروس کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں بھی اردو کو فوقیت حاصل رہی۔ یہاں سے روزانہ بنگلا دیش وقت کے مطابق رات آٹھ بجے اردو پروگرام کا آغاز ہوتا ہے۔

بنگلا دیش بیتار کی بیرونی نشریات سے روزانہ نصف گھنٹے کا پروگرام نشر ہوتا ہے۔ پروگرام ہر شب رات آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک جاری رہتا ہے۔ پروگرام میں ملک و بیرون ملک کی تازہ ترین خبریں شامل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ خبروں پر تبصرہ نشر کیا جاتا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی خاص دنوں کے موقع پر خصوصی مقالہ اس دن کی اہمیت کے تناظر میں نشر کیا جاتا ہے۔ قومی اخباروں کی رائے، کھیلوں کا جائزہ، اقتصادی جائزہ، خصوصی دیباچہ، سیر و سیاحت سے متعلق پروگرام سیر و سیاحت، محفل مشاعرہ، محفل سماع، ادبی خبریں، انٹرویو، مختلف دیسی بدیسی نغموں کے پروگرام فہرست میں شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سامعین کے خطوط کے جواب کے ساتھ ایک مخصوص پروگرام ہفتہ میں ایک روز نشر ہوتا ہے۔

فی الوقت محمد عنایت اللہ صدیقی اسٹاف ارٹسٹ اردو سروس کے انچارج ہیں۔ اردو سروس کے دیگر فنکار اراکین ہیں: عابد حسین، محمد اشرف الحق بابو، نور النبی، فرحانہ اختر، محمد حسن، احسان المالکی، مہر النسا، محمد شہاب الدین، نجمہ پروین۔10

بیشو ساہتیہ کیندر

بیشو ساہتیہ کیندر (عالمی ادبی مرکز) غیر سرکاری ادارہ ہے جس کا قیام 1978 میں عمل میں آیا۔ اس کا اصل مقصد ادب کے بارے میں بیداری اور ادب کے ذریعے روشن خیال انسان بنانا ہے۔ اس ادارے سے مختلف موضوعات پر ملکی کتابیں چھپی جاتی ہیں۔ غیر ملکی کتابوں کے ترجمے بھی چھپے جاتے ہیں۔ اقبال کی نظمیں شکوہ و جواب شکوہ کا بنگلا ترجمہ غلام مصطفی نے کیا ہے جو بنگالیوں میں بے حد مقبول ہے۔ علاوہ ازیں سریسٹو اردو گلپو (بہترین اردو افسانہ) کے نام سے جلد اول اور جلد دوم شہید العالم کی ادارت میں اور جلد سوم، جلد چہارم اور جلد پنجم زاہد حسن کی ادارت میں اسی ادارے سے شائع ہوئی ہیں۔11

قومی مدارس

بنگلا دیش میں غیر سرکاری قومی مدارس جو درس نظامی مدارس کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ یہ مدارس بنگلا دیش کے ہر خطے میں موجود ہیں۔ دورہ حدیث کے سطح پر ان مدارس کی تعداد 14000 ہزار سے زائد ہیں جہاں کم از کم 4000000 سے زائد طلبہ وطالبات دینی علم حاصل کر رہے ہیں۔ یہاں کی درس و تدریس میں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ وغیرہ کا ترجمہ و تشریح اردو کے ذریعے ہوتی ہے۔ اردو کی ابتدائی کتابیں نصاب میں شامل ہیں۔ 12

بنگلا۔اردوساہتیہ فاؤنڈیشن

2007 میں اردوشعروادب سے تعلق رکھنے والے شمیم زمانوی، اشرف الحق بابو، جلال عظیم آبادی، صابرعلی صابراورمحمد حسن کے ساتھ اردوشعروادب سے محبت رکھنے والے نوجوان خالد حسین، نورالاسلام، عنایت اللہ صدیقی اور شبانہ نوید نے بنگالی شاعراور دانشوراسد چودھری کی سربراہی میں بنگلا اردو فورم کے نام سے ایک غیرسرکاری انجمن کی داغ بیل ڈالی۔ بعد میں اس ادارے کا نام بنگلا۔اردوساہتیہ فاؤنڈیشن رکھا گیا۔اس ادارے نے اپنے قیام سے لیکراب تک کئی اہم ادبی تقریبات منعقد کی ہیں اور کئی اردوکتابیں اور کتابچہ بھی شائع کئے ہیں۔ ادبی تقریبات کا تعلق بنگلا شاعرشمس الرحمن، اردوشاعرنوشادنوری، دانشورڈاکٹرسید یوسف حسن اور عالمی شہرت یافتہ شاعرفیض احمدفیض سے تھا۔اس عرصے میں فاؤنڈیشن نے نوشادنوری، ڈاکٹرسید یوسف حسن اورنعیم بازیدپوری کی سوانح اور کارناموں پر اردو۔بنگلا زبانوں میں کتابچے شائع کئے۔ان کے علاوہ اس فاؤنڈیشن نے احمدالیاس کا دوسرا شعری مجموعہ "حرف دریدہ" اورانگریزی میں بنگلادیش کے اردوشاعروں کا ایک مختصرخاکہ بھی شائع کیاہے۔اس ادارے سے یہاں کے نوجوان اورنئی نسل کے اردوادیبوں اورشاعروں کو بڑی توقعات ہیں۔جنوری 2014 میں اس ادارے کے سرگرم معتمداعلیٰ سیدفیاض حسین کے انتقال کے بعد یہ ادارے نئے سرے سے اپنے آپ کوسرگرم بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

13

:(LSDC)Literature and Social Development Centre

ایل،ایس،ڈی،سی،کا قیام یکم جنوری 2007 سے عمل میں آیا جس کے بانی اورسکریٹری محمد عنایت اللہ صدیقی اورصدر پروفیسرڈاکٹرشریف علی چودھری ہیں۔یہ بنگلادیش کا ایک رجسٹر غیرسرکاری فلاحی اورادبی ادارہ ہے جوفلاحی کاموں کے علاوہ بنگلادیش میں اردوزبان وادب

کی بقا کے لئے مسلسل کام کر رہا ہے۔ اپنے قیام کے بعد سے اب تک بنگلا دیش میں اردو زبان وادب کی بقا کے لئے اس ادارے نے کئی تاریخ ساز اقدامات اٹھائے ہیں۔ بنگلا دیش میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے جس نے حصول آزادی کے بعد غیر سرکاری سطح پر اردو کورس کو روشناس کرایا ہے۔ اردو کورس کا افتتاح بنگلا ادب کے مشہور ومعروف شاعر اور ادیب اسد چودھری نے کیا تھا۔ افتتاحی تقریب میں دیگر لوگوں کے علاوہ قاضی روزی ایم پی، ڈھاکا یونیورسٹی کی پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، مرحومہ پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول، بنگلا دیش بیتار کے ڈی ڈی جی زاہد الحق وغیرہ موجود تھے۔ یہاں سے اب تک 55 لوگ اردو کا سہ ماہی کورس کامیابی کے ساتھ مکمل کر چکے ہیں۔ کورس مکمل کرنے والوں کو سند فراہم کیا جاتا ہے۔ اردو اور ہندی سیکھ کر ہمارے طلبہ بنگلا دیش بیتار کی بیرونی نشریات کے اردو اور ہندی سروسوں میں کام کرنے کے علاوہ مختلف اخباروں میں ترجمہ نگاری کر رہے ہیں۔

ایل، ایس، ڈی، سی، بنگلا دیش میں کیمپوں میں مقیم اردو داں بنگلا دیشیوں کو تعلیم فراہم کرنے والے مختلف غیر سرکاری اداروں کو اردو تعلیم کی فراہمی کے حوالے سے تکنیکی اور دیگر تعاون بھی فراہم کرتا ہے۔ ایل، ایس، ڈی، سی، کے پہل قدمی سے متاثر ہو کر آج بنگلا دیش میں اور کئی غیر سرکاری اپنے اسکولوں میں اردو داں بچوں کو اردو کی تعلیم کی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

ایل، ایس، ڈی، سی، بنگلا دیش میں اپنی نوعیت کا پہلا غیر سرکاری ادارہ ہے جس نے ڈھاکا یونیورسٹی شعبہ اردو کے ساتھ مشترکہ طور پر بنگلا دیش میں پہلی مرتبہ بین الاقوامی مشاعرہ کا اہتمام کیا۔ مشاعرے میں ڈھاکا یونیورسٹی کے وائس چانسلر عارفین صدیق، قاضی روزی ایم پی، اسد چودھری، مفید الحق، زاہد الحق، جاتیو کویتا پریشد کے سکریٹری جنرل اسلم ثانی وغیرہ موجود تھے۔ ایل، ایس، ڈی، سی، سے سالانہ اردو جرنل نکالنے کے بارے میں مجلس عاملہ کی منظوری حاصل ہوئی۔ جرنل کا نام "ایل، ایس، ڈی، سی جرنل آف اردو" ہوگا۔ اس کے علاوہ

ادبی نشستیں، بیرونی ممالک سے آنے والی اہم ہستیوں کی شان میں استقبالیہ کا پروگرام، مشاعرہ وغیرہ ہوتا ہی رہتا ہے۔

حلقہ اہل قلم

چاٹگام میں اس ادارے کے بانی اصغر راہی تھے۔ ڈھاکا میں بنگلا دیش پریشد (سابق مشرقی پاکستان کونسل) کی عمارت میں حلقہ اہل قلم نے کل بنگلا دیش مشاعرے کا انعقاد کیا۔ بنگلا دیش پریشد میں یہ اردو کی پہلی اور آخری ادبی تقریب تھی۔ ڈھاکا کے علاوہ حلقہ اہل قلم نے چاٹگام میں یوم غالب اور نذرل کی تقریبات بھی منعقد کیں۔ اور کل بنگلا دیش مشاعرہ بھی منعقد کیا۔ اصغر راہی نے اردو رسالہ "ماحول" کا ایک شمارہ بھی نکالا۔ 1991 میں اصغر راہی کا انتقال ہوا جس کے بعد حلقہ اہل قلم کا ادارہ بھی ختم ہوگیا۔15

بنگلا۔اردو سوسائٹی

نوے کی آخری دہائی میں بنگالی نژاد اردو نواز مجیب الرحمٰن نے چاٹگام میں بنگلا۔اردو سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن بنائی۔ جس کے سکریٹری چاٹگام کے مشہور بنگالی نژاد اردو شاعر اسماعیل ہلالی کے صاحبزادے ہلال ہمایون منتخب ہوئے۔ مجیب الرحمٰن اس سے قبل چاٹگام میں حلقہ فکر و دانش کے سرپرست رہ چکے تھے۔ اردو زبان و ادب سے محبت کے سبب انہوں نے یہ سوسائٹی بنائی۔ جس کے تحت یوم اقبال کی سالانہ تقریب منائی جاتی ہے۔16

شمس الحق فاؤنڈیشن، سید پور

اس ادارے کے بانی اور چیئر مین محمد اشرف الحق بابو ہیں۔ 1998 کی جولائی کو اس کی بنیاد رکھی گئی، سید پور پوروسبھا کے کمشنر جناب محمد شمس الحق کے انتقال کے بعد ان کی نسبت سے اس

ادارے کا قیام عمل میں آیا۔

ادارے کی کارروائیاں:

1۔ادبی اور سماجی کاموں میں منسلک رہنا۔

2۔ادبی کاموں میں ایک ادبی ششماہی رسالہ "ہمارا ادب" سلسلہ وار شائع ہو رہا ہے۔ ششماہی "پیغام" بھی زیر شائع ہے۔ محفل مشاعرہ اور دیگر ادبی کاموں کو بھی انجام دیا جاتا ہے۔

3 کیمپ میں بسنے والے پریشان حال بچوں کو مفت ابتدائی تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔

4۔غریب اور پریشان حال نوجوان لڑکے لڑکیوں کو مفت کمپیوٹر کی ٹریننگ اور سلائی کی ٹریننگ دی جارہی ہے۔

5۔اردو والوں کے حق میں مختلف روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں میں مقالے لکھے جارہے ہیں۔

6۔مشہور انگریزی کتاب "بہاری دی انڈین ایمی گریس ان بنگلا دیش" کی اشاعت ایک اہم کام ہے

7۔ بنگلا دیش کی مختلف تحریکوں میں اردو زبان والوں کی شراکت یا کارکردگی پر مبنی بنگلا رسالہ "بنگلا دیسیر اندولن سنگرامے اردو بھاسیدیر بھومیکا" شائع کر کے بنگالی عوام کے درمیان تقسیم کر کے بہاریوں سے متعلق گمراہ خیالوں کو دور کرنے کی بڑی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے مصنف ہیں محمد اشرف الحق بابو ہیں۔17

بزم اقبال

2004 میں اس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانی اور صدر کا نام شکیل میر پوری ہے۔ سید پور

میں مشاعرے کا اہتمام گاہے گاہے کیا جاتا ہے۔کوئی ادبی تخلیق فی الوقت نہیں ہے۔ایک رسالہ "ترجمان" کے نام کا شائع ہوا تھا۔لیکن وہ اب شائع نہیں ہو رہا ہے۔18

بنگلا۔اردو ساہتیہ فارم

کوبی اسد چودھری کو صدر اور محمد اشرف الحق بابو کو سکریٹری کی حیثیت سے منتخب کر کے 2007 میں اس ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ابتدائی دور میں اس ادارے نے "آواز" کے نام سے دو تین رسالہ شائع کیا۔یہ ادارہ بعد میں بنگلا۔اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن کے نام سے منسوب ہو گیا اور اب اس کے صدر کوبی اسد چودھری ہیں۔اس ادارے کی جانب سے احمد الیاس کے کئی مجموعوں کی اشاعت کی گئی ہے۔پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی تخلیق "بنگلا دیش میں اردو" اور "عندلیب شادانی کے غیر مطبوعہ شعری مجموعے" کی اشاعت کی ہے۔مشاعروں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔19

OBAT

ابیٹ ہیلپ یہ ایک امریکی ادارہ ہے جس کے بانی انوار اکمل خان ہیں۔کیمپوں میں رہنے والے اور اردو بولنے والے بچوں کو ابتدائی تعلیم انگریزی بھارسون میں دی جا رہی ہے۔غریب اور نادروں میں امدادی سامان تقسیم کی جاتی ہے۔درجہ ششم کی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔گاہے گاہے مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔کوئی تخلیقی کام فی الوقت نہیں ہے۔20

:FOH

یہ (فرینڈس آف ہیومانیٹی) ایک امریکی ادارہ ہے جس کے بانی احتشام ارشد نظامی ہیں۔کیمپ میں رہنے والے غریب بچوں کو ابتدائی تعلیم اور درجہ پنجم تک انگریزی بھارسون میں تعلیم کا اہتمام کیا گیا ہے۔اردو کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو رہا ہے۔21

الفلاح بنگلا دیش

اس ادارے کا قیام 1980 میں عمل میں آیا۔ احمد الیاس اس کے ڈئرکٹر کی حیثیت سے وقت قیام سے اب تک کام کر رہے ہیں۔ کیمپ میں رہنے والے اردو بولنے والے بچوں کو ابتدائی تعلیم اور وظیفے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ تخلیقی کاموں میں احمد الیاس صاحب کی نجی تخلیق کو اس ادارے سے منسلک کیا جاتا ہے۔22

حوالہ جات

1۔شعبۂ اردو کے نصاب سے ماخوذ

2۔ڈاکٹر نصیر الدین، چیئر مین، شعبہ اردو، راجشاہی یونیورسٹی سے گفتگو

3۔محمد امین الاسلام، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، راجشاہی کالج سے گفتگو

4۔حسین البنا، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو ڈھاکا یونیورسٹی اور منسلک سرکاری مدارس سے گفتگو

5۔https://:banglaacademy.org.bd

6۔احمد الیاس، بنگلا دیش میں اردو، انیما ڈھاکا، 2014، صفحہ 165

7۔www.islamicfoundation.gov.bd

8۔احمد الیاس، بنگلا دیش میں اردو، صفحہ 167

9۔ایضا، صفحہ 168

10۔عنایت اللہ صدیقی، آرٹسٹ بنگلا دیش بیتار سے گفتگو

11۔www.bskbd.org

12۔حسین البنا، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو ڈھاکا یونیورسٹی اور منسلک سرکاری مدارس سے گفتگو

13۔اشرف الحق بابو، رکن بنگلا۔اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن سے گفتگو

14۔عنایت اللہ صدیقی، بانی اور سکریٹری LSDC سے گفتگو

15۔اشرف الحق بابو سے گفتگو

16۔ایضا

17۔اشرف الحق بابو، بانی اور چیئرمین، شمس الحق فاؤنڈیشن سے گفتگو

18۔ایضا

19۔ایضا

20۔جلال عظیم آبادی، مدیر 'ادب' سے گفتگو

21۔ایضا

22۔احمد الیاس، ڈائرکٹر، الفلاح بنگلا دیش سیگفتگو

اردو شاعری میں بنگلہ دیش کی جنگ آزادی

ڈاکٹر ا.ن.م احسان المالکی

Abstract

Freedom is a human right. Without freedom there is neither life not happiness. The independence of a country depends mainly on the success of the war of independence. Many elements played a key role in the success of Bangladesh's in 1971 war of independence. Among them, the literary works of poets and writers are unforgettable. Apart from the poets and writers of Bengali literature, in the 1971 War of Independence, the Urdu-speaking community living here also made significant efforts to unite the people for the War of Independence through their literary works. Among these famous poets and writers Noashad Noori, Ahmed Ilyas, Faiz Ahmed Faiz, Habib Ahmed Jalib, Kaifi Azmi, Salik Lucknow are the most prominent as well as noticeable.

محقق، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

جنگ آزادی کا آغاز ۲۶/ مارچ ۱۹۷۱ء میں ہوا جو بنگلہ دیش کی تاریخ کا سب سے نمایاں واقعہ ہے۔ سرکاری عہدیداروں، ملازموں، سیاسی کارکنوں، طلباء، مزدوروں، کسانوں، پیشہ وروں، فنکاروں اور تمام طبقے کے لوگوں نے حملہ آور قوتوں سے ملک کو آزاد کرانے کے لئے جان کی بازی لگادی۔ پاک فوج کے حملوں اور نسل کشی کا مقابلہ کرنے کے لئے اس وقت مضبوط انسانی مزاحمت تیار کی۔ مسلح جدوجہد کے علاوہ جنگ آزادی کو تخلیقی صلاحیتوں جیسے نظم، گیت، ڈراموں سے بھی متحرک بنایا گیا ہے۔ ہمارے کچھ شعراء اس میں شامل ہوئے۔ آزادی پسند مجاہد اور عام لوگ بھی ان نظموں سے بے حد متاثر ہوئے۔

اردو ادب کے دوسرے شاخوں کی طرح اردو شاعری میں بھی سن ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے دوران یہاں کے عوام کے احساسات، جوش وخروش، ہزاروں دلوں کی چیخیں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس وقت بنگلہ دیش کے بنگالی شاعروں کی شاعری میں بنگلہ دیش کے وجود کا سرخ سبز پرچم لہرا رہا تھا۔ بنگلہ دیش کی آزادی کا خواب استقلال کا یقین اور اعتماد تقریباً تمام شعراء کے اشعار میں مختلف طور پر اظہار ہو رہے تھے۔ برصغیر خصوصاً بنگلہ دیش کے اردو شعرا میں نوشاد نوری، احمد الیاس، فیض احمد فیض، حبیب احمد جالب، کیفی اعظمی، سالک لکھنوی وغیرہ کی اردو شاعری میں بنگلا دیش کی جنگ آزادی کا جذبہ نمایاں ہے۔

☆ نوشاد نوری

نوشاد نوری بنگلہ دیش میں مقیم اردو کے ان چند نامور شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ۱۹۷۱ء میں بنگلا دیش کی جنگ آزادی میں اپنی شعر وشاعری کے ذریعے اہم کردار ادا کیا ہے۔ نوشاد نوری ۱۲/ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کے صوبہ بہار میں پیدا ہوئے تھے۔

نوشادنوری کا پورا نام سید محمد مصطفےٰ معصوم ہاشمی تھا لیکن دنیائے شعروادب اور صحافت میں وہ نوشادنوری کے نام سے جانے پہچانے گئے۔ نوشاد نے ۱۹۴۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد بی. این. کالج پٹنہ سے بی. اے کا امتحان پاس کیا شعر گوئی کا سلسلہ ۱۹۴۵ء ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ وہ جب ہندوستان سے ۱۹۶۰ میں ڈھاکا آئے تھے تو ان کے تخلیقی اثاثے میں 'بھکاری' جیسی نظم شامل تھی جو اس وقت ہندوستان میں ان کی جلاوطنی کے بعد اور پاکستان میں قیام کے بعد ان کی مقبولیت کا سبب بنی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں نوشادنوری نے 'جریدہ' نام سے ایک اردو ادبی رسالہ شائع کیا۔ یہ آزادی خواہ نوجوان بنگالی شاعروں اور ادیبوں کی تحریروں کے اردو ترجمہ کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ اس رسالہ کی ان کی ایک نظم کا عنوان ''تیری نجات میری نجات چھے نکات چھے نکات'' ہے۔

ترک وطن کے بعد نوشاد نے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۱ء تک قومی اور بین الاقوامی سیاسی پس منظر پر کئی تاریخی نظمیں کہیں ہیں جن میں باون کی لسانی تحریک کے موضوع پر 'موہن جوداڑو' جیسی نظم بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ۲۶/ مارچ ۱۹۷۱ء کے موضوع پر کہی جانے والی نظم 'لہو میں شرابور دن' ہے یہ شاید ۲۴ سالہ پاکستانی دور (۱۹۴۷ء۔۱۹۷۱ء) کی آخری اردو نظم ہے۔ نوشاد کے دو شعری مجموعے 'رہ ورسم آشنائی' اور 'روزن دیوار' قیام بنگلہ دیش کے بعد کلکتہ اور ڈھاکا سے شائع ہوئے۔ آخری شعری مجموعہ ان کی وفات کے بعد جولائی ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔ بنگلہ دیش میں ۱۹۵۲ء کی لسانی تحریک سے لے کر ۱۹۷۱ء کی جنگ آزادی کے اختتام تک کے زمانے کو نوشاد نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ۱۹۷۱ء میں جب ۲۵/ مارچ کی رات پاکستانی فوج نے اپنے ہی عوام کے خلاف غیر ملکی حملہ وروں کی طرح فوجی کارروائی شروع کی تو اس کے نتائج کو محسوس کرتے ہوئے نوشاد نے کہا:

اب دل آزار ہے ڈھاکے میں کراچی کا خیال
اب بہت دور ہے کاغان سے رانگا ماٹی
اب کوئی چارہ نہیں قطع محبت کے سوا
اب کوئی راہ نہیں جنگ مسلح کے بغیر
اب کوئی ربط نہیں، جذبہ نفرت کے سوا (۱)

نوشاد نے پاکستانی فوجی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے ۱۹۷۱ء میں ''مسلح فوجی'' کے نام ایک نظم لکھی تھی۔ اس میں اندھی پاکستان ریاست کے سیاسی اور فوجی نقطہ نظر کو واضع کیا ہے:

اندھے بھی آپ کی نظر میں نہیں آتے ہیں
لاشیں اب دیواریں بنا رہی ہیں (۲)

۱۹۷۱ء میں جب بنگلہ دیش آزاد ہوا تو یہاں اردو شاعری دوبارہ اسی مقام پر لوٹ گئی جہاں سے ۱۹۴۷ء میں اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ یہ سماجی انتشار اور قدروں کی پامالی کا دور تھا۔ اردو بولنے والوں کی اپنی شناخت چھن گئی تھی اور اس زمین سے ان کا رشتہ سب سے بڑا سماجی اور سیاسی مسئلہ بن گیا تھا۔ اس موقع پر نوشاد نے نظم 'قبلۂ اول' لکھی:

یہی مٹی جو مرا پاؤں دھرے بیٹھی ہے
اس پہ سجدے کی دل آویز گھڑی آپہونچی (۳)

نوشاد نوری نے ۱۵/ اگست ۱۹۷۵ء میں بابائے قوم بنگو بندھو شیخ مجیب الرحمٰن کی شہادت نظم 'انتھان اتسا' لکھی۔:

وہ وہاں ہے وہ، وہاں ہے
وہ وہاں ہمیشہ موجود ہوتا ہے، ایک ناقابل شکست قوت بن جاتا ہے
وہ وہاں ہے، وہ وہاں ہے
وہ لافانی ہے، لافانی وہ ہے، اس کی کوئی موت نہیں ہے۔

نوشاد نوری نے ۱۷/ اگست ۱۹۷۵ء میں ٹنگی پارہ میں بابائے قوم بنگو بندھو شیخ مجیب الرحمٰن کی تدفین کے بعد 'ٹنگی پارہ' کے نام سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں لکھتے ہیں:

تمہیں پتا ہے؟ تمہیں پتا ہے؟
سفر کا آغاز یہاں سے ہوا،
راستہ کھوئے، افسوس، وہ بھی یہاں ہے [ترجمہ: اسد چودھری (۴)

اپنی آخری عمر میں وہ کینسر کے مرض میں مبتلا رہے اور ۷۵ سال کی عمر میں ۱۸/ جولائی ۲۰۰۰ء میں ڈھاکے میں انتقال کیا۔

☆ احمد الیاس

احمد الیاس ۲۶/ جنوری ۱۹۳۴ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے بعد انہوں نے اپنی ماں کو کھو دیا۔ اور کچھ سال کے بعد والد بھی سڑک کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد وہ ۱۹۵۳ء میں ہمیشہ کیلئے بنگلہ دیش میں چلے آئے اور ڈھاکہ میں قیام پزیر ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں لسانی تحریک نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس وقت وہ ڈھاکہ پریس کلب کے ممبر تھے۔ ۲۱/ فروری ۱۹۵۲ء کے فورا بعد لسانی تحریک کی حمایت میں احمد الیاس کی لکھی ہوئی کئی نظمیں ملتی ہیں۔ جیسا کہ آگے مذکور ہے اردو کے ایک اور شاعر

ان کے دوست نوشاد نوری کے ساتھ انہوں نے چھ نکات کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا۔ ۱۹۶۴ میں انہوں نے اردو زبان کا اخبار پاسبان میں شمولیت اختیار کی۔ بعد میں فیض احمد فیض کے ہفتہ وار اردو اخبار' رائل ان بہار' ڈھاکہ میں نامہ نگار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۰ء میں اس اخبار کے ادارتی بورڈ میں شامل ہوئے۔اس وقت تک وہ ایک صحافی اور ترقیاتی کارکن بن چکے تھے۔اب تک ان کے اردو شاعری کے چھ مجموعے ڈھاکہ سے شائع ہو چکے ہیں۔احمد الیاس نے مشرقی بنگال میں پاکستانی فوجیوں کی مچائی تباہی کے مشاہدہ کے بعد ایک نظم لکھی۔اس نظم کا نام' کال بیساکھی' ہے:

میں جانتا ہوں، پھر بھی میں جانتا ہوں
کالا طوفان، یہ کالا لشکر
دونوں کی تقدیر شکست ہے
میں جانتا ہوں، پھر بھی میں جانتا ہوں
جس کمرے میں چراغ بجھا ہوا ہے
سورج وہاں طلوع ہوگا۔ (۵)

یہ سوچنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ ایک شاعر ہمیشہ غم کا غلام رہے گا۔انہوں نے ایک بار رابندر ناتھ ٹیگور کے گیت: 'آلو امر آلو او گو الوئے بھوبن برا' کی طرح پر یوں کہا:

روشنی تیرے لیئے میرے لیئے۔روشنی دن کیلے، شب کے لیئے
بینڈ اخوں کے لیئے، کھولتی ہوئے لوب کے لیئے۔روشنی سب کے لیے(۶)

بنگلا دیش کی جنگ آزادی میں انہیں حقیقی معنوں عملی طور پر کوئی کردار ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن چونکہ وہ ہمیشہ ترقی پسند سیاست میں شامل رہے۔معاشرہ کے بیدار مغز اور استقلال

پسند فرد کی حیثیت سے انسانی حقوق کے حصول کے لئے وہ جہاں تھے وہیں سے جدوجہد کرتے رہے اور بالواسطہ بنگلادیش ریاست کی تشکیل میں شرکت کی۔

☆ فیض احمد فیض:

فیض ۱۳/فروری ۱۹۱۱ء کو کالا قادر، ضلع نارووال، پنجاب، برطانوی ہند میں ایک معزز سیالکوٹی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سلطان محمد خان ایک علم پسند شخص تھے۔ والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ ۱۹۲۱ء میں سکاچ مشن اسکول، سیالکوٹ میں داخلہ لیا اور یہاں میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اسی کالج سے ایف اے پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں انہوں نے گورنمنٹ کالج، لاہور سے عربی میں بی اے اور ۱۹۳۲ میں انگریزی میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ بعدازاں ۱۹۳۴ء اورینٹل کالج، لاہور سے عربی میں بھی ایم اے کیا اور عملی اور ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ اسی دوران یعنی ۱۹۳۰ء میں ایک انگریز خاتون ایلس فیض سے شادی کر لی۔

۱۹۳۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں انگریزی و برطانوی ادب کے لیکچرر کی حیثیت سے انہون نے ملازمت شروع کی۔ ۱۹۴۲ میں فوج میں کپٹین کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ آخر لیفٹیننٹ کرنل ہوکر ۱۹۴۷ء میں پہلی کشمیر جنگ کے بعد آپ فوج سے مستعفی ہوکر لاہور آ گئے۔ فوج اور سرکاری ملازمت سے وابستگی کے علاوہ فیض زبان وادب سے بھی مسلسل وابستہ رہے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۵ء کے دوران انہوں نے پاکستان ٹائمز، اردو روزنامہ: امروز: امروز، ماہنامہ: ادب لطیف، ہفتہ روزہ اخبار: لیل ونہار کی ادارت کی۔

ترقی پسند شاعر فیض غزل اور نظم دونوں اصناف میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انقلابی نظریات اور حق باب کہنے پر انہیں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھانی پڑیں۔ فیض کی بیشتر شاعری کا

مرکز ومحور انقلاب یا سوشلزم کا قیام ہے، اس لحاظ سے ان کو انقلابی شاعر بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ فیض کے دل و دماغ پر اس وقت قیامت گزر گئی جب انہیں 'غدار وطن' کا قرار دیا گیا اور ان پر وطن دشمنی کے الزامات لگائے گئے۔ ان ہی کے لفظوں میں:

نثار میں تیری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جان بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد (۷)

اردو بولنے والے فیض احمد نے ۱۹۷۱ء میں بنگلا دیش کی آزادی میں پاک حریت پسند فوج کی توہین کرتے ہوئے ایک نظم لکھی علاوہ ازایں انکی دیگر نظموں میں بھی پاک فوج کے خلاف شدید مذمت کا اظہار ہے۔ ٹکا خان کی حکومت کے دوران ۲۵/ مارچ ۱۹۷۱ء کی اندھری رات میں پاکستانی فوج نے ڈھاکہ میں بنگالی عوم پر جو جارخانہ حملہ شروع کیا۔ اس مذموم فعل پر فیض احمد نے تحریری طور پر حکومت پاکستان کی شدید مذمت کی۔ نسل کشی کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے اپنی نظم 'ہجار کا رومیری طان سی' میں لکھا تھا:

میرے جسم سے دور رہو
لیکن نسل کشی کے جلوس کو کیسے سجائیں
میرے خون کے رونے سے کون متوجہ ہوگا؟
میرے کمزور جسم میں کتنا خون ہے؟

یہ چراغ نہیں جلائیگا
ایک گلاس شراب نہ بھرو (۸)

فیض کی انقلابی شاعری نے جہاں مختلف ادوار میں چلنے والی بیشتر تحریکوں میں روح پھونکی وہیں عوام میں انقلابی جذبات ابھارنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ بنگال کے مظلوم عوام سے انہیں محبت تھی، وہ بنگالی عوام کی آزادی کی جدوجہد کی پرزور حمایت کرتے تھے۔ فیض احمد فیض کی 'ہم دیکھیں گے' نظم نے ہندوستان میں ہنگامہ مچادیا۔ ۱۹۷۹ء میں فیض نے یہ نظم پاکستان کے حکمران ضیاء الحق کے خلاف یہ لکھی تھی:

ہم دیکھیں گے — لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے — جو لوح ازل میں لکھا ہے
جب ظلم و ستم کے کوہ گراں — روئی کی طرح اڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے — جب دھرتی دھڑ دھڑ کے گی (۹)

فیض احمد فیض بنگلا دیش کے آزادی کے بعد وہ مختلف ادبی میلوں میں شرکت کیلئے باقاعدگی سے ڈھاکہ آتے تھے۔ خاص طور پر بنگلہ اکیڈمی ان کی پسندیدہ جگہ تھی۔ ایک دفعہ سرکاری سفر میں پاکستان کے صدر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ بنگلہ دیش آئے لیکن بعد ازاں دل شکستہ ہوکر ڈھاکہ سے واپس لوٹے، کیونکہ اپنے قریبی دوست منیر چودھری اور شہید اللہ قیصر کی موت کی خبر سن کر وہ سکتے میں آگئے تھے۔ اس پار ڈھاکہ سے واپسی پر ۱۹۷۴ء میں انہوں نے درد بھرے دل کے ساتھ یہ نظم لکھی:

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختم درد عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکست دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جان صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد (۱۰)

فیض احمد فیض ۲۰/نومبر ۱۹۸۴ کو وفات پا گئے اور لاہور میں گلبرگ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

☆ حبیب احمد جالب

اردو شاعر حبیب احمد جالب ۲۴/ مارچ ۱۹۲۸ء مطابق یکم شوال ۱۳۴۶/ ہجری بروز ہفتہ صبح ساڑھے آٹھ بجے عیدالفطر کے دن قصبہ دسویا ضلع ہوشیار پور، صوبہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی سے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں گورنمنٹ ہائی اسکول جیکب لائن کراچی سے مزید تعلیم حاصل کی، روزنامہ جنگ اور پھر لائلپور ٹیکسٹائل مل سے روزگار کے سلسلے میں منسلک ہوئے۔

ایوب خان اور یحییٰ خان کے دور آمریت میں متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ جالب کو ۱۹۶۰ء کے عشرے میں جیل جانا پڑا اور وہاں انہوں نے کچھ اشعار لکھے 'سر مقتل' کے عنوان سے

جو نظم لکھی تھی حکومت وقت نے اسے ضبط کرلیا لیکن انہوں نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ جالب نے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے عشروں میں بہت خوبصورت شاعری کی جس میں انہوں نے اس وقت کے مارشل لا کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ جب پاکستان میں پرویز مشرف نے ایمرجنسی لگائی تو مشرف کے سیاسی مخالفین کے جلسوں میں حبیب جالب کی شاعری دلوں کو گرمانے کے لیے پڑھی جاتی تھی۔

۱۹۷۰ء کے انتخاب میں عوامی لیگ کو مکمل اکثریت حاصل ہوگئی لیکن پاکستانی پیپلز پارٹی کے چیف ذوالفقار علی بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستان کا وزیر اعظم قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مارشل لاء پھر جاری کیا گیا۔ پاکستانی فوج نے ۲۵/ مارچ ۱۹۷۱ء کو اپریشن سارچ لائٹ شروع کیا۔ اس وقت جالب صاحب بحیثیت ایک اردو شاعر نے سارچ لائٹ اور قتل عام کے خلاف آواز اٹھائی تھی:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو (۱۱)

بنگلہ دیش کی پیدائش کے کافی عرصہ بعد بھی جالب بنگلہ دیش کے بارے میں پاکستان کے عوام کو یاد دلاتے رہے۔ 'جگ میرے پنجاب' نظم کے آخری حصے میں وہ کہتے ہیں:

انہی چلن سے ہم سے جدا بنگال ہوا
پوچھ نہ اس دکھ سے جودل کا حال ہوا (۱۲)

شاعر کو اپنے شمشیر قلم پر بڑا ناز تھا۔ چنانچہ فرمائے ہیں:

مرے ہاتھ میں قلم ہے مرے ذہن میں اجالا
مجھے کیا دبا سکے گا کوئی ظلمتوں کا پالا
مجھے فکر امن عالم تجھے اپنی ذات کا غم
میں طلوع ہو رہا ہوں تو غروب ہونے والا (۱۳)

اس بنا پر جالب کو جیل میں قلم اور کاغذ دینے سے روکا جاتا تھا۔ حبیب جالب ۱۲/ مارچ ۱۹۹۳ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تاہم ان کی انقلابی شاعری کا پیدا کردہ ولولہ ابھی تک لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔

☆ کیفی اعظمی

کیفی اعظمی صاحب نے ۱۴/ جنوری ۱۹۱۹ء میں اتر پردیش کے ضلع شہر بہرائچ میں پیدا ہوئے۔ کیفی اعظمی کا پورا نام اطہر حسین رضوی تھا۔ والد سید فتح حسین رضوی ایک تحصیل دار تھے۔ ابتداء کی تعلیم روایتی اردو، عربی اور فارسی پر محیط تھی۔ لیکن ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران اسکول چھوڑ دیا۔ وہ محض گیارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کر چکے تھے۔ کیفی اعظمی بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے دوران ایک مشہور شاعر اور فلمی شخصیت تھے۔ ۱۹۷۱ء میں بنگالیوں پر پاکستانیوں کے ظلم سے کیفی اعظمی کو تکلیف پہنچی۔ انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار شاعری کے ذریعے نمایاں کیا۔ نظمیں لکھیں اور مجاہدین جنگ آزادی کے دلوں میں جذبہ پیدا کیا۔ کیفی اعظمی نے ممبئی میں ۸۳/ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

پاکستان کی لاکھ کوششوں کے باوجود ۱۶/ دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ ان تمام واقعات کو کیفی نے اپنے نظم 'بنگلہ دیش' میں پیش کیا ہے:

میں ایسا ملک نہیں ہوں کہ تم مجھے جلا دو گے اور مجھے تو دو گے
میں ایسی دیوار نہیں ہوں جو مجھے توڑ دے گی
ایک حد بندی، یہاں تک کہ یہ نہیں کہ آپ مجھے حذف کر دیں گے (۱۴)

موجودہ جنگ اور ترقی پسند ادب کے متعلق کیفی اعظمی کہتے ہیں:

ہٹو، میدان میں ہم آ رہے ہیں
یہ آندھی اور یہ طوفان تو بہ
یہ لاشیں اور یہ میدان تو بہ
بلکتے چیختے انسان تو بہ (۱۵)

ان کی اور ایک مشہور نظم یہ ہیں:

یہ زمیں تب بھی نگل لینے پہ آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے
ہاتھ ڈھلتے گئے سانچے میں تو تھکتے کیسے
نقش کے بعد نئے نقش نکھارے ہم نے
کی یہ دیوار بلند، اور بلند، اور بلند (۱۶)

۱۹۷۱ء کی جنگ آزادی میں ان کے مختلف کرداروں اور جمایت کے اعتراف میں بنگلہ دیش کی

حکومت نے ۲۰۱۲ء میں انہیں 'آزادی کی جنگ میں دوستی ایوارڈ' میں نوازا۔

☆ سالک لکھنوی

سالک ۱۶/ دسمبر ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی اور انگریزی کی ابتدائی تعلیم خود حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کلکتہ میں حاصل کی۔ ابتدا میں کانگریس پارٹی سے وابستہ رہے لیکن ۱۹۴۹ء میں کانگریس سے مستعفی ہو کر کمیونسٹ پارٹی سے منسلک ہوئے۔ سالک کی تمام جدوجہد کا میدان کارزار کلکتہ رہا۔

بنگلا دیش کی جنگ آزادی کے دوران بہت سارے شاعروں اور ادیبوں نے مسلح مزاحمت میں حصہ لیا، اس وقت ہندوستان کے بنگالی شعراء اور ادباء بنگلہ دیش کے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہوئے اور پاکستانی فوج کی درندگی کے خلاف عالمی سماجی محاذ کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لیکن نامعلوم اسباب کی بنا پر کلکتہ کے اکثر اردو شعراء وادباء بنگلہ دیش کے آزاد پسندوں کے ساتھ اظہار یکجہتی کرنے سے جھجکتے رہے۔ البتہ کچھ شعرا بنگلا دیش کی آزادی کی تحریک کے ساتھ ہمنوا رہے۔ ان میں سے سرفہرست شاعر اور صحافی سالک لکھنوی تھے۔ بنگہ دیش کی آزادی پر سالک کی ایک مشہور نظم 'جاگ اٹھا بنگہ دیش' ہے:

ظالم کے ہاتھ میں آج ہے رائفل — آج مظلوم سینے سپر بنگئے
ہر سپکن کی آنکھ سی سولی راوا — آج بینو کے آنچل سے پرچم بنگئے
ظلوم سے جنگی کر لی بھی نوجوان — جاگ اٹھا بنگہ دیش (۱۷)

سالک لکھنوی نے مغربی بنگال، کولکاتا میں ۱۳/ دسمبر ۲۰۱۳ میں انتقال کیا۔

اس میں شک نہیں کہ بنگلہ دیش کی آزادی کے سلسلے میں اردو شاعروں نے اہم رول ادا کیا۔ ۱۹۵۲ء کی لسانی انسانی تحریک سے لے کر ۱۹۷۱ء تک اردو کے شعراء نے آزادی کے موضوع پر بہت سی نظمیں لکھیں۔ ان کے اشعار بابائے قوم بنگو بندھو شیخ مجیب الرحمٰن کی ۷/ مارچ کی تاریخی تقریر کی طرح پر اثر ثابت ہوئے۔ آخر کار آزادی پسند بنگالی عوام کی قربانیوں کے ذریعے ہمیں بنگلہ دیش نامی ایک آزاد ملک ملا ہے۔ اب بھی اردو کے شعراء آزادی کے وقت کو یاد کرتے ہوئے نظمیں لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے۔

حوالہ جات

(۱) احتشام ارشد نظامی، انقلابی شاعر نوشاد نوری، Ehtesham Arshad Nezami, (Offical Website) ۵/ اکتوبر ۲۰۱۹ء۔

(۲) اردو شاعروں اور ادیبوں کی نظر میں ۱۹۷۱ء، جاوید حسین، پروٹوم الو، ۱۳/ مرچ ۲۰۲۰ء، ص ۴۔۵

(۳) نوشاد نوری، احمد الیاس، جنگ، میگزینز ڈیسک، پاکستان، ۲۸/ اگست، ۲۰۱۹ء۔

(۴) بنگلہ دیش اردو شاعروں کی آزادی جدوجہد، جاوید حسین، پروٹوم الو، ۱/ اپریل ۲۰۲۰

(۵) اردو شاعروں اور ادیبوں کی نظر میں ۱۹۷۱ء، جاوید حسین، پروٹوم الو، ۱۳/ مرچ ۲۰۲۰ء، ص ۴۔۵

(۶) بنگلہ دیش میں بہاری ڈاس پورہ ادب، مظفر حسین، بی ڈی نیوز ۲۴ ڈاٹ کام، ۱۴/ نومبر ۱۹۱۸ء۔

(۷) فیض نظارمیں تری غلیوں کے، فیض احمد فیض، اردو محفل، ۱۰/ دسمبر ۲۰۰۷۔

(۸) نسخہ ہائے وفا، فیض احمد فیض، ایجوکشنل پاشنگ ہاوس، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۔۱۶۴

(۹) ہم دیکھیں گے، فیض احمد فیض، اردو محفل سالگرہ شانزدہم، مئی ۲۵، ۲۰۰۷ء

(۱۰) پاکستان کے انقلابی شاعر فیض احمد فیض، صیام سرور جمیل، بنگلہ نیوز ۲۴ ڈاٹ کام، ۱۸/ جولائی ۲۰۱۲

(۱۱) نسخہ ہائے وفا، فیض احمد فیض، ایجوکشنل پابشنگ ہاوس، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص۔۵۳۸

(۱۲) شاعر انقلاب: حبیب جالب، اکرام الحق، مکالمہ، ۲۱/ دسمبر ۲۰۱۷ء۔

(۱۳) حبیب جالب۔گھر کی گواہی، سعید پرویز، دانیال، اپریل ۱۹۹۴ء، ص۔۴۴۱

(۱۴) کلیات حبیب جالب، حبیب جالب، ۲۰۰۵ء، ص۔۱۲۵

(۱۵) جھنکار، کیفی اعظمی، وقمی دارالاشاعت سمٹی، ممبئی، ۱۹۴۴، ص۔۳۷

(۱۶) کیفی اعظمی: فکر وفن، ڈاکٹر شکیلہ رافت علی، معیار پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۵، ص۔۶۵

(۱۷) جنگ آزادی کا ۱۳ نمبر سیکٹر، منتصیر ماموں، ص۔۴۵

مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

☆ ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو''، تحقیقی وتنقیدی مجلّہ ہے جس میں اردو زبان وادب کے غیر مطبوعہ مقالات طے کردہ ضوابط کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔

☆ تمام مقالات اشاعت سے قبل Peer Review کے لیے مختلف ماہرین کو بھیجے جاتے ہیں جن کی منظوری کے بعد مقالات ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

☆ مقالہ ارسال کرتے ہوئے درج ذیل اصولوں کو ملحوظ کیا جائے جو کہ آج کی ترقی یافتہ علمی دنیا میں رائج ہیں۔ Inpage 2000 میں کمپوز کر کے سفٹ کاپی ای میل کے ذریعہ ضرور بھیجے۔

☆ مقالے کے ساتھ انگریزی زبان میں اسکا خلاصہ (Abstract) (تقریباً ۱۰۰ الفاظ) اور عنوان شامل کیا جائے۔

☆ مقالے کے عنوان کا انگریزی ترجمہ، مقالہ نگار کے نام کے انگریزی ہجے اور موجودہ عہدہ نیز مکمل پتہ بھی درج کیا جائے۔

☆ ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' میں بالخصوص اردو زبان کے درج ذیل موضوعات پر مقالات شائع کیے جاتے ہیں۔ تحقیق: لسانیات، تدوین متن وتحقیق متن کے موضوعات، علمی وادبی مباحث، مطالعہ ادب، تخلیقی ادب کے تنقیدی وتجزیاتی مباحث اور مطالعہ کتب۔

☆ مقالہ میں استعمال ہونے والے تمام حوالہ جات وحواشی کی نمبری ترتیب ایک ہی ہوگی اور مقالہ کے آخر میں حوالہ جات وحواشی MLA طریقے سے دیئے جائیں گے۔

☆ مقالے کے آخر میں کتابیات شامل نہ کی جائیں۔

☆ مندرجات کی تمام تر ذمہ داری محققین پر ہوگی۔

☆ مقالات ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' کی ای میل du.urdujournal@gmail.com پر بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔

লেখা পাঠানোর নিয়মাবলী

'ঢাকা ইউনিভার্সিটি জার্নাল অফ উর্দু' ঢাকা বিশ্ববিদ্যালয়ের সিন্ডিকেট অনুমোদিত একটি গবেষণা পত্রিকা। এতে দেশ বিদেশের অধ্যাপক ও গবেষকবৃন্দের বিভিন্ন বিষয়ে উর্দু ভাষায় রচিত মৌলিক গবেষণা-প্রবন্ধ প্রকাশিত হয়।

পত্রিকায় লেখা পাঠানো বা জমা দেয়ার কিছু নিয়ম:

১.পাণ্ডুলিপি উর্দু Inpage সফ্টওয়্যারে কম্পিউটার কম্পোজ করে পেন ড্রাইভে বা ইমেলে সফ্ট কপি জমা দিতে হবে।

২. প্রবন্ধে লেখকের নাম, পেশাগত পরিচয় ও ঠিকানা আলাদা কাগজে থাকবে। লেখক কোন কলেজ/ মাদরাসা/ বিশ্ববিদ্যালয়ের শিক্ষক অথবা কোন গবেষণা প্রতিষ্ঠানের অধীনে গবেষণায় নিয়োজিত গবেষক হবেন। বিভাগীয় ছাত্র-ছাত্রীদের ক্ষেত্রে এ শর্ত শিথিলযোগ্য।

৩. প্রত্যেক প্রবন্ধের সাথে লেখককে এ মর্মে একটি প্রত্যয়নপত্র জমা দিতে হবে যে- জমাকৃত প্রবন্ধের লেখক তিনি নিজেই। এটি একটি মৌলিক গবেষণা প্রবন্ধ। প্রবন্ধটি ইতোপূর্বে অন্য কোন পত্রিকায় মুদ্রিত হয়নি কিংবা প্রকাশের জন্য অন্য কোন জার্নালে জমা দেয়া হয়নি। এ প্রবন্ধ বিষয়ক সকল দায়িত্ব লেখক বহন করবেন।

৪. প্রকাশের জন্য মনোনীত কিংবা অমনোনীত কোন পাণ্ডুলিপি ফেরত দেয়া হবে না। প্রবন্ধ প্রকাশিত হলে লেখক জার্নালের ৩ কপি সৌজন্য হিসেবে পাবেন।

৫. উদ্ধৃতির ক্ষেত্রে মূল বানানের পরিবর্তন হবে না। লেখক কোন বিশেষ বানান-বৈশিষ্ট্য রক্ষায় আগ্রহী হলে তা অক্ষুন্ন রাখা হবে।

৬. গবেষণা প্রবন্ধ লেখার সকল নিয়ম মেনে লেখা তৈরী করতে হবে।

৭. প্রবন্ধ শেষে টীকা ও তথ্যসূত্র ব্যবহার করতে হবে।

৮. প্রবন্ধের বিষয়বস্তুতে দ্বৈত লেখকের প্রয়োজন না হলে একই প্রবন্ধে দ্বৈত লেখক গ্রহণযোগ্য নয়।

লেখা পাঠানোর ঠিকানা:

সম্পাদক

ঢাকা ইউনির্ভাসিটি জার্নাল অফ উর্দু

উর্দু বিভাগ, ঢাকা বিশ্ববিদ্যালয়

du.urdujournal@gmail.com

অথবা বিশেষ প্রয়োজনে নীচের ইমেলেও পাঠানো যেতে পারে।

grabbanidu@gmail.com

100 Years
Special Issue

11. Professor Dr. Andalib Shadani:Teacher, writer and researcher
Shamima Nasrin 238
PhD Scholar, Department of Urdu, Rajshahi University, Bangladesh

12. Academic Strength and Challenges of Urdu Department of Dhaka University: AProspective Study
Safdar Imam Qadri 255
Department of Urdu, College of Commerce, Arts and Science, Patna, India

13. Role of Government and Non-Government Institutions of Bangladesh in the Promotion of Urdu
Professor Dr. Md Mahmudul Islam 279
Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

14. Independence War of Bangladesh in Urdu Poetry
Dr. A. N. M. Ehsanul Maliki 296
Researcher, Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

5. Urdu study in Dhaka:ABrief Overview
Professor Dr. Zafar Ahmed Bhuyan 86
Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

6. Linguistic relationship of Bangla and Urdu
Hafsa Akter 123
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

7. Alumni of Urdu Department to face the challenges of 21st century: present and future
Professor Dr. Mohammad Golam Rabbani 144
Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

8. 100years of Urdu Department and famous persons of Urdu Department
Dr. Rashid Ahmad 160
Professor, Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

9. Urdu contribution of a few students of the Department of Urdu, Dhaka University
Dr. Md Razaul Karim 198
Professor, Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

10. International conference organized by Department of Urdu :New Horizons of Research
Professor Shamim Banoo 220
Modern Language Institute, University of Dhaka, Bangladesh

Dhaka University Journal of Urdu

Volume:10 Number10, Year 2021

100 Years Special Issue

Table of Contents

1. Khan Bahadur Fida Ali Khan:Life and Contribution
Professor Dr. Md. Israfil 9
Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

2. Department of Urdu Global Recognition of Dhaka University
Professor Dr. Aslam Jamshedpuri 27
Department of Urdu, Chaudhary Charan Singh University, Meerut, India

3. Teaching of Urdu in foreign universities
Professor Dr. Khawaja Muhammad Ekramuddin 44
Center for Indian Languages, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, India

4.The Liberation war of 1971 in Urdu Short Story
Husynul Banna 72
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

Dhaka University Journal of Urdu

Year : June 2021 Volume: 10 Number 10

Date of Publication: 30 June 2022

100 Years Special Issue

Editor

Professor Dr. Mohammad Golam Rabbani

Editorial Board Members

Professor Dr. Zafar Ahmed Bhuiyan, Dhaka University
Professor Dr. Md. Mahmudul Islam, Dhaka University
Professor Dr. Md. Israfil, Dhaka University
Professor Dr. Aslam Jamshedpuri,CCS University, India
Professor Shamim Banoo, Dhaka University
Professor Dr Rashid Ahmad, Dhaka University

Department of Urdu

University of Dhaka

Bangladesh

Dhaka University Journal of Urdu

Year : June 2021

Volume : 10 Number: 10

100 Years Special Issue

Published by : The Registrar
University of Dhaka
Dhaka-1000

Printed by : Madurja Prokashoni
38, Banglabazar, Dhaka

Date of Publication : 30 June 2022

Correspondence Address : **Editor**
Dhaka University Journal of Urdu
Department of Urdu
University of Dhaka
Dhaka- 1000

E-mail : du.urdujournal@gmail.com

Price : Tk - 200/= / 3 Dollars

ISSN: 2957-4951

ISSN: 2957-4951

Dhaka University Journal of Urdu

Year : June 2021
Volume : 10 Number: 10

100 Years Special Issue

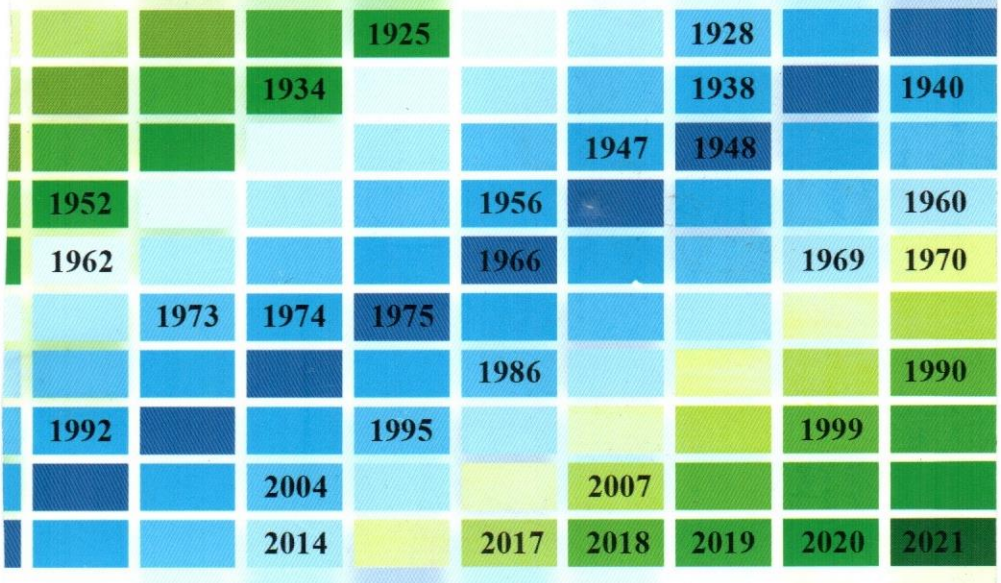
Editor
Prof. Dr. Mohammad Golam Rabbani

Department of Urdu
University of Dhaka
Bangladesh

Dhaka University Journal of Urdu

100 Years Special Issue

Year: 2021 Volume: 10



Department of Urdu
University of Dhaka ■ Bangladesh

ISSN: 2957-4951